1

اہل فکر و نظر کے سوالات اور ان کے جوابات

محرم الحرام

- امام حسینؑ کا قیام
- عزاداری کا فلسفہ
- محرم الحرام کے احکام
- امام حسینؑ اور فلسفہ حکومت
- عاشورہ عرفان کے آئینے میں
- تاریخ اور سیرت

جماعت اہلِ قلم

بسم الله الرحمن الرحيم

مُحرمُ الحرام کے حوالے سے مُنتخب سوالات کے جوابات

ترتیب و تدوین : اہل قلم کی جماعت

مترجم : سید علی محمد نقوی

ناشر ؛ دانش کدہ ۔ اسلام آباد

محرم الحرام کے حوالے سے منتخب سوالات کے جوابات

ترتیب وتدوین: اہل قلم کی جماعت

مترجم: سید علی محمد نقوی

تاریخ اشاعت: محرم الحرام ۱۴۳۰ھ/ دسمبر ۲۰۰۸

ناشر: دانش کدہ۔ اسلام آباد

قیمت: ۱۵۰ روپے

پیش لفظ

محرم الحرام تاریخ انسانیت میں ظلم وستم، معاشرتی بے راہ روی اور انسانی اقدار کی پامالی کے خلاف ایک عظیم انقلاب کی بنیاد ہے، وہ انقلاب جس کی بنیاد خاتم الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند حسین ابن علی علیہ السلام نے رکھی اور اتنے مضبوط انداز میں یہ بنیاد رکھی کہ ''کربلا'' ظلم وجبر اور استحصال کے خلاف مظلوم انسانوں کے قیام کا استعارہ بن گئی. اس کے ساتھ ساتھ یہ ''مہینہ'' عظمت، تقدس، عزاداری اور معاشرے کو زندہ کرنے اور انسانی اقدار سے آشنا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی بن گیا، اس لئے آج حسین بن علی علیہ السلام پر گریہ، ان کا غم، ان کی قربانیوں کا تذکرہ انسان کے اندر معنوی انقلاب اور اسے عالم ملکوت سے متصل کرنے کا بہترین راستہ بھی ہے اور بلاتفریق مسلک ومذہب انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دینے اور عزت کی زندگی گذارنے کی دعوت بھی، لیکن اپنی تمام تر خوبیوں اور اثرات کے ساتھ ساتھ کربلا اور محرم انسان کے ذہن میں عصری تقاضوں کے مطابق سوالات بھی پیدا کرتے ہیں. جو لوگ تاریخ محرم اور کربلا کا مطالعہ کرکے اس سے آگاہ ہوتے ہیں ان کے ذہن میں اور طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں جب کہ جو حضرات معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی رویوں اور مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں اور اہل بیت علیہم السلام کے محبین اور پیروکاروں کے درمیان رائج رسوم اور رواج کو دیکھتے ہیں تو ان کے اذہان میں ابھرنے والے سوالات کی نوعیت اور ہوتی ہے چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی اہل بیت سے منقول روایات کی روشنی میں علم وحکمت مومن کی میراث ہے، لہٰذا ہر مومن انسان کو انہی ہستیوں کی سنت اور تعلیمات کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے چاہئیں اور محرم الحرام، کربلا اور حسین ابن علی علیہ السلام کو اہل البیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنا چاہیے. کتاب حاضر اس سلسلے کی ایک کوشش ہے، اس کتاب کے پہلے حصے میں قیام امام حسینؑ کی ماہیت

،تاریخی اعتبار سے اہمیت، مکان وزمان کے انتخاب کی وجوہات، ترک حج، یمن کی بجائے کوفہ کے انتخاب کی وجوہات...... اور ایسے ہی دیگر تاریخی سوالات پر گفتگو کی گئی ہے، جب کہ دوسرے حصے میں یزید کی توبہ، نیز قیام حسینی کے اہداف اور امر بالمعروف...... جیسے اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے. کیا امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ شہید ہوں گے؟ اور اگر جانتے تھے تو کیسے انہوں نے جانتے بوجھتے موت کو گلے لگا لیا...... شرعا اس کی توجیہ کیا ہوسکتی ہے......؟ یہ ایک اور اہم سوال ہے جس کا جواب کتاب حاضر دے رہی ہے، فلسفہ عزاداری، عزاداری کی تاریخی حیثیت، سیاہ پوشی اور عزاداری کی روشیں نیز عزاداری پر دین کا نکتہ نظر...... "اللہ کا خون" ثار اللہ...... کا مفہوم کیا ہے......؟ کربلا کا عرفانی اور معنوی پہلو، عزاداری کے انسان کی معنوی تربیت پر اثرات، عزاداری کے فقہی احکام...... وہ موضوعات ہیں جن کے تفصیلی جوابات اس کتاب میں موجود ہیں

"دانش کدہ" کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنی پہلی کتاب کے طور پر امام حسینؑ اور محرم الحرام کا موضوع چنا اور اس سلسلے میں ایک بہترین علمی سوغات کو اردو کے قالب میں ڈھال کر تاریخ حسینی کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے. جہاں اس کتاب کے مولفین خصوصی شکریہ کے حق دار ہیں، وہاں ہم کتاب کے مترجم جناب حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی محمد نقوی کے نہایت شکر گذار ہیں کہ انہوں نے قلیل وقت میں انتھک محنت کر کے کتاب کو اردو کا پیراہن پہنا دیا اور آج کتاب طباعت کے مراحل طے کرنے کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے.

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب علم وحکمت کے تشنہ قلوب کو سیراب کرنے میں مددگار ثابت ہوگی، انشاء اللہ.

محمد امین شہیدی

دانش کدہ۔ اسلام آباد

پہلا حصّہ

تاریخ اور سیرت

معاویہ کے دور میں قیام نہ کرنا

سوال ۱ : امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے دور میں قیام کیوں نہ کیا؟

جواب : امام حسین علیہ السلام کی اپنی گیارہ سالہ مدت امامت (۶۰-۴۹ ہجری) میں معاویہ کے ساتھ مسلسل چپقلش رہی ہے جس کا اظہار جابجا حضرت کے خطوط میں ہمیں نظر آتا ہے، امام علیہ السلام نے ان خطوط میں معاویہ کے ظلم وستم (جیسے بزرگ شیعہ افراد حجر بن عدی اور عمرو حمق کا قتل ہے) سے پردہ اٹھایا ہے اور آپ نے معاویہ کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش اور فتنہ شمار کیا ہے۔(۱) یوں امام نے اس کی حکومت کی مشروعیت وجواز پر سرخ خط کھینچ دیا، امام حسین علیہ السلام نے سب سے بڑا عمل اس کے خلاف جہاد کو قرار دیا اور اس کے ترک کو بارگاہ خدا میں استغفار کا موجب قرار دیا۔(۲)

---

(۱) الامامة والسیاسة ج ۱ص ۱۸۰، وانی لا علم لها للامة فتنة اعظم من اما رتک علیها

(۲) حوالہ سابق: وانی واللہ ماعرف افضل من جها دک فان افعل فانه قربة الی ربی وان لم افعله فاستغفر الله لدینی۔

رہا یہ سوال کہ امامؑ نے معاویہ کے خلاف کیوں قیام پر اقدام نہ کیا؟ تو اس کی وجوہ میں سے بعض کو امامؑ کے کلام میں ہم پا سکتے ہیں اور بقیہ وجوہ کے ادراک کے لئے ہمیں تاریخی تجزیوں کا سہارا لینا ہوگا۔

اول: صلح نامہ کا وجود

معاویہ کے ایک خط کے جواب میں امام حسینؑ نے اسے لکھا کہ میں اس صلح نامہ پر پابند ہوں جو میرے بھائی امام حسنؑ اور تمہارے درمیان انجام پایا اور میں اسے توڑنے کا ذمہ دار قرار نہیں پانا چاہتا۔(۱)

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صلح نامہ کی سیاہی کے خشک ہونے سے پہلے معاویہ نے کوفہ میں وارد ہوتے ہی اسے اپنے پاؤں کے نیچے رکھتے ہوئے خود کو اس کی پابندی سے بری الذمہ قرار دے لیا۔(۲) تو ایسی صورت میں امام حسین علیہ السلام کیوں اپنے آپ کو اس صلح نامہ کا پابند سمجھتے ہیں جبکہ مدمقابل نے تو ابتداء سے ہی اس کا اعتبار ختم کر دیا تھا؟

اس سوال کا جواب کئی لحاظ سے دیا جا سکتا ہے:

۱) معاویہ کی باتوں سے صریحاً صلح نامہ کے توڑنے کا پتہ نہیں چلتا، بلکہ اس نے یہ کہا: الی کنت منت الحسن اشیاء وا عطیته اشیاء میں نے حسن بن علی کو کئی چیزوں کا وعدہ دیا۔ ہوسکتا ہے اس نے جن چیزوں کا وعدہ دیا ہو وہ صلح نامہ کی شقوں کے علاوہ ہوں اور معاویہ خود کو ان کے دینے کا پابند نہیں سمجھتا تھا اس وجہ سے معاویہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ صلح نامے کو توڑ رہا ہے یا کم از کم ایسا دعویٰ تو کر سکتا تھا۔

---

(۱) موسوعة کلمات الامام الحسینؑ، ص۲۳۹، و معاذ الله ان انقض عهدا عهده الیک اخی الحسنؑ

(۲) الارشاد - شیخ مفید: ص ۳۵۵، الا و انی کنت منیت الحسن أشیاء و اعطیته اشیاء و جمیعها تحت قدمی لا افی بشئی منها له

۲) امام حسینؑ اور معاویہ کی سیاسی شخصیت کے درمیان بنیادی فرق کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ فرق حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی سیاسی شخصیت میں بھی موجود تھا، معاویہ ایسا سیاستدان تھا جو اپنے مقاصد کو پانے کے لئے ہر طرح کی سیاست اور چالبازی کا مرتکب ہوسکتا تھا، جیسا کہ اس کی ایسی چالبازیوں کی بہت سی مثالیں وہاں دیکھی جاسکتی ہیں جب وہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف کاروائیوں میں مصروف تھا جیسے خون عثمان کو بہانہ بنانا، طلحہ وزبیر کو امامؑ کے خلاف ابھارنا، جنگ صفین میں قرآن نیزوں پر اٹھانا، اور حضرت علیؑ پر دباؤ بڑھانے کے لئے حضرت کی حکومت کے اندر مختلف شہروں اور قصبوں پر شب خون مارنا، جب کہ امام حسینؑ بلند و بارزش شخصیت ہیں جو اصولوں اور شریعت کی پابندی کرنے والے ہیں وہ اپنی ظاہری کامیابی کے لئے ہر قسم کے وسیلے اور حربے سے استفادہ نہیں کرسکتے جیسا کہ حضرت علیؑ نے اپنی اسی اصول پسندی کو یوں بیان فرمایا۔

ولن اطلب النصر بالجور.(۱)

''میں ہرگز اپنی کامیابی ظلم وستم کے ذریعے حاصل نہیں کروں گا''

بنابریں معاویہ بے شک صلح نامہ کی پرواہ نہ کرے امام حسینؑ اس اصول کی وجہ سے اس صلح نامہ کو توڑ نہیں سکتے تھے۔

۳) اس دور کے حالات کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ امامؑ اگر صلح نامہ کی پابندی نہ کرتے تو اس کے کیا نتائج نکل سکتے تھے۔ معاویہ اس دور میں مملکت اسلامی کا بلاشرکت غیرے مالک بن چکا تھا جس کی حکومت شام، عراق، حجاز اور یمن تک پھیلی ہوئی تھی اور ہر جگہ پر اس کے نمائندے (گورنر وغیرہ) اس کی سیاست کی تبلیغ و دفاع میں مصروف تھے۔ اس نے تو حضرت علیؑ کے خلاف جنگوں کے زمانے میں عثمان کی مدد کے حوالے سے اپنی کوتاہیوں کو کہ جن کی وجہ سے عثمان قتل ہو گئے چھپا لیا بلکہ شامیوں کی نظروں میں اپنے آپ کو عثمان کا تنہا

---

(۱) نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶

انتقام لینے والا بنالیا، ایسے حالات میں کہ جب کوئی طاقت اس کے مقابلے میں موجود نہیں تھی اگر امام حسین علیہ السلام صلح نامے کی خلاف ورزی کرتے تو وہ حضرت کو پوری اسلامی مملکت میں عہد و پیمان توڑنے والے کے طور پر خوب بدنام کرتا اور حضرت کے خلاف لوگوں کے ذہن بنا سکتا تھا، اس کے مقابل امام حسینؑ اور آپ کے ساتھی جتنی کوشش کرتے کہ معاویہ صلح نامہ توڑنے والا ہے، اس میں کامیابی نہ ہوتی اور کوئی یہ بات نہ سنتا۔

دوم: معاویہ کی منزلت

اس دور کے لوگوں خصوصاً شام والوں کے ذہنوں میں معاویہ کے بارے میں مثبت رائے پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کے خلاف قیام آسان نہیں تھا کیونکہ معاویہ کی پہچان صحابی، کاتب وحی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی کے بھائی کے طور پر ہو چکی تھی اور ان کی نظر میں شام خصوصاً دمشق میں اسلام کے رائج کرنے میں معاویہ کی کوششوں کو بہت دخل تھا، اس کے علاوہ حکومت چلانے میں اس کا تجربہ اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے اس کی عمر کا زیادہ ہونا بھی اس کے مثبت نقاط تھے جس کی طرف اس نے امام حسنؑ کے نام اپنے خط میں اشارہ بھی کیا۔(۱) طبعی سی بات ہے امام حسینؑ کے مقابل تو اسے اس کا اور زیادہ فائدہ پہنچتا۔

سوم: معاویہ کی سیاست

صلح کی برقراری کے بعد اگرچہ معاویہ بنی ہاشم بالخصوص اولاد علی علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ امام حسن علیہ السلام کو زہر کے ذریعے شہید کرنے سے بھی اس نے دریغ نہ کیا۔(۲) لیکن وہ ظاہر یہ کرتا تھا کہ جس حد تک بھی ہو سکتا ہے وہ اس خاندان خصوصاً امام حسینؑ کے حقوق کا خیال رکھتا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے،

---

(۱) مقاتل الطالبیین ص۴۰۔ ولکن قد علمت انی اطول منک ولایة و اقدم منک لهذه الامة تجربة و اکبر منک سنا .. فادخل فی طاعتی ،

(۲) الارشاد، شیخ المفید، ص ۳۵۷

مثال کے طور پر اس کی طرف سے ہر مہینے اور ہر سال امام حسنؑ، امام حسینؑ اور عبد اللہ بن جعفر کے لئے تحائف کا بھیجا جاتا ہے اور وہ بھی چونکہ اپنے آپ کو بیت المال میں صاحب حق سمجھتے تھے اور ان تحائف کے بہتر موارد سے واقف تھے لہٰذا ان تحائف کو قبول کرتے تھے۔(۱)

معاویہ خاندان رسالت کا خیال رکھنے کا اظہار اس حد تک کرتا تھا کہ اپنی موت کے وقت یزید کو وصیت کی کہ امام حسینؑ کے حقوق کا خیال رکھنا اور وہ تمہارے خلاف قیام کریں گے لیکن تم انہیں قتل نہ کرنا۔(۲)

یہ سیاست اپنانے کی وجہ واضح تھی کیونکہ معاویہ نے امام حسنؑ کے ساتھ صلح کر کے اپنی حکومت کے جواز کو حاصل کر لیا، جس کی وجہ سے لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو شرعی خلیفہ کے عنوان سے پیش کرنے لگا لہٰذا اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ امامؑ کے خون سے اپنا دامن آلودہ کر کے اسلامی معاشرہ میں اپنے چہرے کو نفرت انگیز بنا لے بلکہ اس کی کوشش تو یہ تھی کہ اپنے آپ کو اس خاندان کے زیادہ سے زیادہ قریب ظاہر کر کے لوگوں کی نظروں میں مقبولیت حاصل کرے، اس کے علاوہ اس کا اپنا خام خیال یہ بھی تھا کہ اس کے اس عمل سے وہ (اولادِ علیؑ) اپنے آپ کو معاویہ کا ممنون احسان سمجھیں گے اور اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں اٹھائیں گے، جیسا کہ اس نے جب امام حسنؑ و امام حسین علیہ السلام کو کافی مقدار میں مال بھیجا تو ساتھ یہ بھی کہا کہ "یہ اموال آپ لیں اور جان لیں میں ہندہ کا بیٹا ہوں مجھ سے پہلے آپ لوگوں کو نہ کسی نے اتنا مال دیا ہوگا اور نہ بعد میں کوئی دے گا" امام حسینؑ نے اسے یہ جتلانے کے لئے کہ یہ اموال دنیا کوئی احسان جتانے کا باعث نہیں ہیں جواب میں فرمایا: "بے شک تم سے پہلے اور تمہارے بعد کوئی ان افراد کو ایسی بخشش نہیں کر

---

(۱) موسوعة کلمات الامام الحسینؑ، ص۲۰۹ اور ۲۱۰

(۲) الاخبار الطوال، ص۲۲۷، تجارب الامم، ج۲، ص۳۹

(۳) تاریخ ابن عساکر، ترجمه الامام الحسینؑ، ص۷، حدیث ۵

سکتا جو اس سے زیادہ با فضیلت و با شرف ہوں'' (۳) اس طرح معاویہ جانتا تھا کہ سختی کا رویہ اپنانے سے نتیجہ برعکس نکلے گا کیونکہ اس سے لوگ اس خاندان کی طرف زیادہ متوجہ ہوں گے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حکومت معاویہ سے نفرت ان کے دلوں میں پیدا ہو جائے گی، جس کے نتیجہ میں ان کے اطراف میں مددگار اکٹھے ہو جائیں گے، اس سے اہم ترین یہ کہ اس زمانے میں حالات کے پیش نظر امام حسینؑ کی طرف سے اہم خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا. اس کی کوشش تھی کہ اس سیاست کے ذریعے خطرے کی جڑیں ایک لمبی مدت تک کے لئے خشک کر دے، اس کے مقابل امام حسین علیہ السلام حکومت معاویہ کے اظہار عیوب کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے، اس کی واضح مثال آپ کا معاویہ کے نام وہ خط ہے جس میں آپ نے اس کے ظلم وستم، جرائم اور بدعات کا تذکرہ کیا (۱) اور نیز آپ نے یزید کی ولی عہدی کی بہت کھل کر مخالفت کی. (۲)

البتہ امام حسینؑ یہ جانتے تھے کہ اگر آپ معاویہ کے خلاف قیام کریں گے تو خصوصاً اس کی چالبازیوں کے پیش نظر عمومی افکار آپ کی حمایت نہیں کریں گے اور حکومت کی پروپیگنڈا مشینری کو دیکھتے ہوئے معاویہ کو حق پر قرار دیا جائے گا.

چہارم: زمانے کے تقاضے اور حالات

اگر چہ امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد فوراً بعض اہل کوفہ نے امام حسین علیہ السلام کو خط لکھے اور شہادت امام حسنؑ کی تسلیت عرض کرنے کے بعد اپنے آپ کو امام کے فرمان کا منتظر لکھا. (۳) لیکن امام حسینؑ جانتے تھے کہ کئی عوامل جیسے شام کی مرکزی حکومت کا استحکام، اموی گماشتوں کا کوفہ پر مکمل کنٹرول، کوفیوں کا امام علیؑ اور امام حسنؑ کے ساتھ برا برتاؤ اور اسلامی مملکت کے اکثر مقامات پر معاویہ کی اچھی شہرت کی وجہ سے آپ کی کامیابی

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۲۱۲

(۲) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۲۸، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۱۸۶

(۳) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۲۸

کے امکانات بالکل موجود نہیں ہیں اور ایسے قیام کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے خون کے ضیاع کے اور امام کو باغی اور اسلامی حکومت کے خلاف خروج کرنے والا مشہور کیا جائے گا. جب کہ یزید کے دور کے حالات مکمل طور پر اس کے برعکس تھے.

مدینہ میں قیام نہ کرنا

سوال ۲: امام حسین علیہ السلام نے مدینہ میں ہی قیام کا آغاز کیوں نہیں کیا؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لئے اس دور کے زمان اور مکان کے شرائط وحالات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا.

زمان کے لحاظ سے: امامؑ جب مدینہ میں تشریف فرما تھے تو اس وقت تک مرگ معاویہ کی خبر عام نہیں ہوئی تھی، اس کے علاوہ یہ کہ ابھی لوگوں کی اکثریت معاویہ اور یزید کی حکومت کے درمیان فرق کو اچھی طرح نہیں جانتی تھی، اگرچہ بعض خواص جیسے امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر کی نظروں میں یزید بدکردار شراب خور، سگ اور بندر باز کے طور پر مشہور تھا.(۱)

لیکن معاویہ اور اموی گماشتوں کے پروپیگنڈے اور معاویہ کی طمع بازیوں اور دھمکیوں کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت معاویہ کی زندگی ہی میں یزید کی بیعت کر چکی تھی.(۲)

اور مکانی لحاظ سے بھی مدینہ قیام کے لئے مناسب جگہ نہیں تھی کیونکہ:

پہلا یہ کہ: اگرچہ مدینہ والوں کی اکثریت خصوصاً انصار خاندان اہل بیت سے محبت کرتے تھے لیکن ان کی محبت اس حد تک نہیں تھی کہ وہ ان کے لئے جان بلکہ جان سے کم تر کوئی چیز قربان کریں، جیسا کہ سقیفہ جیسے واقعات سے ان کی اس سستی وکمزوری کا بخوبی

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۲۸

(۲) الامامة والسیاسة، ج۱، ص۱۶۱-۱۶۴

اندازہ ہوتا ہے یہ بھی ذہن میں رہے کہ جب حضرت علیؑ نے بیعت توڑنے والوں (جمل والوں) کے مقابلے کے لئے اہل مدینہ سے مدد مانگی تو اکثر نے مثبت جواب نہیں دیا تھا اور حضرت علیؑ مجبوراً صرف چار سو (۱) یا سات سو (۲)، افراد کے لشکر کے ساتھ مخالفین کے ہزاروں کے لشکر کے مقابلے کے لئے نکلے۔

دوسرا یہ کہ: حضور اکرمؐ کے بعد مدینہ حکام وقت کی سیاست کی پیروی کرتا تھا اسی وجہ سے سیاست شیخین کی پیروی کی خاطر سنت پیغمبرؐ کے مقابل ان کی سنت کی حفاظت پر زیادہ مصر نظر آتا تھا، جیسا کہ اس گروہ کے نمائندے عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت علی علیہ السلام کو حکومت حوالے کرنے کی شرط سیرت شیخین کی پیروی کو قرار دیا لیکن حضرت علیؑ نے اس شرط کو قبول نہ کیا اور حضرت علیؑ جب خلافت پر فائز ہوئے (۳) تو اس میں بھی اصلی کردار مدینہ والوں کا نہیں تھا بلکہ دوسرے شہروں خصوصا کوفہ کے مہاجرین کا حضرت علیؑ کی خلافت پر زیادہ اصرار تھا۔

تیسرا یہ کہ: اسی دور میں قریش کے مختلف قبائل خصوصا بنی امیہ اور ان کے حامی مدینہ میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے اور واضح ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کے مقابل یہ بھی تیزی سے اقدام کرتے۔

چوتھا یہ کہ: اس دور میں مدینہ کی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس کی بنیاد پر کوئی بڑا اور تاریخی قیام شروع کیا جا سکے اور دوسرے بڑے شہروں جیسے کوفہ، بصرہ اور شام کے مقابل مدینہ کی آبادی بہت کم تھی۔

پانچواں یہ کہ: سابقہ تاریخی تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ مرکزی اور طاقتور حکومتوں کے مقابل قیام کے لئے مدینہ مناسب جگہ نہیں تھی، جو قیام بھی اس شہر میں شروع ہوتا اس کی شکست پہلے سے ہی عیاں ہوتی تھی، جیسا کہ سن ۶۳ ہجری میں مدینہ والوں نے

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۸۱

(۲) مروج الذهب، ج ۲، ص ۳۹۵

(۳) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۶۲

حکومت یزید کے خلاف قیام کیا (واقعہ حرہ) جسے بڑی آسانی کے ساتھ سرکوب کرلیا گیا.(۱) اسی طرح علویوں کے قیام جیسے محمد بن عبد اللہ المعروف نفس زکیہ.(۲) (سن ۱۴۵ ہجری) اور حسینؑ بن علیؑ المعروف شہید فخ کا قیام (۳) (سن ۱۵۹ ہجری) اہل مدینہ نے معمولی سی مزاحمت کی اور آسانی سے شکست کھا گئے.

چھٹا یہ کہ: اموی حکومت کے دوران اہل مدینہ یہ بات ثابت کرچکے تھے کہ وہ اموی حکومت کے مقابل اہل بیت کا دفاع کرنے پر تیار نہیں ہیں کیونکہ معاویہ کی طرف سالہا سال تک اس شہر کے منبروں پر حضرت علی علیہ السلام پر سب وشتم کا سلسلہ چلتا رہا اور اموی حکمران آپ کے بارے بدگوئی کرتے رہے باوجود اس کے کہ مدینہ والے جانتے تھے یہ سب جھوٹ ہے لیکن کبھی انہوں نے سختی سے اس سیاست کو رد نہ کیا، اس سیاست کا زیادہ تر مقابلہ خود اہل بیت کے افراد خصوصاً امام حسینؑ کرتے رہے، یہاں تک کہ امام حسین علیہ السلام کی مدد کے لئے بھی مدینہ والوں میں سے کوئی شخص کھڑا نہ ہوتا.(۴)

ساتواں یہ کہ: اموی حکمران (ولید بن عتبہ) کا شہر پر مکمل کنٹرول تھا اور ایک قیام کے ذریعے ممکن نہیں تھا کہ حالات اس کے کنٹرول سے باہر ہو جائیں اور مخالفین شہر پر مسلط ہو جائیں.

مکہ کی طرف ھجرت

سوال ۳: اپنے قیام کی ابتداء میں امام حسین علیہ السلام مدینہ سے مکہ کیوں تشریف لے گئے؟

جواب: امام حسینؑ کے مدینہ سے نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ یزید نے مدینہ کے حاکم (ولید بن

---

(۱) الکامل فی التاریخ، ج۲،ص۵۹۳

(۲) الکامل فی التاریخ، ج۳،ص۵۶۳-۵۷۹

(۳) تاریخ یعقوبی، ج۲،ص۴۰۴،۴۰۵

(۴) بحار الانوار، ج۴۴،ص۲۱۱

عتبہ) کو خط لکھا کہ میری حکومت کے مخالف افراد سے کہ جن میں سے امام حسین علیہ السلام بھی تھے ہر حال میں بیعت لی جائے اور بیعت کے بغیر انہیں بالکل نہ چھوڑا جائے۔(۱)

ولید ایک صلح جو انسان تھا اپنی اس طبیعت کی وجہ سے وہ اگر چہ امام حسینؑ کے پاک خون سے اپنے ہاتھ رنگنا تو نہیں چاہتا تھا(۲) لیکن مدینہ میں اموی ٹولے کے دوسرے افراد جیسے مروان بن حکم موجود تھے اور ولید مشکل معاملات میں اس سے مشورہ کرنے کا پابند تھا، اس معاملے میں بھی اس نے مروان سے مشورہ کیا مروان لعین نے اسے امام حسینؑ کے قتل کا مشورہ دیا، جب ولید نے اس بارے مروان سے مشورہ مانگا تو اس نے کہا، میرا نظریہ یہ ہے کہ ابھی ان چند افراد کو بلا بھیجو اور انہیں یزید کی بیعت پر مجبور کرو اگر وہ مخالفت کریں تو انہیں معاویہ کی موت کے بارے میں مطلع ہونے سے پہلے قتل کر دو کیونکہ اگر انہیں مرگ معاویہ کی خبر ہو گئی تو ان میں ہر ایک ادھر ادھر نکل جائے گا اور وہاں جا کر مخالفت کا اظہار کریں گے اور لوگوں کو اپنے اطراف اکٹھا کریں گے۔(۳)

یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ نے مدینہ کے حالات کو علی الاعلان مخالفت کے اظہار کے لئے مناسب نہ پایا نیز اس شہر میں اپنی جان کو خطرے میں دیکھتے ہوئے جب کہ انہیں یہاں مؤثر قیام کے امکانات بھی نظر نہیں آرہے تھے، آپ نے شہر مدینہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور آپ مدینہ سے نکلتے وقت جس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے اس سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ اب آپ اس شہر میں اپنے لئے امن و تحفظ محسوس نہیں کر رہے تھے، ابو مخنف لکھتا ہے کہ آپ ۲۷ یا ۲۸ رجب کی رات اپنے خاندان کے ہمراہ مدینہ سے اس حال میں نکل رہے تھے کہ جیسے حضرت موسیٰ مدائن سے نکلتے وقت محسوس کر رہے تھے:(۴)

---

(۱) وقعة الطف، ص ۷۵، اما بعد فخذ حسيناً و عبد الله بن عمر و عبد الله بن الزبير با لبيعة اخذ أ شديداً ليست فيه رخصة حتى يبا يعوا والسلام

(۲) ابن اعثم، الفتوح، ج ۵، ص ۱۲، وقعة الطف، ص ۸۱

(۳) وقعة الطف، ص ۷۷

(۴) وقعة الطف، ص ۸۵، ۸۶

فخرج منها خائف یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین .(۱)

''موسیٰ شہر سے نکلے اس حال میں کہ خوفزدہ تھے اور ہر لحظہ کسی حادثے کے منتظر تھے، عرض کیا خدایا مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے''

مکہ کا انتخاب

آپ نے مکہ کا انتخاب اس حال میں کیا کہ اکثر شہروں کے لوگ ابھی تک مرگ معاویہ سے مطلع نہیں ہوئے تھے اور مخالفین کی باقاعدہ کوششیں یزید کی مخالفت میں شروع نہیں ہوئی تھیں اور ابھی تک امام حسین علیہ السلام کو دوسرے شہروں یعنی کوفہ وغیرہ سے کوئی دعوت موصول نہیں تھی، لہٰذا امام حسین علیہ السلام کو اپنی ہجرت کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کرنا تھا کہ جہاں آپ ایک تو مکمل آزادی و فرصت کے ساتھ اپنے نظریات بیان کر سکیں اور دوسرا وہاں سے پوری اسلامی مملکت تک اپنی آواز پہنچا سکیں، شہر مکہ میں یہ دونوں خصوصیات موجود تھیں کیونکہ صریح آیت "ومن دخلہ کان امنا" (۲) کے مطابق مکہ حرم امن الٰہی تھا نیز اس شہر میں کعبہ کی وجہ سے لوگوں کا اسلامی مملکت کے گوشے گوشے سے آنا اور مناسک حج و عمرہ انجام دینا باعث تھا کہ امام حسینؑ مختلف لوگوں اور قافلوں سے ملاقاتیں کرتے اور یزید و اموی حکومت کے ساتھ اپنی مخالفت کی وجہ انہیں بیان کر سکتے تھے اور انہیں معارف اسلامی بھی بیان کر سکتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اسلامی شہروں خصوصاً کوفہ و بصرہ کے مختلف افراد کے ساتھ رابطہ بھی کر سکتے تھے.(۳) امام حسینؑ شب جمعہ ۳ شعبان سن ۶۰ ہجری کو مکہ میں وارد ہوئے اور ۸ ذی الحجہ تک اس شہر میں فعالیت میں مشغول رہے.(۴)

---

(۱) سورہ قصص /۲۱

(۲) آل عمران /۹۷

(۳) وقعۃ الطف، ص۱۰۳۔۱۰۷

(۴) حوالہ سابق، ص۸۸، فاقبل اھلھا یختلفون الیہ و یاتونہ ومن کان بھا من المعتمرین واھل الآفاق

مکہ سے خروج

سوال ۴: امام حسینؑ نے حج کیوں نامکمل چھوڑ دیا اور اس وقت مکہ سے کیوں نکلے جب مراسم حج شروع ہو رہے تھے؟

جواب: اس سوال کے تاریخی تجزیے سے پہلے اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری ہے کہ فقہی طور پر یہ کہنا غلط ہے کہ امام حسینؑ نے اپنا حج نامکمل چھوڑ دیا کیونکہ امام حسینؑ ۸ ذی الحجہ (یوم الترویہ) کے دن مکہ سے نکلے۔(۱) جب کہ حج کے اعمال ۹ ذی الحجہ کے دن مکہ سے احرام باندھ کر عرفات میں وقوف سے شروع ہوتے ہیں لہٰذا امامؑ اصولاً حج کے اعمال میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے کہ ہم کہہ سکیں آپ نے حج کو نامکمل چھوڑ دیا، ہاں آپ نے مکہ میں ورود کے وقت عمرہ مفردہ انجام دیا تھا اور چونکہ آپ چند ماہ مکہ میں رہے ممکن ہے آپ نے اس دوران کئی دفعہ عمرہ مفردہ انجام دیا ہو گا لیکن عمرہ مفردہ کی انجام دہی اعمال حج میں دخول شمار نہیں ہوتی، بعض دیگر روایات میں بھی آپ کی عمرہ مفردہ کے اعمال کی انجام دہی بیان کی گئی ہے۔(۲)

تاریخی نکتہ نظر سے یہ سوال باآخر باقی ہے کہ جب مکہ کے انتخاب کی ایک وجہ یہ تھی کہ اپنے نکتہ نظر کی تبلیغ کے لئے یہاں بڑا اچھا موقع تھا تو پھر کیوں اس وقت مکہ کو چھوڑا کہ جب پوری اسلامی مملکت سے حاجی مکہ، عرفات اور منیٰ میں اکٹھے ہو چکے تھے تو آپ کے لئے تبلیغی طور پر بڑا مناسب موقع تھا، آپ کے اس اچانک فیصلے کے مختلف عوامل خلاصہ کے طور پر درج ہو سکتے ہیں۔

---

(۱) وقعۃ الطف ص ۱۴۷

(۲) عن الصادقؑ: ان الحسین بن علی خرج یوم الترویۃ الی العراق و کان معتمرا، وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۲۴۶، کتاب حج باب ۷، ابواب العمرۃ ح ۲ اور ۳

پہلا: جانی خطرہ کا احتمال

جب مختلف افراد نے آپ کو مکہ سے نکل کر کوفہ جانے سے روکا تو امام نے جو اُن سب لوگوں کو جوابات دیئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ امام سمجھتے تھے کہ مکہ میں مزید قیام کرنے سے ان کی جان کو خطرہ ہے. جیسا کہ ابن عباس کو جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''مکہ کے علاوہ کہیں اور قتل ہو جانا مجھے مکہ میں قتل ہونے سے
زیادہ پسند ہے''(۱)

آپ نے عبداللہ بن زبیر کے جواب میں بھی فرمایا:

''خدا کی قسم اگر ایک بالشت مکہ سے باہر قتل کیا جاؤں یہ مجھے
زیادہ پسند ہے بجائے اس کے کہ میں مکہ کے اندر مارا جاؤں،
خدا کی قسم اگر میں کسی پرندے کے گھونسلے میں بھی چھپ جاؤں
تب بھی مجھے وہاں سے باہر نکالیں گے تا کہ میں وہ مان جاؤں
جو وہ چاہتے ہیں''(۲)

آپ نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ سے ملاقات میں صاف لفظوں میں فرمایا کہ:

''یزید حرم امن الٰہی کے اندر میرے قتل کا منصوبہ رکھتا ہے''(۳)

بالآخر بعض کتابوں میں یہ صاف لکھا ہے کہ یزید نے امام حسین علیہ السلام کو مکہ میں قتل کرنے کے لئے حاجیوں کے روپ میں مسلح افراد بھیج رکھے تھے.(۴)

دوسرا: حرم کی حرمت کی حفاظت

سابقہ جواب میں جو عبارات ذکر کی گئی ہیں ان میں امام حسین علیہ السلام کی طرف

---

(۱) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج۸، ص۱۵۹

(۲) وقعۃ الطف، ص۱۵۲

(۳) سید ابن طاؤس، لہوف، ص۸۲

(۴) حوالہ سابق

سے اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ:

''میں نہیں چاہتا کہ میرے قتل سے حرم امن الٰہی کی حرمت پامال ہو، اگرچہ اس گناہ کا ارتکاب کرنے والے اموی جاسوس ہوں گے''

حضرت نے یہ بات عبداللہ بن زبیر سے کہی جو درحقیقت اسی کی طرف اشارہ تھا کہ ان کے مکہ میں رہ جانے کی وجہ سے یزیدی لشکر کعبہ وحرم کی حرمت توڑ دیں گے، آپ نے عبداللہ بن زبیر کے جواب میں فرمایا:

ان ابی حدثنی ان لھا کبشا بہ تستحل حرمتھا فما احب ان اکون انا ذلک الکبش.

''میرے باپ نے مجھے بتلایا کہ مکہ میں مینڈھا ہوگا جس کی وجہ سے اس کی حرمت توڑی جائے گی اور میں نہیں چاہتا کہ میں وہ مینڈھا بنوں''(۱)

کوفہ کا انتخاب

سوال ۵ : امام حسین علیہ السلام نے اپنے قیام کے لئے کوفہ کا انتخاب کیوں فرمایا؟

جواب: ہمیشہ شیعہ سنی اور مستشرقین محققین کے سامنے یہ سوال رہا ہے اور ہر کسی نے اپنی استعداد اور اپنے عقائد ومبانی کے مطابق اس کا جواب دیا ہے، کچھ امور نے مل کر اس سوال کی اہمیت اور زیادہ کر دی ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

۱) امام حسینؑ اپنے اس سیاسی و مسلح قیام میں ظاہری کامیابی حاصل نہیں کر سکے اور اس کی بڑی وجہ کوفہ کو قیام کا مقام انتخاب کرنا تھا۔

۲) اس دور کی اہم شخصیات جیسے آپ کے چچازاد بھائی

---

(۱) ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۵۴۶

۱) عبداللہ بن جعفر (سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کے شوہر).(۱)

۲) عبداللہ بن عباس.(۲) ۳) عبداللہ بن مطیع (۳)

۴) مسور بن مخرمہ (۴) ۵) محمد بن حنفیہ (۵)

نے آپ کو عراق (کوفہ) جانے سے روکا اور بعض نے تو یہ بھی کہا کہ کوفی پہلے آپ کے بابا اور بھائی سے بھی بے وفائی کر چکے ہیں آپ سے بھی وفا نہیں کریں گے لیکن امام پاکؑ نے ان سب کی باتوں کو (جو کہ بعد میں درست ثابت بھی ہوگئیں) رد کرتے ہوئے اپنے عزم و جزم کو ثابت رکھا اور کوفہ کی طرف چلے آئے، یہاں اب بعض مورخ جیسے ابن خلدون صریحاً کہتے ہیں کہ امام نے یہاں سیاسی غلطی کی (نعوذ باللہ).(۶) بعض لوگوں نے اپنی گفتگو میں کوفہ کے علاوہ بعض دوسری جگہوں کا مشورہ دیا، جیسا کہ ابن عباس نے آپ سے کہا "اگر آپ مکہ سے خروج پر مصر ہیں تو پھر آپ یمن کی طرف چلے جائیں وہاں مستحکم قلعہ اور وادیاں موجود ہیں اور بڑی وسیع سرزمینیں ہیں وہاں سے آپ اپنے داعی اور مبلغ دوسرے علاقوں کی طرف بھیج سکتے ہیں.(۷) کیوں امامؑ نے ان دوسری جگہوں میں سے کسی کا انتخاب نہ کیا؟

اس جیسے سوالات کے مقابل غیر شیعہ افراد یعنی سنی اور مستشرقین صاف الفاظ میں امام کے علم غیب اور خطاء سے عصمت کے شیعہ عقائد کے بارے میں بحث و تجزیہ کرنے کے

---

(۱) ابن اعثم کوفی، الفتوح، ج۵،ص۶۷

(۲) حوالہ سابق،ص۲۶

(۳) البدایۃ والنہایۃ، ج۸،ص۱۶۲

(۴) حوالہ سابق،ص۱۶۳

(۵) بحار الانوار، ج۴۴،ص۳۶۴

(۶) مقدمہ ابن خلدون،ص۲۱۱

(۷) ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲،ص۵۴۵

ساتھ اس قیام کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے اس طرح مسلح قیام شروع کرنے میں (نعوذ باللہ) غلطی کی، لیکن شیعہ محققین اپنے عقائد کی رو سے اس تحریک کا تجزیہ کرتے ہیں، اس بارے میں شیعہ محققین نے متعدد نظریات ذکر کئے ہیں اور ان سب کی بازگشت درج ذیل دو نظریات کی طرف ہوتی ہے۔

پہلا نظریہ شہادت

یہ نظریہ ذیل کے چند امور پر موقوف ہے:

۱) ائمہ میں سے ہر ایک جب منصب امامت کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے تو صحیفہ کھولتا ہے اور اس میں اس کی تا شہادت ذمہ داریاں لکھی ہوتی ہیں وہ انہی پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔(۱)

۲) امام حسینؑ نے جب وہ صحیفہ کھولا تو اس میں آپ کے لئے ذمہ داریاں لکھی تھیں:

قاتل فاقتل فتقتل واخرج باقوام للشهاده لهم الا معک.(۲)

''جنگ کریں اور قتل کریں پھر آپ بھی قتل کیے جائیں گے کچھ گروہ آپ کے ساتھ شہادت کے لئے ہوں گے۔ ان کے ساتھ نکلیں اور ان کو شہادت نہیں ملے گی صرف آپ کے ساتھ'' بنابرین ابتداء ہی سے مشیت الٰہی امام حسینؑ کی شہادت کے بارے تھی اور آپ کے پاس اس مشیت الٰہی کو پورا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، جیسا کہ دوسری مرتبہ پھر جب آپ عراق کی طرف خروج پر آمادہ تھے پیغمبر اکرمؐ کے ذریعے خواب میں آپ کو اس وظیفہ پر تاکید کی گئی۔ جیسا کہ جب محمد بن حنفیہ نے آپ سے کوفہ جانے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا'' نانا رسولؐ میرے خواب میں آئے تھے انہوں نے مجھے فرمایا:

---

(۱) اصول کافی، ج۲،ص۲۸۔۳۶

(۲) حوالہ سابق،ص۲۸،حدیث۱

یا حسین اخرج فان اللہ قد شاء ان یراک مقتولا.(۱)

اس نظریہ (۲) کے مطابق امام حسین علیہ السلام کا عراق کی طرف سفر شہادت کی طرف سفر تھا اور اس سفر کا مقصد اس ہدف تک پہنچنا تھا. حضرتؑ کو اس نتیجہ کا مکمل علم تھا اور یہ وظیفہ امام حسینؑ کے ساتھ خاص تھا اور آپ کے علاوہ کسی دوسرے حتیٰ ائمہ کے لئے بھی قابل تقلید نہیں تھا. لہٰذا اس میں چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور یوں اس دور کی بڑی بڑی شخصیات کے روکنے کے باوجود امام کا اس راہ پر گامزن رہنے پر اصرار سمجھ میں آجاتا ہے. کیونکہ ان کی نظر میں وہ خود ہر کسی سے زیادہ کوفیوں کی بے وفائی و غداری سے آگاہ تھے آپ جانتے تھے کہ کوفی بالآخر آپ کو تنہا چھوڑ دیں گے، بلکہ آپ کے ساتھ جنگ کے لئے نکل آئیں گے اور آپ کو شہید کر دیں گے، اس علم کے باوجود، آپ نے کوفہ کی طرف سفر اختیار کیا تا کہ اپنی قربان گاہ میں پہنچ کر منزلت شہادت پر فائز ہوں.

اب یہ سوال کہ اس شہادت کا کیا مقصد تھا؟ اس بارے میں اس نظریہ والوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے. بعض نے اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ خون امام کے ذریعے شجر اسلام کی آبیاری اس مقصد کا بلند ترین مرتبہ ہے. یہی خون اسلام کی پائیداری اور بنی امیہ و یزید کی رسوائی کا باعث بنا، جس کی وجہ سے بالآخر ستر سال بعد (۱۳۲ ہجری میں) بنی امیہ کی خلافت کا سقوط ہوا، بعض دوسرے (کہ جن میں سے اکثر عوام اور ان پڑھ شیعہ ہیں) قائل ہیں کہ امام کی شہادت کا مقصد اپنے گناہ گار شیعوں کے گناہوں کا کفارہ اور ان کی شفاعت تھا، یہ وہی نظریہ ہے جو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر چڑھنے کے حوالے سے پیش کرتے ہیں.(۳)

اس نظریہ پر (روایت کے سندی اشکال کے علاوہ) کئی جہات سے اشکالات وارد ہیں

---

(۱) لہوف، ص۸۴

(۲) مزید تفصیلات کے لئے دیکھیں، شہید فاتح، در آئینہ اندیشہ، محمد صحتی سردرودی، ص۲۰۵-۲۳۱

(۳) شہید فاتح، ص۲۳۹

جیسے:

۱) امام حسین علیہ السلام اگر اس بارے میں خاص دستور رکھتے تھے تو اس سے امام حسینؑ اور دوسرے ائمہ عام لوگوں کے لئے اسوہ نہیں رہیں گے جب کہ ان کا اسوہ ہونا اور شیعہ پر ائمہ معصومینؑ کی پیروی کرنا تمام ادوار میں مسلّم اصول میں سے رہا ہے۔

۲) یہ نظریہ امام حسینؑ کے اس فرمان ''لکم فی اسوہ'' (۱) سے متعارض ہے۔

۳) اگر چہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بارے میں سابقہ انبیاء، پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علی علیہ السلام و امام حسنؑ کی پیشگوئیوں کو قبول کیا جا سکتا ہے اور خود امام حسین علیہ السلام کا اپنی شہادت سے آگاہ ہونا بھی ان کے کلام سے سمجھا جا سکتا ہے. لیکن آپ کے کسی کلام سے یہ استفادہ نہیں ہوتا کہ امام کے قیام کا مقصد شہادت ہو. بلکہ اس قیام سے آپ کا ہدف کیا تھا یہ آپ کی اپنی گفتگو سے سمجھا جانا چاہیے اور اس بارے میں سب سے واضح ترین آپ کی وہ گفتگو ہے جو آپ نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو وصیت کرتے ہوئی فرمائی.

جس میں آپ نے فرمایا:

......وانما خرجت اطلب الا صلاح فی امة جدی
ارید ان امر بالمعروف و انهی عن المنکر وا سیر
بسیرة جدی وا بی علی بن ابی طالب .(۲)

اس عبارت میں سید الشہداء نے اپنے قیام ونہضت کے تین ہدف ومقصد ذکر کیے ہیں جو کہ طلب اصلاح، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اور سیرت رسول خدا اور سیرت علی مرتضیٰ پر عمل ہیں اور آپ نے شہادت کو ہدف کے طور ذکر نہیں فرمایا:

دوسرا نظریہ: اسلامی حکومت کی تشکیل

بعض کتابوں میں لکھا ہے (۳) کہ یہ نظریہ ابتداء میں تشیع کے درمیان سید مرتضیٰ علم

---

(۱) تاریخ طبری، ج۵، ص۴۰۳ ، (۲) بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۲۹، ابن اعثم کوفی، الفتوح، ج۵، ص۲۱ (۳) شہید فاتح، ص۱۶۹

الھدیٰ (۳۵۵-۴۳۶ھ) کی عبارتوں میں صریحاً نظر آتا ہے. آپ سے جب امام کے کوفہ کی طرف جانے کے بارے سوال ہوا تو آپ نے کہا...... ہمارے آقا امام حسین علیہ السلام حکومت حاصل کرنے کے لئے کوفہ کی طرف نہیں گئے مگر اس کے بعد کہ قوم کی طرف سے عہد و پیان حاصل ہو گئے اور آپ کو کامیابی کا اطمینان ہو گیا.(۱) سید مرتضیٰ کے بعد اس نظریہ کے قائل تشیع میں زیادہ نظر نہیں آتے، بلکہ بزرگ علماء جیسے شیخ طوسی، سید ابن طاؤس، علامہ مجلسی اور دوسرے بڑے بڑے علماء نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا بلکہ بعض نے تو اس کی سخت مخالفت بھی کی.(۲)

موجودہ دور میں بھی بعض لکھنے والے اس نظریہ کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اس خاطر کہ اہل سنت اور مستشرقین کے اعتراضات کا جواب تاریخی تجزیوں کے ذریعے دیا جاسکے. اس نظریے کو اپنے زمانے میں اس دور کی علمی محافل میں طاری فضا کی وجہ سے علماء کی طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا جبکہ شہید مطہری اور ڈاکٹر شریعتی جیسی شخصیات نے بھی اس نظریہ کو قبول نہ کیا.(۳)

اس نظریہ کا اہم اشکال امام علیہ السلام کے علم غیب سے غفلت ہے البتہ اصل نظریہ کہ امام حسین علیہ السلام کی تحریک کا مقصد اسلامی حکومت کی تشکیل تھا اور یہ مقصد یزید کے خلاف قیام اور غاصبوں کی رسوائی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا، امام خمینی جیسی شخصیات کا مورد تائید تھا، امام خمینیؒ نے کئی جگہوں پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور دینی صالح حکومت کے قیام کی کوشش کو امام حسینؑ کے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد شمار کیا ہے جیسا کہ:

الف) ۱۳۵۰ ہجری شمسی میں آپ نے نجف اشرف میں اپنی ایک تقریر کے دوران فرمایا:

---

(۱) شہید فاتح، ص ۱۷۰، منقول از تنزیہ الانبیاء، ص ۱۷۵

(۲) مخالفین کی تفصیلات کے لئے دیکھیں: شہید فاتح، ص ۱۸۴-۱۹۰، ۲۰۵-۲۳۱

(۳) مخالفین کی تفصیلات کے لئے دیکھیں: رسول جعفریان، جریانہا و جنبش ھای مذھبی - سیاسی ایران، ص ۲۰۸-۲۱۴

"امام حسینؑ نے مسلم بن عقیل کو اس لئے بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو بیعت کی دعوت دیں اور اسلامی حکومت تشکیل دے کر فاسد حکومت کا خاتمہ کر دیں"(۱)

ب) سید الشہداء مکہ تشریف لائے اور پھر مکہ سے اس حال میں نکلنا خود ایک بہت بڑا سیاسی قدم تھا، امام حسینؑ کے تمام اقدامات سیاسی تھے، اسلامی سیاسی تھے اور اسلامی سیاسی قدم یہ تھا کہ بنی امیہ کو نابود کر دیں اگر امام حسینؑ کا یہ اقدام نہ ہوتا تو اسلام پامال ہو چکا ہوتا.(۲)

ج) امام حسین علیہ السلام تشریف لائے حکومت بھی لینا چاہتے تھے بلکہ آنے کا مقصد ہی یہی تھا اور یہ ایک فخر ہے. جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سید الشہداء حکومت کے لئے نہیں آئے تھے (غلطی پر ہیں) امام حکومت کے لئے تشریف لائے تھے. اس لئے کہ حکومت سید الشہداء جیسے امام کے ہاتھ میں ہو اور ان کے ہاتھوں میں ہو جو سید الشہداء کے شیعہ ہوں.(۳)

اس مسئلہ کے اثبات کے لئے درج ذیل دلیلوں سے استفادہ کر سکتے ہیں:

۱) سب سے اہم دلیل سید الشہداء کے ارشادات گرامی ہیں. مدینہ سے نکلتے وقت آپ نے اپنے قیام کے تین اہداف و مقاصد ذکر فرمائے.(۴)

۱) اصلاح، ۲) امر بالمعروف، ۳) سیرہ رسولؐ و سیرۃ علیؑ پر عمل،

واضح ہے کہ بڑی اصلاح بغیر تشکیل حکومت کے ممکن نہیں ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا آخری مرتبہ بھی حکومت تشکیل دیے بغیر ممکن نہیں ہے جب تک حاکم اسلامی مکمل قدرت و تسلط نہ رکھتا ہو اس کے لئے اس وظیفہ پر عمل ممکن نہیں ہے، ان سے بھی بڑھ کر آپ نے اپنے نانا رسولؐ اور بابا علیؑ کے سیرہ پر عمل کو ذکر فرمایا ہے اور یہ اشارہ ہے ان دو

---

(۱) صحیفہ نور، ج۱، ص۱۷۴

(۲) حوالہ سابق، ج۱۸، ص۱۳۰

(۳) صحیفۂ نور، ج۲۰، ص۱۹۰

(۴) بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۲۹

ہستیوں کی حکومتی سیرۃ کی طرف یعنی آپ ان ہستیوں کی سیرت کو جاری رکھنے کا ذکر کر کے اپنے تشکیل حکومت کے مقصد کو اجاگر فرمار ہے ہیں.

۲) کوفہ سے آنے والے خطوط کی اکثریت اس بات پر مشتمل تھی کہ ہمارے پاس تلواریں آمادہ ہیں لیکن ہمارے لئے امام موجود نہیں ہیں. اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ یزیدی حکومت کو ناحق سمجھتے تھے اور امام سے یہ چاہتے تھے کہ آپ کوفہ تشریف لائیں اور امام حق کے طور پر منصب حکومت سنبھالیں، امام حسین علیہ السلام بھی کوفیوں کی اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنے قیام کا آغاز فرماتے ہیں، مثال کے طور پر کوفہ کے بزرگان جیسے سلیمان بن صرد خزاعی، میتب بن نجبہ اور حبیب بن مظاہر کی طرف سے جو خط لکھا گیا اس میں یوں آیا ہے:

انا ليس علينا امام فاقبل لعل الله ان يجمعنا بك على الحق .(۱)

ہمارے اوپر امام نہیں ہے آپ ہماری طرف تشریف لائیں امید ہے آپ کے ذریعے خداوند ہمیں حق پر جمع کردے.

۳) ان خطوط کا امامؑ کی طرف سے پہلا جواب جو کہ مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجنے کے ہمراہ تھا، اس میں بھی مسئلہ امامت اور تشکیل حکومت کی طرف اشارہ ہوا ہے. یہ بات قابل توجہ ہے کہ آپ نے مسلم بن عقیل کو بھیجتے وقت ایک خط میں کوفہ والوں سے یوں ارشاد فرمایا:

وقد فهمت كل الذى اقتصصتم وذكرتم ومقالة جلكم انه ليس علينا امام فاقبل الله ان يجمعنابك على الهدى والحق .(۲)

''تم لوگوں نے جو کچھ کہا وہ سب میں سمجھ گیا، آپ لوگوں کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اوپر امام نہیں ہے آپ آئیں

(۱) وقعة الطف ، ابی مخنف، ص۹۲

(۲) وقعة الطف ، ابی مخنف ص۹۱

ممکن ہے خدا آپ کے ذریعے ہمیں حق و ہدایت پر جمع کردے"

امامؑ اس خط میں اپنے کوفہ جانے کو اس بات سے مشروط کرتے ہیں کہ مسلم اس کی تائید کردیں جو کچھ ان خطوط میں موجود ہے۔(۱)

۴) ان جوابی خطوط میں امامؑ نے جو شرائط ذکر کی ہیں ان پر توجہ کی جائے تو یہ بھی ایک طرح سے اس نظریہ کے اثبات میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں مگر قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان عبارتوں میں بھی امامؑ نے زیادہ تر امامت کے حکومتی و انتظامی پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور امامت کے بیان شریعت جیسے پہلوؤں کو اصلاً بیان نہیں فرمایا کہ بعد میں بعض لوگوں نے امامت کو اسی پہلو پر منحصر کردیا۔

امام پاکؑ کے سابقہ خط میں امام نے بعد والی عبارت میں فرمایا ہے:

فلعمری ماالاما م الا لعامل بالکتاب والاخذ بالقسط والدائن بالحق والحابس نفسه علی ذات الله.(۲)

"مجھے میری جان کی قسم امام صرف وہی ہوسکتا ہے جو کتاب خدا کا عالم، عدل و انصاف کا جاری کرنے والا، حق پر عمل کرنے والا اور اپنی تمام فعالیات راہ خدا میں انجام دینے والا ہو"

۵) جناب مسلم بن عقیل کی اکثر فعالیات جیسے لوگوں سے امام حسین علیہ السلام کی مدد کے حوالے سے اپنے عہد و پیمان پر عمل کرنے کی بیعت لینا(۳) اور بیعت کرنے والوں کے نام ایک رجسٹر میں لکھنا (جن کی تعداد ۱۲ ہزار سے ۱۸ ہزار تک ذکر کی گئی ہے)۔(۴)

---

(۱) حوالہ سابق، فان کتب الی انه قد اجمع رای ملأکم و ذوی الفضل والحجی منکم علی مثل ماقدمت علی به رسلکم وقرات فی کتبکم اقدم علیکم وشیکاً ان شاء الله

(۲) وقعة الطف، فان کتب الی انه قد اجمع رای ملأکم و ذوی الفضل والحجی منکم علی مثل ماقدمت علی به وسلکم وقرات فی کتبکم اقدم علیکم وشیکاً ان شاء الله

(۳) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۱۵، ۲۱۶

(۴) مروج الذهب، ج۳، ص۶۴، الارشاد، شیخ مفید، ص۳۸۳

سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ امامؑ کا مقصد کوفہ میں اسلامی حکومت کو تشکیل دینا تھا۔

۶) جب کوفہ میں مسلم کے طرفداروں کی تعداد بڑھنے لگی تو بنی امیہ کے بہی خواہوں نے جو خطوط یزید کو لکھے ان سے بھی یہ نکتہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح کی سرگرمیوں کے جاری رہنے کی صورت میں کوفہ کو ہاتھ سے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ذیل کی عبارت اس کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔

فان کان لک بالکوفہ حاجة فابعث الیھا رجلاً قویاً ینفذ امرک ویعمل مثل عملک فی عدوّک۔ (۱)

''اگر تمہیں کوفہ کی ضرورت ہے تو پھر اس کی امارت کسی مقتدر شخص کے سپرد کرو جو تمہارے حکم کو وہاں نافذ کرے اور تیرے دشمن کے خلاف تجھ جیسا عمل کرے''

۷) حضرت مسلم کی امام حسین کو کوفہ کے حوالے سے یہ رپورٹ بھیجنا کہ لوگ آپ کی مدد پر آمادہ ہیں جلد تشریف لائیں، جس کی بنا پر امامؑ نے کوفہ کی طرف تشریف لے جانے کا اقدام فرمایا (۲) یہ بھی ہمارے اس دعویٰ کی بہترین دلیل ہے، امامؑ نے راستے سے ایک خط کوفیوں کے نام لکھا اور اسے قیس بن مسھر صیداوی کے ہاتھ روانہ کیا، جس میں جناب مسلم کے خط کے ذریعے تائید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں یہ خبر دی کہ میں ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے کوفہ کی طرف نکل چکا ہوں اور انہیں یہ فرمایا کہ آپ لوگوں اپنی سعی و کوشش جاری رکھیں تاکہ میں کوفہ شہر میں داخل ہو سکوں۔

"فان کتاب مسلم بن عقیل جاونی یخبرنی فیه بحسن

---

(۱) وقعة الطف، ص۱۰۱

(۲) وقعة الطف، ص۱۱۲، فان الرائد لا یکذب اهله وقد بایعنی من اهل الکوفة ثمانیة عشر الفاً فعجل الاقبال حین یاتیک کتابی فان الناس کلهم معک لیس لهم فی آل معاویة رای ولا هوی؛

رایکم واجتماع ملا کم علی نصرنا والطلب بحقنا فسالت الله ان یحسن لنا الصنع وان یثیبکم علی ذلک اعظم الاجر وقد شخصت الیکم من مکه یوم الثلثا لثمان مطیب من ذی الحجة یوم الترویة فاذا اقم علیکم رسولی فانکمشوا امرکم وجدوا فانی قادم علیکم فی ایامی هذه .(۱)

"مسلم کا خط مجھے مل گیا، جس میں اس نے لکھا کہ تم لوگ ہماری مدد اور دشمن سے ہمارے حق کے لینے پر تیار ہو، میں خداوند سے تمہارے کاموں میں اچھائی اور اس پر عظیم اجر کی دعا کرتا ہوں، میں تمہاری طرف مکہ سے منگل کے دن آٹھ ذی الحجہ ترویہ کے دن نکل چکا ہوں، جب میرا قاصد تم پر وارد ہوا اپنے آپ کو جلدی سے تیار کرلیں اور اپنے کام میں خوب جدوجہد کریں میں جلدی پہنچ جاؤں گا"

بعض اعتراضات

اس نظریہ پر سب سے اہم دو اعتراض وارد ہوتے ہیں:

۱) یہ نظریہ تشیع کے اس عقیدے کے خلاف ہے کہ جس میں شیعہ ائمہ کو عالم غیب سمجھتے ہیں.

۲) اس نظریہ میں امام کی طرف غلطی کی نسبت دی گئی ہے جو کہ آئمہ کی عصمت کے منافی ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اشکال وہ اہم ترین سبب ہے جس کی وجہ سے شیعہ اجتماع اس نظریے کے خلاف ہوا ہے.

---

(۱) الارشاد، شیخ مفید، ص ۲۱۸

اس اشکال کا اگر جواب دینا چاہیں تو ہمیں علم کلام کی دقیق ابحاث میں جانا پڑے گا، جیسا کہ علم غیب کی حقیقت کیا ہے، عصمت کیا ہے، اس کی حدود کیا ہیں، تاریخی حقائق کے ساتھ اس کے تناقض کا جواب کیا ہے، لیکن ہماری گفتگو کا محور تاریخی واقعات کی تحلیل و تجزیہ ہے لہٰذا ہم ان بحثوں سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ ضرور کہیں گے کہ علم کلام کے مبانی کے ساتھ بھی اس نظریہ کو قبول کرنے کے امکانات پائے جاتے ہیں، جیسا کہ امام خمینی کی تحلیل کی بنیاد بھی اسی طرح کی ہے، حکومت کی تشکیل ایک ذمہ داری ہے جس میں اتمام حجت، سمجھداری اور دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہے لیکن نتیجہ خدا پر ہے جو وہ چاہے اسی پر راضی ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر ہمیں نتیجہ کا علم ہو تب بھی یہ وظیفہ کی انجام دہی سے مانع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو حق کی بنیاد پر حرکت کرتا ہے اس کی شکست وقتی و ظاہری ہوگی، بالآخر تاریخ کے اوراق میں فتح اسی حق طلب تحریک ہی کی لکھی جائے گی، اشکال یہ ہوا کہ امام کا اپنے مقصد (حکومت کی تشکیل) میں کامیاب نہ ہونا اور خط لکھ کر بلانے والوں کی غداری و خیانت کا ظاہر ہونا دلالت کرتا ہے کہ امام حسینؑ نے (نعوذ باللہ) کوفیوں کے بارے غلط اندازہ لگایا اور بعض دوسرے افراد جیسے ابن عباس وغیرہ کا کہا ہوا سچ ثابت ہوا۔

اس اشکال کے جواب کے لئے امام حسینؑ کی معقول نہضت کی واقعیت پر مبنی تاریخی تحلیل کرنا ضروری ہے۔

امام حسینؑ کے قیام کی عقلی بنیادیں

اگر کوئی سیاسی شخصیت حالات کا مکمل تجزیہ اور تحقیق کرنے کے بعد منطقی طور پر ایک فیصلہ کرلے اور پھر بعض غیر متوقع اسباب و موانع پیش آجائیں جو اس کے فیصلوں کے سامنے رکاوٹ پیدا کردیں تو اس سے اس شخصیت کے فیصلوں کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا، ہم کہتے ہیں کہ اس دور میں امام حسین علیہ السلام کوفہ کے حالات کو مکمل طور پر نظر میں رکھے ہوئے تھے، معاویہ کے دور میں امام حسینؑ نے کوفیوں کو مثبت جواب نہ دیا اور ان کے

تقاضوں کو رد کر دیا،(۱) بلکہ آپ نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو بھی کوفیوں کے ان خطوط کا مثبت جواب دینے سے روک دیا.(۲)

یہاں بھی آپ نے کوفہ والوں کے خطوط کے ملتے ہی ان کی طرف جانے کا فیصلہ نہیں فرمالیا بلکہ ان کے دعووں کی سچائی اور صحت یا عدم صحت کے پرکھنے کے لئے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور جب مسلم نے ایک مہینہ وہاں قیام فرمالیا اور وہاں کے حالات کو نزدیک سے دیکھ لیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوفہ کے حالات امام حسینؑ کے ورود کے لئے مناسب ہیں اور یہ بات آپ نے ایک خط میں امام علیہ السلام کو لکھ بھیجی .تو اس کے بعد امام پاک نے کوفہ کی طرف سفر شروع کیا البتہ حج کے ایام میں امامؑ مکہ سے جلد نکلنا قتل کے اس احتمال کی وجہ سے تھا جو پہلے بیان ہو چکا ہے، اسی اثنا میں ایک غیر متوقع کام یہ ہوا کہ کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو معزول کر کے اس کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا گورنر بنا دیا گیا اور یہ چیز کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھی بلکہ ظاہری حالات تو مکمل طور پر اس کے برخلاف نظر آرہے تھے کیونکہ یزید اور عبید اللہ بن زیاد کے تعلقات بہتر نہیں تھے یزید اس پر ناراض تھا.(۳) اور اس کو بصرہ کی گورنری سے بھی معزول کرنا چاہتا تھا.(۴) بلکہ بعض کتابوں میں آیا ہے کہ :

کان یزید ابغض الناس فی عبید اللہ بن زیاد.(۵)

''یزید، ابن زیاد کا سب سے بڑا دشمن تھا''

اس کے باوجود اگر جناب مسلم اور ان کے ساتھی ابن زیاد کی طرح دھونس ودھمکی

---

(۱) دینوری ، الاخبار الطوال،ص۲۰۳

(۲) ابن کثیر ، البدایۃ والنہایۃ، ج۸،ص۱۶۳

(۳) تاریخ طبری،ج۵،ص۳۵۶۔۳۵۷،تاریخ کامل، ج۲،ص۵۳۵

(۴) ابن مسکویہ ،تجارب الامم ،ج۲،ص۴۲، البدایۃ والنہایۃ،ج۸،ص۱۵۲

(۵) سبط ابن جوزی،تذکرہ الخواص،ص۱۳۸

اور طمع ورشوت جیسے حربوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہوتے اور بیعت کرنے والوں کے حالات بہتر کر سکتے ہوتے اور مختلف قسم کی سیاسی ، اجتماعی اور نفسیاتی چالیں چلتے جیسا کہ ابن زیاد نے یہ سب کچھ کیا تو کوفہ میں ان کی کامیابی کے امکانات بھی خاصے بڑھ جاتے. بلکہ اگر شریک بن اعور اور عمارہ بن عبدالسلول کے مشورے کے مطابق جناب مسلم، ہانی بن عروہ کے گھر میں ابن زیاد کو قتل کر دیتے تو بھی کوفہ کے حالات کو کنٹرول کر سکتے تھے.(۱)

ان سب حالات کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام، ابن عباس وغیرہ جیسے افراد سے زیادہ کوفہ کے حالات سے واقفیت رکھتے تھے کیونکہ پہلا یہ کہ ابن عباس کی شناخت بیس سال پہلے کی تھی یعنی حضرت علیؑ اور حضرت امام حسنؑ کے دور کے لحاظ سے تھی جب کہ امام حسینؑ موجودہ دور کے حالات سے واقف تھے. دوسرا یہ کہ امام علیہ السلام کی یہ واقفیت کوفہ کے بزرگان جیسے سلیمان بن صرد اور حبیب ابن مظاہر کے خطوط سے حاصل ہوئی تھی ، اس کے علاوہ خود امام کے نمائندے یعنی مسلم بن عقیل نے ان حالات کو قریب سے دیکھ کر ان کی تائید کی تھی جب کہ ابن عباس وغیرہ کے پاس ان حالات کو قریب سے پہچاننے کے وسائل موجود نہیں تھے.

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کوفہ کے حالات بیس سال والے کوفہ سے اس حد تک تبدیل ہو چکے تھے کہ اب کوفہ والوں میں امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دینے والے جذبے اجاگر ہو چکے تھے اور ان کے پیچھے ہٹ جانے یا دھوکہ دینے کا احتمال لوگوں کے ذہنوں میں بہت کم آتا تھا کیونکہ :

پہلا یہ کہ: اسلامی دارالخلافہ کے حوالے سے وہ شام سے شکست کھا چکے تھے اور اسلامی دنیا کی مرکزیت کوفہ سے شام منتقل ہو چکی تھی اور کوفہ کو پیچھے دھکیلنے کی اموی سیاست کوفہ والوں کو اس بات پر ابھارتی تھی کہ کسی بھی طرح وہ اپنی عظمت رفتہ کو زندہ کریں .

---

(۱) الکامل فی التاریخ، ج۲،ص ۵۳۷

دوسرا یہ کہ : اس دور میں اموی حکمرانوں کی کوفیوں بالخصوص شیعوں پر ہر طرح کی سختی انہیں امویوں کے خلاف کوئی ٹھوس اقدام کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

تیسرا یہ کہ: کوفیوں کی یزید اور امام حسینؑ کے بارے میں سابقہ شناسائی بھی انہیں خلافت یزید کو قبول نہ کرنے پر مزید پختہ تر کر رہی تھی.

یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ مرکزی حکومت (حکومت شام) یزید کی ناتجربہ کاری اور اس کی دینی، سیاسی اور اجتماعی شخصیت کا اس کے باپ معاویہ کے ساتھ ناقابل مقایسہ ہونے جیسے عوامل کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی نیز کوفہ کی حکومت کے بھی کمزور ہونے کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام کا کوفہ میں حکومت تشکیل دے کر مرکزی حکومت سے مقابلہ کرسکنے کے امکانات کافی حد تک روشن نظر آ رہے تھے. لہٰذا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تاریخی تحلیل کے نقطہ نظر سے کوفہ کے حالات امام حسین علیہ السلام کی حیثیت، اور شام کی مرکزی حکومت کے حالات کے پیش نظر امام حسین علیہ السلام کا کوفہ کی طرف جانے کا قصد کرنا مکمل طور پر صحیح تھا، اگر غیر متوقع حالات وعوامل پیش نہ آتے تو تحریک کی ظاہری کامیابی کے امکانات بھی کافی روشن تھے .

یمن کو منتخب نہ کرنا

سوال ۶ : امام حسین علیہ السلام نے اپنے قیام کے لئے یمن کا انتخاب کیوں نہ فرمایا جب کہ وہاں اهل تشیع کی تعداد بھی کافی تھی ؟

جواب : ابن عباس نے جو امام حسین علیہ السلام کو مشورہ دیا اس میں کہا کہ آپ یمن چلے جائیں وہاں سے آپ اپنے داعی ومبلغ دوسرے علاقوں کی طرف بھیجیں اور وہاں رہ کر اپنی تحریک کی رہنمائی کرتے رہیں تاکہ آپ یزید کا مقابلہ کرسکیں.(۱)

اب یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیوں امامؑ نے اس مشورہ کو بالکل ہی درخور

---

(۱) الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۵۴۵

اعتناء نہ کیا؟

اس سوال کے جواب میں درج ذیل امور پر توجہ ضروری ہے:

۱) رسول اکرمؐ کے زمانے میں جب حضرت علیؑ یمن میں موجود تھے تو اگرچہ یمن والے حضرت علیؑ سے خوش تھے اور آپ کی طرف ان کے دل میلان رکھتے تھے لیکن کوفہ کے مقابلے میں قطعاً یمن کو اس زمانے میں شیعیت کا مرکز شمار نہیں کیا جا سکتا۔

۲) اہل یمن کا ماضی بتلاتا ہے کہ بحرانی حالات میں ان کے اوپر دارو مدار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے دوران معاویہ کی فوجی کارروائیوں کے سامنے یہی یمنی ہی تھے (۱) جنہوں نے کوتاہی کرتے ہوئے اپنے گورنر عبداللہ بن عباس کو تنہا چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ کوفہ کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوگیا اور معاویہ کے بے رحم دستوں نے بسر بن ارطاۃ کی سرکردگی میں شہر پر آسانی سے قبضہ کرلیا اور بہت سے لوگ کہ جن میں عبداللہ بن عباس کے دو چھوٹے بچے بھی موجود تھے قتل کر دیے گئے۔(۲) (جب کہ معاویہ کے یہ دستے زیادہ مضبوط بھی نہیں تھے)

۳) اس دور میں یمن اسلامی مملکت کے اہم اور مرکزی شہروں میں شمار نہیں ہوتا تھا اور دوسرے اہم شہروں جیسے کوفہ، بصرہ اور مدائن وغیرہ کے قریب بھی نہیں تھا کہ جہاں سے حضرت کو حمایت ملنے کی توقع تھی۔

۴) حضور اکرمؐ کے وصال کے ساتھ ہی یمن کے قبائل کے ارتداد نے اس ملک کے بارے میں ایک منفی تصور ذہنوں میں چھوڑ رکھا تھا اور یہ احتمال موجود تھا کہ اگر امامؑ اپنے قیام کے لئے یمن کو مرکز بناتے ہیں تو لوگ حکومت کے خلاف اس قیام کو بھی ماضی کی انہی مثالوں سے مقایسہ کریں گے اور اسے بھی ویسا ہی سمجھیں گے، خصوصاً اموی حکومتی مشینری اس حوالے سے خوب پروپیگنڈا بھی کر سکتی تھی، تا کہ حضرت کے قیام کو بدنام کر سکے۔

---

(۱) الکامل فی التاریخ، ج۱، ص۶۵۱

(۲) حوالہ سابق، ج۲، ص۴۳۱

۵) یمن دوسرے اسلامی شہروں سے بالکل الگ تھلگ اور ہٹ کر تھا جس کی وجہ سے اموی حکومت کے لئے اس قیام کو سرکوب کرنا بالکل آسان ہوتا.

۶) اس زمانے میں امام حسینؑ کے لئے اہل یمن کی طرف سے کوئی باقاعدہ دعوت نہیں آئی تھی لہٰذا حضرت کا دفاع کرنے کی کوئی ذمہ داری وہ اپنے اندر محسوس نہ کرتے جب کہ کوفہ والوں میں امام حسین علیہ السلام کو کوفہ کی دعوت دینے کے لئے جو جذبات وخواہشات موجود تھیں ان کا ایک فیصد بھی یمن والوں میں نہیں تھا جیسے اہل بیت کا عقیدتی دفاع، شام کے مقابل کوفہ کی مرکزیت کا دوبارہ احیاء، کوفہ میں عدالت علوی والی حکومت کا احیاء اور بنی امیہ کے ظلم وستم سے رہائی وغیرہ.

اہلِ کوفہ کی خیانت

سوال ۷: جن کوفیوں نے اس حد تک شوق و جذبے سے امام حسین علیہ السلام کو دعوت دی، انھوں نے حضرتؑ کی مدد کیوں نہ کی بلکہ آپ کے خلاف جنگ میں شریک بھی ہوئے؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لئے دو اور سوالوں کے تفصیلی جوابات دینا ضروری ہیں.

پہلا: کوفیوں نے اتنی وسیع سطح پر کیوں امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی؟

دوسرا: عبداللہ بن زیاد نے کوفہ کے قیام کو سرکوب کرنے کے لئے کن چالوں سے استفادہ کیا؟

سوال اول کا جواب: اس نکتہ پر توجہ رہنی چاہیے کہ کوفیوں نے اس وقت امام حسینؑ سے خط وکتابت شروع کی جب آپ مکہ میں اقامت گزین تھے (نامہ نگاری کی ابتداء دس ماہ رمضان ۶۰ ہجری کو ہوئی)(۱) اور اتنے کثرت سے خطوط بھیجے گئے کہ اسے تحریک خطوط کا نام

---

(۱) وقعة الطف، ص۹۲

بھی دیا جا سکتا ہے اور چند ہی دنوں میں خطوط کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک دن میں تقریبا چھ چھ سو خطوط آنے لگے، یہاں تک امامؑ تک پہنچنے والے خطوط کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی.(۱) جو خطوط ہم تک پہنچے ہیں ان کے نیچے کئے گئے دستخط اور ان میں مذکور نام اور دوسرے قرائن کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خط بھیجنے والے کسی خاص طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ہر طبقے کے مختلف نظریات رکھنے والے لوگ تھے کہ جن میں خاص شیعہ جیسے سلیمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نخبہ خزاری، رفاعہ بن شداد اور حبیب بن مظاہر کے نام بھی دیکھے جا سکتے ہیں (۲) اور ساتھ ساتھ کوفہ میں رہائش پذیر اموی ٹولے کے افراد جیسے شبث بن ربعی (کہ جس نے امام حسینؑ کے قتل پر شکرانے کے طور پر کوفہ میں مسجد بنائی).
(۳) حجار بن ابجر (عاشورہ والے دن یہ لشکر یزید میں تھا جب امام حسینؑ نے اسے اس کا خط دکھایا تو اس نے تحریر پہچاننے سے انکار کر دیا).(۴)

یزید بن حارث بن یزید (اس نے بھی امام کے نام اپنے خط کا انکار کیا).(۵)

عزرۃ بن قیس (یہ لشکر عمر بن سعد میں گھڑسواروں کے دستے کا سالار تھا).(۶)

اور عمرو بن حجاج زبیدی (یہ نہر فرات پر پہرہ دینے والے دستے کا سالار تھا جو امام حسینؑ کے خیموں تک پانی پہنچنے سے مانع تھا)(۷) جیسے افراد کے نام بھی دیکھے جا سکتے ہیں بلکہ زیادہ جوشیلے خطوط انہی کے تھے اور انہوں نے امامؑ کو مسلح لشکر کی آمادگی کے عنوانات سے خطوط لکھے.(۸) ہم سمجھتے ہیں کہ اکثر خط لکھنے والے جن کے نام تاریخ میں نہیں آئے وہ عام

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۳۴

(۲) وقعة الطف، ص۹۰_۹۱

(۳) تاریخ طبری، ج۶، ص۲۴

(۴_۵) حوالہ سابق، ج۵، ص۴۲۵

(۶) حوالہ سابق، ص۴۱۲

(۷) وقعة الطف، ص۹۳_۹۵

(۸) وقعة الطف، ص۹۵

لوگ تھے جو اپنے مادی فوائد کے چکروں میں تھے جس طرف انہیں فائدہ نظر آتا وہ اس طرف چلے جاتے، یہ افراد اگرچہ بحرانوں میں رہبریت تو نہیں کر سکتے لیکن یہ وہ عظیم موج ہیں کہ ایک ماہر موج سوار اپنی سمجھداری کے ساتھ ان سے خوب فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان پر سوار ہو کر اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے۔

زیادہ قوی احتمال یہی ہے کہ حضرت مسلم بن عقیل کی بیعت کرنے والے اٹھارہ ہزار افراد بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ جب انہوں نے اپنی دنیا اور منافع کو خطرے میں دیکھا تو فوراً اپنے آپ کو جناب مسلم سے الگ کر لیا اور انہیں کوفہ کی گلیوں میں یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔ فطری سی بات ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی مختصر سی فوج کے مقابل کربلا میں یہی لوگ نظر آئیں گے۔ کیونکہ ابن زیادہ کی طرف سے لالچ اور دھمکیاں ان کے دنیاوی منافع کے لحاظ سے تھیں اور ان کا امام کی مختصر سی فوج کو دیکھتے ہوئے ابن زیاد کی کامیابی کے بارے اطمینان بھی ان کے اندر ضروری جذبے کو بیدار کر رہا تھا اگرچہ ان کے دل میں امام حسین علیہ السلام کی محبت تو اسہ رسولؐ اور پسر حضرت علیؑ ہونے کے ناطے موجود تھی یہ وہی لوگ تھے جن کے بارے مجمع بن عبداللہ عائزی نے امام حسین علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا

......واما سائر الناس بعد فان افئدتهم تهوی الیک و سیوفهم غداء مشهورة علیک...... (۱)

''لوگوں کی اکثریت کے دل تو آپ کی طرف مائل ہیں لیکن کل ان کی تلواریں آپ کے خلاف نیام سے باہر نکلیں گی''

انہی میں سے بعض افراد عاشورہ کے دن ایک طرف کھڑے ہو کر امام حسین علیہ السلام کو قتل ہوتا دیکھ کر آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہے تھے ''خدایا حسینؑ کی مدد فرما'' (۲)

(۱) تاریخ طبری، ج ۴، ص ۳۰۶

(۲) عبد الرزاق مقرّم، مقتل الحسینؑ، ص ۱۸۹

اس مقدمہ کے بعد اب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ خط لکھنے والے ہر طرح کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا ان میں کسی خاص جذبے کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی. بلکہ ان کے مختلف گروہوں کو دیکھتے ہوئے ذیل کی متعدد وجوہ ذکر کی جاسکتی ہیں:

۱) حبیب ابن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ جیسے خالص و مخلص شیعہ اس لحاظ سے کہ حکومت کو اہل بیت علیہ السلام کا حق اور امویوں کی ظلم و ستم سے پُر حکومت کو ناحق و ناجائز سمجھتے تھے انہوں نے اس لئے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھے تاکہ حکومت غاصبوں سے لے کر اس کے اصلی حقداروں کے حوالے کی جاسکے البتہ ایسے لوگ بہت کم تھے.

۲) کوفہ والوں کی اکثریت خصوصاً وہ ادھیڑ عمر لوگ جنہوں نے کوفہ میں حضرت علی علیہ السلام کی عادلانہ حکومت کو بھی دیکھا تھا اور وہ ان بیس سالوں میں اموی حکومت کے ظلم و جور کو بھی دیکھ چکے تھے، انہوں نے اس ظلم سے رہائی کی خاطر اولاد علی علیہ السلام سے مدد و نصرت مانگی کہ شاید وہ انہیں اموی حکومت کے پنجہ ظلم سے چھٹکارا دلادیں.

۳) بعض نے کوفہ کی مرکزیت کو زندہ کرنے کے لئے کہ جس پر ہمیشہ شام والوں سے ان کا مقابلہ رہا اور ان بیس سالوں میں جسے وہ ہاتھ سے دے بیٹھے تھے. وہ ایک رہبر کی تلاش میں تھے جو اس مقصد کو پورا کر سکے. ان کی نظر میں اس دور میں ایک مؤثر اور مناسب شخصیت جو کوفہ والوں کی رہبریت کی قدرت رکھتی ہو اور اموی حکومت کو بھی ناجائز حکومت سمجھتی ہو صرف امام حسین علیہ السلام کی شخصیت تھی اس وجہ سے انہوں نے امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی.

۴) قبیلوں کے بزرگ جیسے شبث بن ربعی اور حجار بن ابجر جیسے افراد ایک طرف سے تو انہیں صرف اپنی قدرت و ریاست کی فکر تھی اور دوسری طرف سے علوی خاندان سے بھی ان کی دوستی نہیں تھی، جب انہوں نے وسیع سطح پر لوگوں کی توجہ امام حسین علیہ السلام کی طرف دیکھی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ عنقریب کوفہ میں امام حسین علیہ السلام کی حکومت تشکیل پا جائے

گی اور وہ اس قافلے سے پیچھے نہ رہ جائیں بلکہ آپ علیہ السلام کی حکومت کے دوران بھی ان کا اثر و نفوذ باقی رہے لہٰذا وہ بھی خطوط لکھنے والے افراد میں شامل ہو گئے۔

۵) عام لوگ جنہوں نے مقتدر افراد کے جوش و جذبے کو دیکھا تو ان کے دلوں میں بھی خط لکھنے کے جذبات پیدا ہو گئے اور انہوں نے بھی ان شعلوں کو مزید ہوا دی۔

دوسرے سوال کا جواب : ابن زیاد کے کوفہ وارد ہوتے ہی قبائل کے سرکردہ افراد اور اموی طرفداروں نے سکھ کا سانس لیا اور تیزی سے اس کے اطراف جمع ہونا شروع ہو گئے اور اسے کوفہ کے اندرونی حالات سے مکمل آگاہ کرنے لگے، ابن زیاد کو کوفہ میں ورود کے پہلے دن ہی سے کوفیوں کے اندر امام حسین علیہ السلام کی محبوبیت اور قیام کی وسعت کا اندازہ ہو گیا کیونکہ وہ سیاہ عمامہ کے ساتھ چہرے کو چھپا کر کوفہ میں داخل ہوا تھا اور لوگ چونکہ امام حسینؑ کے ورود کے منتظر تھے لہٰذا لوگ اسے امام حسینؑ کے ساتھ اشتباہ کر رہے تھے جس کی وجہ سے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ اس کا استقبال کر رہے تھے۔(۱) اس وجہ سے اسے بھی خطرے کی گہرائی کا احساس ہو گیا، لہٰذا اس نے بصرہ میں اپنے سیاسی و انتظامی تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اپنے بہی خواہوں کی مدد سے اس تحریک و قیام کی سرکوبی کے لئے بڑی تیزی سے مؤثر اقدامات کئے کہ جن میں اہم اقدامات نفسیاتی، اجتماعی اور اقتصادی ذکر کئے جا سکتے ہیں

۱) نفسیاتی اقدامات

ابن زیاد نے یہ سیاست جس کا زیادہ تر دارومدار دھمکی اور لالچ پر تھا اپنے کوفہ میں ورود کے ساتھ ہی شروع کر دی تھی، اس نے مسجد کوفہ میں اپنی پہلی تقریر ہی میں کہا کہ میں فرمانبرداروں کے لئے مہربان باپ کی مانند ہوں گا اور نافرمانوں کے لئے میری تلوار اور کوڑا موجود ہے۔(۲)

---

(۱) وقعۃ الطف، ص۱۰۹

(۲) حوالہ سابق، ص۱۱۰، فانا لمحسنکم و مطیعکم کالوالد البرّ و سوطی و سیفی علی من ترک امری و خالف عهدی ......

ابن زیاد کا لوگوں کو سپاہ شام کے کوفہ آنے کی خبر دینا بھی ایک حربہ تھا جو اس نے اختیار کیا اور اس حربے نے شورش کو دبانے خصوصا اس کے بعد جب لوگوں نے مسلم کے ہمراہ دارالامارہ کا محاصرہ کر رکھا تھا بڑا موثر کردار ادا کیا.(۱)

جب امام حسن علیہ السلام کی معاویہ سے صلح ہوگئی (کوفیوں کا افواج شام سے آخری بار آمنا سامنا ہوا) اس وقت سے کوفیوں کے ذہنوں میں شامی منظم افواج کا رعب اور ہیبت بیٹھ چکی تھی اور وہ اپنے آپ کو ان کے ساتھ مقابلہ کے بالکل قابل نہیں سمجھتے تھے، ابن زیاد کا یہ پروپیگنڈا عورتوں میں بھی سرایت کر گیا جس کی وجہ سے عورتیں آکر مسلم کے ساتھ شریک اپنے بھائی، بیٹوں یا شوہر کو لے جاتیں.(۲) اسی پروپیگنڈا کی وجہ سے دن کے وقت مسلم نے چار ہزار افراد کے ساتھ دارالامارہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور عبید اللہ کا تختہ الٹنے والا تھا لیکن شام کے وقت مسلم کوفہ کی گلیوں میں یکہ و تنہا تھے.(۳)

۲) اجتماعی چالیں

چونکہ ابھی تک قبائلی نظام قائم تھا، لہٰذا قبیلوں کے سردار اجتماعی اور سیاسی معاملات میں بہت اہم اور موثر قوت شمار ہوتے تھے، جیسا کہ بیان ہو چکا کہ ان میں سے ایک بڑی تعداد جیسے شبث بن ربعی، عمرو بن حجاج اور حجار بن ابجر امام حسین علیہ السلام کو خط لکھنے والوں میں شامل تھے اور طبعی سی بات ہے کہ جب مسلم کوفہ تشریف لائے تو یہ ان کا ساتھ دینے والوں میں بھی شامل تھے. لیکن یہ لوگ زیادہ تر اپنے مفاد اور مقام کی حفاظت کے پیچھے تھے لہٰذا جب عبید اللہ بن زیاد کوفہ آگیا اور انہیں اس کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا تو یہ مسلم بن عقیل کا ساتھ چھوڑ کر ابن زیاد کے لشکر میں شامل ہو گئے چونکہ یہی ان کی دنیاوی منفعت کا تقاضا تھا. ابن زیاد خوب سمجھتا تھا کہ انہیں کیسے اپنے ارد گرد جمع کیا جا سکتا ہے. اس نے

---

(۱) حوالہ سابق، ص۱۲۵

(۲) وقعۃ الطف، ص۱۲۵

(۳) حوالہ سابق، ص۱۲۶

دھمکیوں اور رشوت و لالچ کی چالیں چلتے ہوئے قبائل کے سرداروں اور سرکردہ افراد کو اپنے ساتھ ملالیا، جیسا کہ مجمع بن عبداللہ عائزی جو کہ کوفہ کے حالات سے مکمل واقف تھا اور وہ ابھی ابھی کوفہ سے آیا تھا جب اس سے امامؑ نے کوفہ کے حالات پوچھے تو اس نے جواب میں کہا:

واما اشراف الناس فقد اعظمت رشوتهم و ملئت غرائرهم يستمال ودهم و يستخلفي به نصيحتهم فهم الب واحد عليك ...... (۱)

''کوفہ کے سرکردہ افراد کو خوب رشوت دی گئی ہے ان کے مخازن (گندم و جو سے) بھر دیئے گئے ہیں، ان کی محبت حاصل کر لی گئی ہے اور ان کی خیر خواہی جذب کر لی گئی ہے. اب وہ سب آپ کے خلاف متحد ہو چکے ہیں'' دوسری اجتماعی مؤثر قوت جس سے ابن زیاد نے خوب فائدہ اٹھایا، ''عرفا'' تھے، عرفا، عریف کی جمع ہے، اور عریف اس شخص کو کہا جاتا تھا کہ جن کے ذمے کچھ افراد کی ذمہ داری ہوتی تھی. کہ جن کا بیت المال سے سال کا ایک لاکھ درھم خرچہ ملتا تھا. (۲) چونکہ وصول کی جانے والے رقم افراد کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی لہٰذا ان کے ماتحت افراد کی تعداد بھی بیس سے لے کر سو تک ہو سکتی تھی. (۳)

جب قبائل نے کوفہ میں شہری زندگی شروع کی تو یہ کام ایک حکومتی منصب قرار پایا لہٰذا جیسے یہ کوفہ کے میسر و والی کے سامنے جوابدہ تھے. (۴) اسی طرح ان کا تعین کرنا اور معزول کرنا بھی اسی کے اختیارات میں سے تھا نہ کہ قبیلہ کے سردار کے پاس، یہ منصب لوگوں اور حکومتوں کے درمیان رابطہ کا کام کرتا تھا اور چونکہ سردار قبیلہ کی نسبت ان کے ماتحت افراد کی تعداد اخاصی کم ہوتی تھی لہٰذا یہ بڑی آسانی کے ساتھ ان پر کنٹرول رکھ سکتے تھے.

---

(۱) وقعة الطف، ص۱۷۴

(۲-۳) تاریخ طبری، ج۳، ص۱۵۲

(۴) الحیاة الاجتماعیة والاقتصادیة فی الکوفة، ص۳۹

''عریف'' کا اصلی کام یہ تھا کہ رجسٹر بنا کر اس میں اپنے ماتحت افراد کے نام اوران کے پورے کنبے کے ناموں کا اندراج کرے۔ نئے متولد ہونے والے بچے کا نام فوری طور پر اس رجسٹر میں لکھ لیا جاتا اور وفات پا جانے والے اشخاص کا نام فوراً اس رجسٹر سے کاٹ دیا جاتا۔ لہٰذا انہیں اپنے ماتحت افراد کے بارے میں مکمل معلومات رہتی تھیں اور بحرانی حالات میں عرفاء کی ذمہ داری دوگنا بڑھ جاتی تھی کیونکہ اپنے ماتحت افراد میں نظم کی برقراری کہ جسے عرافت کہا جاتا تھا۔ انہی کی ذمہ داری ہوتی تھی اور واضح سی بات ہے جہاں حکومت ان سے درخواست کرتی تو شورش اور فسادی افراد کے بارے میں حکومت کو یہی لوگ اطلاعات بھی فراہم کرتے تھے۔(۱)

ابن زیاد نے کوفہ وارد ہوتے ہی بڑی زیرکی کے ساتھ اس اجتماعی قوت سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی تھی اور زیادہ احتمال یہی ہے کہ یہ چیز اس نے اپنے باپ زیاد سے اس کی کوفہ پر امارت کے دور میں سیکھی تھی۔ ابن زیاد مسجد کوفہ میں اپنی پہلی تقریر کرنے کے بعد قصر امارت میں آیا اور سب عرفاء کو بلا کر انہیں یوں کہا:

اکتبوا الی الغرباء ومن فیکم من طلبة امیر المومنین ومن فیکم من الحروریة واهل الریب الذین رأبهم الخلاف والشقاق، فمن کتبهم لنا فبری ومن لم یکتب لنا احدا فیضمن لنا ما فی عرافته الا یخالفنا منهم مخالف ولا یبغی علینا منهم باغ فمن لم یفعل برئت منه الذمة وحلال لنا ماله وسفک دمه وایما عریف وجدنی عرافته من بغیة امیر المومنین احدلم یدفعه الینا صلب علی باب داره والقیت تلک العرافة من

(۱) الحیاة الاجتماعیة والاقتصادیة فی الکوفة، ص۳۹

العطا.(۱)

''تم سب کی ڈیوٹی ہے کہ اس شہر میں مسافروں اور یزید کے مخالفوں کے نام (جو تمہاری عرافت میں آتے ہیں) مجھے لکھ دو، اسی طرح حروریہ (خوارج) اور مشکوک افراد جو اختلاف و تفرقہ ڈالتے ہیں کے بارے میں مجھے رپورٹ دو، جو اس حکم پر عمل کرے وہ بری ہے لیکن جس نے یہ سب نہ لکھا تو اسے اپنی عرافت کی ضمانت اٹھانا ہوگی، اس کی عرافت میں اگر کسی مخالف یا باغی نے ہمارے خلاف کوئی کام کیا تو وہ ہماری پناہ سے خارج ہے اور اس کا مال وخون ہم پر مباح ہے، جس عریف کی عرافت میں یزید کے خلاف کوئی شورش گر پایا گیا تو اس عریف کو اس کے گھر کے دروازے پر پھانسی پر لٹکایا جائے گا اور اس کی ساری عرافت کو عطاء سے محروم کردیا جائے گا''

جہاں تک ہمیں نظر آتا ہے ابن زیاد کا اسی اجتماعی چال سے استفادہ وہ اہم عامل تھا جو کوفہ میں مسلم بن عقیل کی تحریک کو سرکوب کرنے کا باعث بنا، کیونکہ عرفاء ابن زیاد کی دھمکیوں سے ڈر گئے جس کی وجہ سے انہوں نے بڑی تیزی سے اس کے احکام پر عمل کیا اور اپنی عرافت کی حدود میں حالات کو سختی کے ساتھ کنٹرول کیا۔

۳) اقتصادی چالیں

اس دور میں لوگوں کا اہم اقتصادی و مالی ذریعہ حکومت سے عطاء کا دریافت کرنا تھا، فتوحات کے دور میں لوگوں کو یہ عطا اس شرط پر دی جاتی کہ وہ اس کے بدلے ایرانیوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لیں گے۔ بعد میں جب جنگوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور لوگ شہر نشین

(۲) وقعۃ الطف، ص۱۱۱، تاریخ طبری، ج۴، ص۲۶۷

ہو گئے تب بھی یہ عطاء جاری رہی، یہی وجہ ہے کہ عرب کھیتی باڑی، صنعت گری اور تجارت وغیرہ جیسے کاموں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے اور زیادہ تر موالی (وہ غیر عرب جنہوں نے عربوں کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے) یہ کام انجام دیتے تھے نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ عرب صنعت و حرفت کے کاموں کو اپنے شایان شان ہی نہیں سمجھتے تھے. (۱)

''عطاء'' وہ نقدی تھی جو حکومت کی طرف سے لوگوں کو یکمشت یا قسطوں کی صورت میں ادا کی جاتی تھی، نیز اجناس کی وہ مقدار (جیسے کھجوریں، گندم و جو وغیرہ) جو حکومت کی طرف سے ہر ماہ لوگوں کو دی جاتی تھی وہ بھی عطاء کہلاتی تھی.

اب یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس اقتصادی نظام کی وجہ سے لوگ (عرب) حکومت کے ساتھ انتہائی وابستہ ہوتے تھے اور استبدادی حکومت لوگوں کی اس کمزوری سے مکمل آگاہ تھی لہٰذا اس سے وہ خوب فائدہ اٹھاتی تھی.

ابن زیاد نے عرفاء کو دھمکاتے وقت اس حربے کو استعمال کیا اور کہا کہ اگر کسی کی عرافت میں ہمارا مخالف پایا گیا تو اس کے سنگین نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی عرافت کے تمام افراد کی عطاء روک لی جائے گی، اس دھمکی کی وجہ سے نہ صرف عریف مخالفت روکنے کی کوشش کرتا بلکہ اس کی عرافت والے دوسرے افراد کی بھی اپنے مالی نقصان سے بچنے کے لئے یہی کوشش ہوتی کہ ان کی عرافت کے اندر کوئی شخص حکومت کی مخالفت نہ کرنے پائے .

اسی طرح جب جناب مسلم اور ان کے ساتھیوں نے دارالامارۃ کا محاصرہ کیا تو ابن زیاد کی سب سے بڑی چال لوگوں کو مسلم کی اطراف سے دور کرنے کے لئے یہی تھی کہ اگر ساتھ چھوڑ جائیں تو ان کی عطاء بڑھا دی جائے گی اور اگر مسلم کا ساتھ نہ چھوڑیں تو ان کی عطاء روک لی جائے گی.(۲)

---

(۱) الحیاۃ الاجتماعیۃ والاقتصادیۃ فی الکوفۃ، ص۲۱۹

(۲) وقعۃ الطف، ص۱۲۵، تاریخ طبری، ج۴، ص۲۷۷

ابن زیاد نے اس اقتصادی حربے سے فائدہ اٹھایا اور عطاء کے بڑھانے کا وعدہ دے کر اہل کوفہ سے ایک عظیم لشکر (جو کہ تیس ہزار تک ذکر ہوا ہے)(۱) امام حسینؑ کے مقابلے میں جنگ میں اتارا، اس لشکر کے اکثر افراد وہ تھے جن کے دل امام کے ساتھ تھے.(۲)

امام حسینؑ کے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ یہ حربہ کس حد تک لوگوں پر کارگر ہے، لہٰذا آپ نے عاشورہ کے دن اپنی ایک تقریر کے دوران اسی حربے کو اہل کوفہ کی نافرمانی کی ایک بڑی وجہ قرار دیا۔ آپ فرماتے ہیں:

کلکم عاص لامری مستمع لقولی ، قد انخزلت عطیاتکم من الحرام وملئت بطونکم من الحرام فطبع علی قلوبکم .(۳)

''تم سب میری نافرمانی کرنے والے ہو اور میری بات سننے والے نہیں، کیونکہ تمہاری عطاء مال حرام سے فراہم ہوئی ہے اور تمہارے شکم حرام سے بھرے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے تمہارے دلوں پر مہر لگ چکی ہے۔''

کربلا میں پیاس

سوال ۸ : کربلا میں پیاس کی کیا کیفیت تھی؟

جواب : معتبر تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے تین دن پہلے یعنی ساتویں محرم کو ابن زیاد کی طرف سے عمر بن سعد کو یہ حکم ملا، ''حسین اور پانی

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۵، ص۴

(۲) حیاۃ الامام الحسین، ج۲، ص۴۵۳

(۳) بحار الانوار، ج۴۵، ص۸

کے درمیان حائل ہو جاؤ اور ایک قطرہ پانی بھی ان تک نہ پہنچنے دو" اور اس نے اس عمل کو عثمان پر پانی کی بندش کا انتقام قرار دیا۔(۱) ابن سعد نے یہ حکم ملتے ہی عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچ سو سواروں کے ساتھ نہر فرات پر معین کر دیا تا کہ امام حسینؑ اور آپ کے ساتھی پانی نہ لے سکیں۔(۲) اس گرم صحرا میں پیاس کو برداشت کرنا وہ بھی عورتوں اور بچوں کے لئے بڑا مشکل تھا، اس دوران پانی کے حصول کی مختلف کوششوں کا تذکرہ ملتا ہے، بعض کتب مقاتل میں ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے لشکر کی حدود کے اندر پانی پر دسترسی کے لئے کئی کنویں کھودے لیکن اس کی خبر جب ابن زیاد کو ملی تو اس نے ابن سعد کو مزید سختی کرنے اور کنویں کھودنے پر پابندی لگانے کا حکم بھیجا۔(۳)

اسی طرح ہلال بن نافع کی قیادت میں رہنے والے ۳۰ سواروں اور ۲۰ پیادہ مجاہدوں کے ہمراہ حضرت عباس علیہ السلام نے رات کے وقت دریائے فرات پر جو حملہ کیا تھا اس کا بھی معتبر منابع میں ذکر کیا گیا ہے، یہ مجاہدین عمرو بن حجاج کے دستے کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد پانی کی ۲۰ مشکیں بھرنے میں کامیاب ہو گئے۔(۴) اگر چہ اس روایت میں صحیح وقت کا ذکر نہیں کیا گیا تاہم اس میں یہ عبارت موجود ہے کہ **ولما اشتد علی الحسین و اصحابه العطش** "یعنی جب امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے اصحاب پر پیاس کا شدید غلبہ تھا"

بعض روایات میں منقول ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے روز عاشورہ اپنی

---

(۱) بلاذری، انساب الاشراف، ج ۳، ص ۱۸۰

(۲) حوالہ سابق

(۳) الفتوح، ج ۵، ص ۹۱، فقد بلغنی ان الحسین یشرب الماء هو و اولاده وقد حفروا الآبار و نصبوا الاعلام فانظر اذا ورد علیک کتابی هذا فامنعهم من حفر الآبار ما استطعت و ضیق علیهم ولا تدعهم یشربوا من ماء الفرات قطرة واحدة

(۴) وقعة الطف، ص ۱۵۲

بہن زینب سلام اللہ علیہا کے چہرے پر پانی پھینکا اس لئے کہ جب انہوں نے امام مظلومؑ کی زبانی وہ اشعار سنے جن میں امامؑ کی شہادت کے نزدیک آن پہنچنے کا ذکر تھا تو وہ بے ہوش ہوگئی تھیں.(۱)

یہ روایت اجمالی طور پر شب عاشورہ پانی کے موجود ہونے پر دلالت کرتی ہے، علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں پانی کی عدم قلت کے معاملے کو صبح عاشورہ تک، یہاں تک کہ پینے کے سلسلے میں بھی صراحت کے ساتھ بیشتر مقامات پر ذکر کیا ہے، اس روایت میں منقول ہے کہ:

ثم قال لاصحابه : قوموا فاشربوا من الماء يكن آخر زادكم و توضؤوا واغتسلوا و اغسلوا ثيابكم لتكون اكفانكم ثم صلىٰ بهم الفجر.(۲)

''پھر امامؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: اٹھو، پانی پیو، شاید تمہارے لئے یہ دنیا میں پینے کی آخری چیز ہو اور وضو کرو، نہاؤ اور اپنے لباس کو دھولو تاکہ وہ تمہارے کفن بن سکیں، اس کے بعد امامؑ نے ان (اصحاب) کے ہمراہ نمازِ فجر باجماعت پڑھی''

مذکورہ بالا روایت میں ''یکن آخر زادکم'' کی عبارت سے نیز روزِ عاشورہ سے متعلق دیگر روایات سے پتا چلتا ہے کہ پانی کے اس ذخیرے کے ختم ہوجانے کے بعد پھر پانی تک دسترس میسر نہ ہوئی اور امام عالی مقام علیہ السلام آپؑ کے اصحاب اور اہل حرم اپنی اپنی شہادت تک صحرائے کربلا کی طاقت فرسا (ناقابل برداشت) گرمی میں دشمنوں کے ساتھ جنگ کی شدت اور ناقابل بیان پیاس کو برداشت کرتے رہے. اس کے علاوہ بعض اصحاب کا نہر فرات پر جا کر پانی لانے کی کوشش کا پتہ بھی چلتا ہے.

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۴۴، وقعة الطف، ص ۲۰۱، لھوف، ص ۱۰۴

(۲) بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۱۷

علامہ مجلسیؒ نے عمر بن سعد کے لشکر کے ایک فرد تمیم بن حصین خزاری کا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے:

"اے حسین اور حسین کے ساتھیو! کیا تم نہر فرات کے پانی کو نہیں دیکھ رہے کیسے وہ سانپ کے پیٹ کی طرح چمک رہا ہے خدا کی قسم تم اس سے ایک قطرہ بھی نہیں پی سکو گے یہاں تک کہ موت کا مزا چکھ لو" (۱)

جناب حر نے بھی روز عاشورہ کوفیوں کو نصیحت کرتے ہوئے امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی کی بندش کے حوالے سے انہیں سخت ملامت کی. (۲)

بعض کتب مقاتل میں یہ بھی ملتا ہے کہ امام حسینؑ نے بھی پانی کے لئے کوشش کی اور شمر نے حضرت کو پانی سے روکا اور طنزآمیز گفتگو کی، جس کے جواب میں امام پاکؑ نے اس پر نفرین کی. (۳) اور علامہ مجلسیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عباس نے جب جنگ کی اجازت مانگی تو امامؑ نے فرمایا ان پیاسے بچوں کے لئے پانی کی کوشش کرو، لیکن حضرت عباس اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور شہید ہو گئے. (۴)

پانی مانگنا

سوال ۹ : کیا امام حسین علیہ السلام نے دشمن سے پانی مانگا تھا؟

جواب : عاشورہ کے دن دوپہر تک امام حسینؑ، ان کے اصحاب اور کنبے کے دوسرے افراد پر پیاس کا شدید غلبہ ہو چکا تھا لیکن کسی بھی معتبر کتاب میں کوئی ثبوت ایسا نہیں ملتا جس میں امام پاکؑ نے دشمن سے پانی کی درخواست کی ہو، اصولی طور پر پیاس کی بات جس

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۱۷

(۲) انساب الاشراف، ج ۳، ص ۱۸۹، الارشاد، ص ۴۵۳

(۳) ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبین، ص ۸۶، بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۵۱

(۴) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۴۱، ۴۲

طرح متاخرین کی کتب اور ذاکرین کی زبان زد ہو چکی ہے. معتبر مقاتل میں اس طرح اسے مرکزیت حاصل نہیں ہے اور یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ امام پاکؑ اور آپ کے ساتھیوں کی طرف سے جو رجز پڑھے گئے ان میں کہیں بھی پیاس اور اس کی شدت کا ذکر نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس ان رجزیہ اشعار اور امام پاکؑ کے خطبات میں جو آپ نے عاشورہ کے دن ارشاد فرمائے ان سب میں تو عزت، سربلندی اور بہادری کی باتیں نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر سید الشہداء کی صرف ایک عبارت کو ذکر کرتے ہیں جو آپ نے عاشورہ کے دن اثناء جنگ ارشاد فرمائی:

الا وان الدعی بن الدعی رکزنی بین اثنتین بین السلة والذلة وھیھات منا الذلة یابی اللہ ذالک لنا ورسولہ والمومنون وحجور طابت وطھرت وانوف حمیة ونفوس ابیة من ان نوثر طاعة اللئام علی مصارع الکرام .(۱)

"جان لو! زنا زادے کا زنا زادہ بیٹا مجھے دو چیزوں کے درمیان اختیار دیتا ہے یا تلوار نیام سے نکال لوں یا ذلت کا لباس پہن لوں اور یزید کی بیعت کر لوں، لیکن ذلت ہم سے بہت دور ہے، خدا، اس کا رسول، مومنین، پاک آغوش کے پروردہ افراد اور باغیرت وحمیت لوگ ہمارے لئے قطعاً اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ پست فطرت افراد کی اطاعت کو باعزت موت کے اوپر ترجیح دیں"

آج کل بعض مجالس میں سید الشہداء کی تحریک میں عزت و سربلندی اور سرفرازی کا

---

(۱) الھوف، ص۱۲۳،۱۲۲

رنگ کم کر دیا گیا ہے اس کی جگہ پر امام پاکؑ پر رقت ورحم دلی کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے. یہی وجہ ہے کہ اسی مقصد کو پانے کے لئے بعض لوگ کربلا کے واقعات میں غیر واقعی اور جھوٹے قصے سناتے ہیں اور بعض دفعہ تو امام علیہ السلام کو بالکل ایک کمزور اور لاچار شخص کے طور پر پیش کرتے ہیں.

مثال کے طور پر انہی جھوٹی روایات میں سے ایک یہ روایت بھی ہے کہ امام پاکؑ عمر بن سعد کے پاس تشریف لائے اور اس سے تین درخواستیں کیں، دوسری درخواست یہ تھی:

اسقونی شربة من الماء فقد نشفت کبدی من الظلما .(۱)

''مجھے ایک گھونٹ پانی دے دو میرا جگر پیاس سے جل رہا ہے، لیکن ابن سعد نے امام کی یہ درخواست بے شرمی سے رد کر دی''

ہاں اگر چہ یہ عبارتیں (حتیٰ کہ پتھر کے دل سے بھی) آنسو نکالنے کے لئے مؤثر ہیں لیکن دوسری طرف سے امام حسینؑ اور عاشورہ کے عزت وسرفرازی والے چہرے پر خدشہ وارد کرتی ہیں اور پڑھے لکھے شیعہ کو اپنی تحلیلوں میں بڑے بنیادی سوالات سے روبرو کر دیتی ہیں، یہ چیز دشمن کے ہاتھ حربہ دیتی ہے جس سے وہ تشیع کے عزت مدار رویے پر کاری ضرب لگاتے ہیں (۲)

---

(۱) طریحی المنتخب، ص۴۳۹

(۲) تحریک امام حسینؑ میں عزت وسرفرازی اور ان جیسی جھوٹی روایات کا اس کے مشکل ایجاد کرنے کے حوالے سے اور ان روایات کی سندی وفنی حیثیت کے لئے دیکھیں مقالہ: عزت طلبی در نهضت امام حسینؑ از نعمت اللہ فروشانی مندرج در مجلہ حکومت اسلامی شمارہ ۲۶ ص ۷۹-۱۱۶

امام حسین علیہ السلام کے سر کا مدفن

سوال ۱۰: امام حسینؑ کا راس مبارک کہاں دفن ہوا؟

جواب: سر امام حسینؑ اور کربلاء کے شہداء کے سروں کے مدفن کے بارے شیعہ اور سنی کتب میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے اور جو اقوال اس بارے میں نقل ہوئے ہیں ان کے حوالے سے تحقیق کی ضرورت ہے. لیکن سب سے مشہور قول جو شیعہ میں سب نے قبول کیا ہے یہ ہے امام پاک علیہ السلام کا سر مبارک کچھ مدت کے بعد آپ کے بدن مبارک کے ساتھ ملحق ہو گیا اور کربلا میں لا کر دفن کیا گیا ہے. ہم مزید معلومات کے لئے ان اقوال کو یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱) کربلا

یہ نظریہ علمائے شیعہ میں مشہور ہے اور علامہ مجلسیؒ نے اس کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے.(۱) شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے سر مبارک کے آپ کے بدن کے ملحق ہونے کے بارے میں فاطمہ بنت علی علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے.(۲) اب اس کی کیفیت کیا تھی کہ کیسے آپ کا سر مبارک آپ کے بدن سے ملحق ہوا، اس بارے میں مختلف نظریات ذکر کیے گئے ہیں. بعض جیسے سید ابن طاؤس اسے امر الٰہی شمار کرتے ہیں کہ خداوند نے خود اپنی قدرت کاملہ سے اعجاز کے طور پر یہ کام انجام دیا اور سید نے اس بارے میں چون و چرا سے بھی منع فرمایا ہے.(۳)

بعض دوسرے قائل ہیں کہ امام سجاد علیہ السلام جب شام سے واپس تشریف لائے(۴) تو وہ سر امامؑ کو اپنے ساتھ لائے اور کربلا میں اپنے بابا کے بدن کے ساتھ دفن کیا.(۵)

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۵ ص ۱۴۵

(۲) حوالہ سابق، ج ۴۵ ص ۱۴۰، منقول از، امالی، صدوق، ص ۲۳۱

(۳) سید ابن طاؤس، اقبال الاعمال، ص ۵۸۸

(۴) شہید قاضی طباطبائی، تحقیقی دربارۂ اولین اربعین سید الشہداء، ج ۳، ص ۳۰۴

(۵) لہوف، ص ۲۳۲، البتہ اس میں امام سجادؑ کے نام تصریح نہیں ہوئی.

اب یہ سوال کہ کیا سر بدن کے ساتھ ملحق ہو گیا یا امام کی ضریح میں یا اس کے نزدیک دفن کیا گیا. اس بارے میں کوئی واضح عبارت تو نہیں ملتی یہاں بھی سید ابن طاؤس نے چون وچرا سے نہی فرمائی ہے.(۱)

بعض قائل ہیں کہ سر مبارک کو تین دن دروازہ دمشق پر آویزاں رکھنے کے بعد اتار کر حکومتی خزانے میں رکھ دیا گیا اور سلیمان عبد الملک کے دور تک یہ سر وہیں تھا اس نے سر مبارک کو وہاں سے نکالا اور کفن دے کر دمشق میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا، اس کے بعد اس کے جانشین عمر بن عبد العزیز (۹۹ تا ۱۰۱ ہجری حکومت) نے سر کو قبر سے نکالا، لیکن پھر اس نے کیا کیا یہ معلوم نہیں ہو سکا، لیکن اس کی ظاہری شریعت کی پابندی کو دیکھتے ہوئے زیادہ احتمال یہی ہے کہ اس نے سر کو کربلا بھیجا ہوگا.(۲)

۲) حضرت علی علیہ السلام کی قبر کے پاس نجف میں

علامہ مجلسیؒ کی عبارت اور روایات میں تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ سر مقدس سید الشہداء، نجف اشرف میں حضرت علی علیہ السلام کی قبر کے پاس دفن ہوا.(۳)

روایات میں آیا ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل کے ہمراہ نجف میں حضرت امیر المومنینؑ پر درود وسلام بھیجنے کے بعد امام حسینؑ پر سلام بھیجا. اس روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے دور تک سر مقدس نجف اشرف میں مدفون تھا.(۴)

بعض دوسری روایات بھی اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں بلکہ بعض شیعہ کتابوں میں تو حضرت علیؑ کی قبر مطہر کے پاس سر امام حسینؑ کی زیارت بھی نقل ہوئی ہے.(۵)

---

(۱) اقبال الاعمال، ص ۵۸۸

(۲) محمد امین، امینی، مع الرکب الحسینی، ج ۶، ص ۳۲۴، منقول مقتل الخوارزمی، ج ۲، ص ۷۵

(۳) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۴۵

(۴) حوالہ سابق، ج ۴۵، ص ۱۷۸، منقول از کامل الزیارات، ص ۳۴، اصول کافی ج ۴، ص ۵۷۱

(۵) بحار، ج ۴۵، ص ۱۷۸، مع الرکب الحسینی، ج ۶، ص ۳۲۵، ۳۲۸

سرِ مقدس کو نجف منتقل کرنے کے حوالے سے امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ اہل بیتؑ کے چاہنے والوں میں سے ایک شخص نے شام سے کسی نہ کسی طریقے سے یہ سر حاصل کیا اور حضرت علیؑ کی قبر میں لا کر دفن کر دیا۔ (۱) لیکن اس نظریئے پر اشکال یہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے دور تک تو حضرت علیؑ کی قبر مبارک عام لوگوں سے مخفی تھی اور انہیں اس کا پتہ نہیں تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ دمشق میں سر مقدس کے ایک مدت تک رکھے جانے کے بعد اسے کوفہ ابن زیاد کے پاس بھیج دیا گیا اور اس نے لوگوں کی شورش کے خوف سے حکم دیا کہ سر کو کوفہ سے باہر لے جا کر حضرت علیؑ کی قبر کے پاس دفن کر دیا جائے۔ (۲) اس پر بھی وہی اشکال ہے کہ اس وقت تک لوگوں سے حضرت علیؑ کی قبر مخفی تھی۔

۳) کوفہ

سبط ابن جوزی نے یہ نظریہ ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عمرو بن حریث مخزومی نے سر کو ابن زیاد سے لیا اور پھر اسے غسل و کفن دیا اور خوشبو لگانے کے بعد اپنے گھر میں دفن کر دیا۔ (۳)

۴) مدینہ

ابن سعد (طبقات کے مصنف) نے یہ نظریہ قبول کیا ہے کہ یزید نے سر حاکم مدینہ عمرو بن سعید کو بھیجا اور اس نے اسے کفن دینے بعد جنت البقیع میں امامؑ کی والدہ ماجدہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی قبر کے پاس دفن کر دیا۔ (۴)

بعض دوسرے اہل سنت علماء جیسے خوارزمی نے مقتل الحسینؑ میں اور ابن عماد حنبلی نے شذرات الذھب میں بھی یہی نظریہ قبول کیا ہے۔ (۵) اس نظریئے پر اہم اشکال یہ ہے

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۴۵

(۲) حوالہ سابق، ص ۱۷۸

(۳) تذکرہ الخواص، ص ۲۵۹، منقول از مع الرکب الحسینی، ص ۳۲۹

(۴) ابن سعد، طبقات، ج ۵، ص ۱۱۲

(۵) مع الرکب الحسین، ج ۶، ص ۳۳۰، ۳۳۱

کہ حضرت فاطمہ زہراءؑ کی قبر تو معلوم نہیں تھی تو پھر اس کے ساتھ دفن کرنا کیسے ثابت ہو.

۵) شام

کہا جا سکتا ہے کہ اکثر اہل سنت کا یہی نظریہ ہے کہ سر مقدس شام میں مدفون ہے اور پھر اس نظریے کے قائلین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس بارے پانچ نظریات ذکر کیے گئے ہیں:

الف:۔ دروازہ فرادیس کے پاس دفن ہوا بعد میں وہاں مسجد الرائس تعمیر کی گئی،

ب :۔ جامع اموی کے پاس ایک باغ میں دفن ہے،

ج :۔ دار الامارہ میں دفن ہے،

د :۔ دمشق میں ایک قبرستان میں دفن ہے،

ھ :۔ باب توما کے نزدیک دفن ہے،(۱)

۶) رِقّہ

نہر فرات کے کنارے ایک شہر ہے، جس کا نام رقّہ ہے، اس دور میں آل عثمان میں سے آل ابی محیط کے نام سے مشہور ایک قبیلہ وہاں آباد تھا، یزید نے سر مقدس ان کے پاس بھیجا اور انہوں نے اسے اپنے گھر کے اندر دفن کر دیا، بعد میں وہ گھر مسجد میں تبدیل کر دیا گیا.(۲)

۷) مصر (قاہرہ)

نقل ہوا ہے کہ فاطمی حکمران جن کی حکومت مصر پر چوتھی صدی ہجری کے دوسرے نصف سے شروع ہوئی اور ساتویں صدی ہجری کے دوسرے نصف تک باقی رہی، یہ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے سر امام حسین علیہ السلام کو شام کے باب الفرادیس سے عسقلان منتقل کیا اور پھر عسقلان سے قاہرہ منتقل کیا اور وہاں دفن کر کے ۵۰۰

---

(۱) مع الرکب الحسینی، ج۶، ص۳۳۱-۳۳۵

(۲) حوالہ سابق ص۳۳۲، منقول از تذکرۃ الخواص، ص۲۶۵

سال بعد اس پر تاج الحسینؑ کے نام سے مقبرہ تعمیر کیا(۱)

تبریزی نے عسقلان سے قاہرہ کی طرف سر مقدس کے انتقال کی تاریخ ۵۴۸ ہجری لکھی ہے اور کہا ہے کہ جب سر مقدس عسقلان سے نکالا گیا تو دیکھا گیا کہ خون ابھی تک تازہ ہے اور خشک نہیں ہوا اور مشک وعنبر کی خوشبو سر سے پھوٹ رہی تھی.(۲)

علامہ سید محسن امین عسقلان سے مصر سر کے انتقال کا قول ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں، سر مقدس کے دفن کی جگہ پر بہت بڑی بارگاہ بنائی گئی ہے اور اس کے پاس ایک بہت بڑی مسجد بھی بنائی گئی ہے. میں نے ۱۳۲۱ ہجری میں وہاں زیارت کی اور وہاں میں نے زائرین کی بڑی تعداد زیارت وگریہ کرتے ہوئے دیکھی، پھر آپ فرماتے ہیں کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ سر عسقلان سے مصر منتقل ہوا ہے، لیکن آیا وہ امام حسین علیہ السلام کا سر تھا یا کسی اور کا اس بارے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا.(۳)

علامہ مجلسیؒ نے بھی بعض مصریوں سے نقل کیا ہے، مصر میں مشہد الکریم کے نام سے بہت بڑی بارگاہ موجود ہے. (۴)

امام حسین علیہ السلام کے اصحاب

سوال ۱۱: آیا شب عاشورہ اصحاب امامؑ میں سے کسی نے حضرت کا ساتھ چھوڑا تھا اور یہ کہ عاشورہ کے دن امام کے اصحاب و انصار کی تعداد کتنی تھی؟

جواب : اس سوال کے دو حصے ہیں لہٰذا دونوں کے الگ الگ جواب دیتے ہیں:

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ، ج۸ص۲۰۵

(۲) مع الرکب الحسینی، ج۶، ص۲۳۷

(۳) سید محسن امین، عاملی، لواعج الاشجان فی مقتل الحسینؑ، ص۲۵۰

(۴) وقعۃ الطف ص۱۹۷، طبقات ابن سعد، ج۵، ص۹۹، تاریخ طبری، ج۵، ص۴۱۸، شیخ مفید، الارشاد، ص۲۴۲

پہلا حصہ : اصحاب امام کی وفاداری

تاریخی منابع میں جہاں شب عاشورہ کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں وہاں اس نکتہ کو بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب امام پاکؑ نے اپنے اصحاب اور رشتہ داروں سے فرمایا کہ دشمن صرف مجھے قتل کرنا چاہتا ہے لہٰذا اگر آپ لوگ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں. تو انہوں نے جواب میں بالاتفاق بڑے دلیرانہ اور جذبات سے بھرپور انداز میں امامؑ کے قدموں میں شہادت کی ترجیح کو ذکر کیا اور کوئی ایک شخص بھی امام علیہ السلام کو چھوڑ کر جانے پر رضامند نہ ہوا۔ اسی جانثاری کو دیکھ کر امام پاک علیہ السلام نے وہ معروف جملہ فرمایا تھا:

......فانی لااعلم اصحابا اولیٰ ولا خیرا من اصحابی ولااھل بیت ابر ولا اوصل من اھل بیتی .(۱)

''میں اپنے ساتھیوں سے بڑھ کر اور بہتر کوئی ساتھی نہیں پاتا اور اپنے خاندان سے بہتر اور زیادہ صلہ رحم کرنے والا کوئی خاندان نہیں پاتا''

بعض کتب تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ جب منزل زبالہ پر امامؑ کے قاصد عبداللہ بن یقطر کی شہادت کی خبر لوگوں کو ملی تو بہت سے لوگ آپ کے اطراف سے تتر بتر ہو گئے اور جب مایوس کن خبریں آئیں تو امام پاکؑ نے جناب مسلم اور ھانی بن عروہ کی شہادت کی خبر دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

قد خذلتنا شیعتنا فمن احب منکم الانصراف فلینصرف لیس علیه منا ذمام .(۲)

''ہمیں ہمارے ساتھی چھوڑ گئے پس تم میں سے جو بھی جانا چاہے وہ چلا جائے ہم نے اپنی بیعت اس کی گردن سے اٹھالی ہے''

---

(۱) بحار، ج ۴۵، ص۱۴۲

(۲) وقعة الطف، ص۱۶۶

آپ کی یہ بات سنتے ہی لوگ گروہ درگروہ آپ کو چھوڑنے لگے آخر تھوڑی تعداد میں لوگ بچ گئے جن میں اکثر وہی تھے جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آرہے تھے. جن لوگوں نے راستے میں امامؑ کا ساتھ چھوڑا یہ وہ اعرابی تھے جو اس خیال سے امام کے ساتھ چل پڑے تھے کہ امامؑ ایک پرسکون اور مطیع شہر کی طرف جارہے ہیں جہاں جاکر آپ کی حکومت برقرار ہوجائے گی اور انہیں بھی کچھ مل جائے گا.(۱)

ایسے لوگوں کا امامؑ کو چھوڑ کر چلے جانا ایک طبعی سی بات تھی، معتبر کتابوں میں اس منزل کے بعد اصحاب میں سے کسی ایک کے بھی چھوڑ کر چلے جانے کی بات نہیں کی گئی. ہاں متاخرین کی کتابوں میں ایک مجہول وغیر معتبر کتاب بنام نور العیون سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ بی بی سکینہ فرماتی ہیں شب عاشورہ لوگ دس دس، بیس بیس افراد کی ٹولیوں میں بابا کو چھوڑ کر جارہے تھے.(۲) یہ ایک ضعیف روایت ہے جس کا معتبر کتابوں میں نام ونشان نہیں ملتا، لہٰذا یہ ان معتبر اور مستند روایات کا مقابلہ نہیں کرسکتی، خصوصاً یہ جعلی روایت شب عاشورہ امام کے خاندان کے افراد اور اصحاب کی گفتگو کے بھی منافی ہے نیز امامؑ نے اپنے اصحاب کے بارے میں جو ارشاد فرمایا اس کے بھی منافی ہے.

دوسرا حصہ : اصحاب کی تعداد

امامؑ کے اصحاب کی تعداد کے بارے میں کتابوں میں اختلاف پایا جاتا ہے.(۳)
طبری نے سو افراد کہے ہیں، جن میں سے پانچ حضرت علیؑ کے بیٹے، سولہ افراد بنی ہاشم سے اور بقیہ دوسرے قبائل کے افراد تھے.(۴) ابن شہر آشوب نے کل تعداد بیاسی افراد کی

---

(۱) وقعة الطف، ص۱۹۶

(۲) اکسیر العبادات فی اسرار الشہادات ج ۲ ص ۱۸۲

(۳) اس سوال کے آخر تک سب حوالے ہم تاریخ امام حسینؑ، ج ۳ ص ۲۴۲۔۲۵۰، سے نقل کررہے ہیں یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے.

(۴) تاریخ طبری، ج۵ ص ۳۹۳

ذکر کی ہے.(۱) ابن نما (جو کہ چھٹی وساتویں صدی ہجری میں بزرگ شیعہ علماء میں سے تھے) لکھتے ہیں کہ اصحاب امامؑ سو افراد پیادے تھے اور پینتالیس افراد سوار تھے. (۲) سبط ابن جوزی نے بھی یہی تعداد بتلائی ہے.(۳) اور امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت جو کہ شیعہ کتب روایت میں مذکور ہے اسی قول کی تائید کرتی ہے(۴)

سب سے عجیب مسعودی کا قول ہے کہ امام حسینؑ کے کربلا میں ورود کے وقت تک آپ کے اصحاب کی تعداد پانچ سو افراد سوار تھے اور ایک سو افراد پیادے تھے.(۵) ان میں سے مشہور قول وہی ہے جو آج بھی شہرت پا چکا ہے کہ آپ کے اصحاب کی تعداد کربلا میں ۷۲ افراد تھی جن میں سے ۳۲ افراد سوار تھے اور ۴۰ پیادے(۶)

سوال ۱۲: کربلا میں موجود مردوں میں کیا امام سجاد علیہ السلام کے علاوہ بھی کوئی مرد زندہ بچا تھا یا نہیں؟

جواب: تاریخی کتب کی طرف رجوع کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ زندہ بچ جانے والوں میں چند افراد تھے، اسے بھی دو حصوں میں (بنی ہاشم وغیر ھاشم) ذکر کریں گے.

پہلا: بنی ھاشم کے افراد

۱) امام زین العابدینؑ

۲) حسن بن حسن المعروف حسن مثنیٰ، آپ عاشورہ کے دن زخمی حالت میں اسیر ہو گئے تھے، اسماء بن خارجہ لعین نے آپ کے قتل کا قصد کیا تو عمر بن سعد نے اسے روک دیا، آپ

---

(۱) المناقب، ج۴، ص۹۸

(۲) مثیر الاحزان، ص۲۷و۲۸

(۳) تذکرہ الخواص، ص۱۴۳

(۴) بحار الانوار، ج۴۵، ص۴

(۵) مروج الذھب، ج۳، ص۷۰

(۶) انساب الاشراف، ج۳، ص۱۸۷، دینوری الاخبار الطوال، ص۲۵۴، ابن اعثم الفتوح، ج۵، ص۱۸۳، بحار الانوار، ج۴۵، ص۴، فتال نیشاپوری روضۃ الواعظین ص۱۵۸و.....

کی شادی امام حسین علیہ السلام کی دختر جناب فاطمہ کبریٰ سے ہوئی اور آپ نے ۳۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کچھ عرصہ حضرت علیؑ کے اوقاف وصدقات کے متولی بھی رہے۔(۱) عبداللہ محض آپ کے ہی بیٹے تھے اور انہی عبداللہ محض کے دو بیٹے تھے ان میں سے ایک محمد تھے جو نفس زکیہ کے نام سے معروف تھے اور اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ آپ پہلے علوی تھے جن کے ماں باپ دونوں علوی تھے۔

۳) زید بن حسن :

آپ بھی امام حسنؑ کے بیٹے تھے اور بعض کتب میں آپ کی کربلا میں موجودگی ملتی ہے۔(۲) آپ نوے سال کی عمر تک زندہ رہے اور آپ بنی ہاشم کے بزرگوں میں سے شمار ہوتے تھے اور آپ لمبی مدت تک رسولؐ خدا کے صدقات کے متولی رہے۔(۳)

۴) عمرو بن حسن :

آپ کا بھی کربلا میں موجود ہونا، بعض کتابوں میں ملتا ہے۔(۴)

۵) محمد بن عقیل ۶) قاسم بن عبد اللّٰہ جعفر (۵)

دوسرا اصحاب میں جو افراد زندہ رہے

۱) عقبہ بن سمعان : یہ امام حسین علیہ السلام کی زوجہ جناب رباب کے غلام تھے۔ یہ عاشورہ کے دن گرفتار ہوئے، جب انہیں عمر بن سعد کے سامنے لیجایا گیا اور اسے پتہ چلا کہ یہ غلام ہیں تو اس نے ان کی آزادی کا حکم دیا۔(۶)

---

(۱) بحار، ج۴۴،ص۱۶۶،۱۶۷

(۲) مقاتل الطالبین، ص۱۱۹، منقول از شہید جاوید، ص۱۰۹

(۳) بحار، ج۴۴،ص۱۶۳،۱۶۵

(۴) تاریخ طبری، ج۴،ص۳۵۹،منقول از شہید جاوید،ص۱۰۹

(۵) سیر اعلام النبلاء، ج۳،ص۳۰۳،منقول از شہید جاوید،ص۱۰۹

(۶) وقعۃ الطف مقدمہ،ص۳۲،منقول از تاریخ طبری، ج۵،ص۳۵۴

۲) ضحاک بن عبداللہ مشرقی

اس نے امام سے یہ شرط کی تھی کہ جب تک میری مدد آپ کے لئے فائدہ مند ہوگی میں مدد کروں گا جب میری مدد کا فائدہ نہ رہے گا تو مجھے چلے جانے کی اجازت ہوگی. لہٰذا اسی وجہ سے وہ روز عاشورہ آخری وقت میں امام کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اپنی شرط یاد دلائی اور امام نے اس کی تائید کرتے ہوئے پوچھا اپنے آپ کو کیسے بچاؤ گے؟ پھر فرمایا اگر نکل کر جا سکتے ہو تو میری طرف اجازت ہے. وہ امام کی اجازت لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور دشمن کی صفیں چیرتا ہوا دو آدمیوں کو قتل کر کے معرکے سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا(۱) اور بعد میں مورخین نے عاشورہ کے مختلف حوادث کو اس سے روایت کیا ہے.(۲)

۳) غلام عبدالرحمٰن بن عبداللہ انصاری :

یہ بھی میدان کربلا میں حاضر تھے اور بعض روایات کے راوی بھی ہیں وہ کہتے ہیں جب میں نے دیکھا میرے ساتھی مارے جا چکے ہیں تو میں میدان سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا.(۳)

۴) مرقع بن ثمامہ اسدی ۵) مسلم بن رباح غلام حضرت علی علیہ السلام (۴)

جیسا کہ بیان ہو چکا تاریخ کی کتابوں میں واقعہ کربلا سے مربوط بہت سی روایات انہی افراد سے بلا واسطہ یا بالواسطہ نقل ہوئی ہیں.

بی بی شہر بانو

سوال ۱۳ : امام سجاد علیہ السلام کی والدہ بی بی شہر بانو کیا یزدگرد سوّم کی بیٹی تھیں؟ اور کیا آپ کربلا میں موجود تھیں؟ کیا یہ بھی حقیقت

(۱) الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۵۶۹

(۲) وقعۃ الطف، ص۳۲، ۳۵، مقدمہ

(۳) وقعۃ الطف، ص۳۵، مقدمہ منقول از تاریخ طبری، ج۵، ص۴۲۱، ۴۲۲

(۴) شہید جاوید، ص۱۰۹، منقول از تاریخ طبری، ج۴، ص۳۴۷، تہذیب ابن عساکر، ج۴، ص۳۳۸

ھے کہ آپ امام حسینؑ کے حکم سے ایران کی طرف چلی آئیں ؟ کیا تھران کے نزدیک جو آرامگاہ بی بی شھر بانو کے نام سے معروف ھے صحیح ھے ؟

جواب: بعض متاخر کتابوں (جو خود یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معتبر تاریخوں سے نقل کیا ہے) میں لکھا ہے کہ بعض معتبر تاریخوں میں ملتا ہے کہ شہر بانو یہ جو کہ کربلا میں حاضر تھیں اور جناب قاسم کی زوجہ فاطمہ کی والدہ تھیں. امام حسینؑ کے حکم کے مطابق امام کے گھوڑے پر سوار ہوئیں اور وہ گھوڑا اذن خدا کے ساتھ کچھ ہی دیر میں شہر رے پہنچ گیا. آپ وہیں ایک پہاڑ کی غار میں سید عبدالعظیم الحسینی کے نزدیک مدفون ہوئیں. (۱)

اسی کتاب میں مرقوم ہے کہ لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر عورت کے مقنع کی طرح کا کپڑا نظر آتا ہے کہ کوئی مرد اس کے نزدیک نہیں جا سکتا اور حاملہ عورت کے پیٹ میں بیٹا ہو تو وہ بھی اس کے قریب نہیں جا سکتی (۲) یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ جب بی بی رے کے نزدیک پہنچیں تو ہو (خدا) سے مدد مانگنا چاہی، غلطی سے منہ سے کوہ نکل گیا، وہیں پہاڑ نے آپ کو اپنے اندر لے لیا. (۳)

شاید بعض کے نزدیک اس افسانے کا مصنوعی ہونا اور امام سجاد علیہ السلام کی والدہ گرامی کا کربلا میں حاضر نہ ہونا واضح امور میں سے ہو کہ جسے زیادہ تحقیق کی ضرورت نہ ہو لیکن چونکہ اس بارے میں عام لوگوں کے درمیان بلکہ پڑھے لکھے افراد کے درمیان بہت سی باتیں مشہور ہو چکی ہیں لہٰذا ہم اس بارے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں.

امام سجاد علیہ السلام کی والدہ گرامی

شیعہ و سنی کتابوں کی طرف رجوع کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ میں سے سب

---

(۱) آقای دربندی اکسیر العبادات فی اسرار الشہادات، ج ۳ ص ۱۱۰

(۲) حوالہ سابق

(۳) سید جعفر شہیدی، زندگانی علی بن الحسینؑ

سے زیادہ اختلاف امام سجاد علیہ السلام کی والدہ کے نام کے بارے میں ہے. بعض محققین نے ان کتب کی طرف رجوع کر کے چودہ نام (۱) اور بعض نے پندرہ نام (۲) ذکر کئے ہیں (۳) یہ سب نام یہ ہیں:

۱	شہربانو	۲	شاہِ زنان	۳	جہان شاہ	۴	شہربانویہ	۵	شہزنان
۶	شہرناز	۷	جہاں بانویہ	۸	خولہ	۹	برّہ	۱۰	سلافۃ
۱۱	غزالۃ	۱۲	سلامۃ	۱۳	حرار	۱۴	مریم	۱۵	فاطمہ

سنی کتب میں سلافہ، سلامہ اور غزالہ زیادہ ذکر ہوئے ہیں. (۴) جب کہ شیعہ کتب خصوصاً روایات کی کتابوں میں شہربانو زیادہ مشہور ہے. بعض محققین (۵) کے مطابق سب سے پہلے یہ نام محمد بن حسن صفار قمی (متوفی ۲۹۰ ہجری) کی بصائر الدرجات میں آیا ہے. (۶) بعد میں محدث شیخ کلینیؒ نے یہ روایت کافی میں نقل کی (۷) بقیہ کتب نے یا انہی دو کتابوں سے استفادہ کیا یا پھر ضعیف و غیر معتبر روایات کو ذکر کیا. (۸)

اس روایت میں یوں آیا ہے. جب یزدگرد کی بیٹی قیدی بنا کر عمر کے پاس لائی گئی تو مدینہ کی عورتیں اسے دیکھنے کے لئے اُمڈ آئیں جب آپ کو مسجد میں لایا گیا تو آپ کی

---

(۱) سید جعفر شہیدی، زندگانی علی بن الحسینؑ ص ۱۰، ۱۱

(۲) مقالہ حول سیدہ شہر بانو، نوشتہ شیخ محمد ھادی یوسفی، مندرج در مجلہ رسالۃ الحسین سال اول شمارہ ۲۵، ربیع الاول ۱۴۱۲

(۳) بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۸۔۱۳

(۴) محمود رضا، افتخار زادہ، شعوبیہ ناسیونالیسم ایران، ص ۳۰۵، یہ بلاذری کی انساب الاشراف، ابن سعد کی طبقات، دینوری کی المعارف اور کامل سے نقل کرتے ہیں

(۵) سید جعفر شہیدی، زندگانی علی بن الحسینؑ، ص ۱۲

(۶) بحار، ج ۶، ص ۹، حدیث ۱۲

(۷) اصول کافی، ج ۲، ص ۳۶۹

(۸) تاریخ شہربانو کی بحث کی تفصیلات کے لئے دیکھیں، شعوبیہ ناسیونالیسم ایرانی، ص ۲۸۹۔۳۳۷

نورانیت سے مسجد چمک اٹھی، عمر نے جب آپ پر نظر کی تو آپ نے چہرہ چھپائے ہوئے کہا اف بیروج بسادا ھرمز (وائے ہرمز کا مقدر تاریک ہوگیا) عمر نے کہا یہ لڑکی مجھے گالیاں دے رہی ہے تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا یہ تمہیں گالیاں نہیں دے رہی پھر عمر نے اسے اختیار کرنا چاہا تو حضرت امیرؑ نے فرمایا تمہیں یہ حق نہیں ہے، تم اسے یہ اختیار دو کہ وہ مسلمانوں میں سے جسے چاہے منتخب کرلے، تم اسے اس کے غنیمت کے حصے میں سے شمار کر لینا عمر نے اسے یہ اختیار دیا تو اس نے آ کر ہاتھ امام حسینؑ کے سر پر رکھ دیا. حضرت علی نے اس سے فرمایا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا جہان شاہ. تو آپ نے فرمایا بلکہ شہر بانو، اس کے بعد امام حسینؑ سے فرمایا اے ابا عبداللہ اس لڑکی سے تمہارا جو لڑکا پیدا ہوگا وہ روئے زمین پر سب سے بہتر ہوگا، اور حضرت علی بن الحسین علیہ السلام ان سے متولد ہوئے حضرت امام زین العابدینؑ کو ابن الخیرتین (دو برگزیدہ کا بیٹا) کہتے تھے کیونکہ عرب سے خدا کا برگزیدہ جناب ہاشم تھے اور عجم سے فارسی. (۱)

اس روایت میں سند کی بحث بھی ہے اور متن کی بھی، اس کی سند میں ابراہیم بن اسحاق احمر (۲) اور عمرو بن شمر موجود ہیں جو کہ غلوّ سے متہم تھے اور شیعہ رجالی علماء کی طرف سے ان کی توثیق نہیں ہوئی. (۳) اور متن کے لحاظ سے بھی اس روایت پر درج ذیل اشکالات کیے گئے ہیں.

۱) یزدگرد کی کسی بیٹی کا قید ہونا سخت مشکوک ہے.

۲) ایسی لڑکی کا عمر کے دور میں قید ہونا اور پھر امام حسینؑ کے ساتھ اس کی تزویج بھی ناقابل قبول ہے.

۳) اس روایت کے علاوہ کسی معتبر شیعہ کتاب میں امام زین العابدین علیہ السلام کا لقب

---

(۱) ترجمہ سید جواد مصطفوی، اصول کافی، ج ۲، ص ۳۶۹

(۲) آیۃ اللہ خوئی، معجم رجال الحدیث، ج ۱، ص ۳۰۲، وج ۱۳ ص ۱۰۶

(۳) حوالہ سابق

ابن الخیرتین ذکر نہیں ہوا. لگتا ہے یہاں ایرانی تعصب کام کر گیا ہے کہ ساسانی نسل کو نسل پیغمبرؐ سے ربط دے کر امامؑ کو خیر اہل الارض کے طور پر مشہور کرنے کی کوشش کی گئی ہے.

جن روایات میں شہر بانو کا نام مذکور ہے ان پر ان جیسے اشکالات باعث بنتے ہیں کہ ان روایات کو حدیث سازوں کی کارستانی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا جائے اور امام علیہ السلام کی والدہ کا نام شہر بانو بھی مورد قبول قرار نہ پائے.

امام سجاد علیہ السلام کی والدہ کے نسب کے حوالے سے بھی تاریخ وحدیث کی کتب میں اختلاف پایا جاتا ہے:

یعقوبیؒ (متوفی ۲۸۱ ہجری) (۱) محمد بن حسن قمیؒ (۲)

کلینیؒ (متوفی ۳۲۹ ہجری) (۳) محمد بن حسن صفار قمیؒ (متوفی ۲۹۰ ہجری) (۴)

شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ ہجری) (۵) شیخ مفیدؒ (متوفی ۴۱۳ ہجری) (۶)

آپ کو یزدگرد کی دختر شمار کرتے ہیں اگرچہ آپ کے نام پر یہ سب بھی متفق نہیں ہیں. یہ نسب متاخرین شیعہ کے درمیان کافی شہرت حاصل کر چکا ہے یہاں تک کہ کسی دوسرے نظریے کی گنجائش ہی نہیں رہی (۷) اس قول کے مقابل کچھ اور اقوال بھی قدیم وجدید کتابوں میں ذکر کیے گئے ہیں، بعض نے سندی، بعض نے سیستانی اور بعض نے آپ کا کابلی ہونا ذکر کیا ہے (۸) بعض نے آپ کے ایرانی والد کے نام سبحان، نوشجان اور شیرویہ

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۳۰۳

(۲) تاریخ قم، ص۱۹۵

(۳) اصول کافی، ج۲ ص۳۶۹

(۴) بحار الانوار، ج۴۶ ص۹

(۵) عیون الاخبار الرضاؑ، ج۲، ص۱۲۸

(۶) الارشاد، ص۴۹۲

(۷) زندگانی علی ابن الحسینؑ ص۱۲

(۸) شعوبیہ، ص۳۰۵

وغیرہ ذکر کیے ہیں.(۱) اس نسب کی تحقیق کے لئے ان روایات کی سندی بحث پر تو اکتفا نہیں کیا جا سکتا ہے چونکہ ان اقوال میں سے کسی قول کی بھی مستحکم سند موجود نہیں ہے. اس کے علاوہ اکثر تاریخی کتب (جیسے یعقوبی) نے یہ مطالب سند ذکر کئے بغیر بیان کیے ہیں.

لہٰذا ان اقوال و روایات کے متن کے لحاظ سے ان کی تحقیق کرنا ہوگی اور اس لحاظ سے درج ذیل اشکالات پیش آتے ہیں:

۱) سب سے اہم اشکال ان اقوال و روایات کا نام کے لحاظ سے اختلاف ہے اور ان کتب میں مختلف نام ذکر ہوئے ہیں جیسے حرار، شہر بانو، سلافہ اور غزالہ وغیرہ، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان روایات کے جعل کرنے والے ایک مشترکہ مقصد و ہدف رکھتے تھے اور وہ وہی ایرانی تعصب اور ایرانیوں اور ائمہؑ کے درمیان نسب کے ذریعے ارتباط پیدا کرنے کی کوشش تھی، تاکہ اپنے گمان کے مطابق ساسانی بادشاہوں سے شاہی تخم اور خدائی سبب ائمہ کی طرف منتقل کر سکیں.

۲) روایات ان کی اسارت کے زمانے کے لحاظ سے بھی اختلاف رکھتی ہیں، بعض میں حضرت عمر کا دور ذکر ہوا ہے اور بعض میں عثمان کا دور اور بعض میں جیسے شیخ مفیدؒ، اسے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے دور میں ذکر کیا ہے.(۲)

۳) تاریخ طبری اور الکامل ابن اثیر جیسی کتابیں جن میں ایرانیوں کے ساتھ مسلمانوں کی جنگیں سال بہ سال ذکر کی گئی ہیں اور ان میں یزدگرد جہاں جہاں بھاگ کر گیا ان سب مقامات کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن ان کتابوں میں کہیں بھی یہ نہیں ملتا کہ اس کی اولاد میں سے کسی کو قیدی بنایا گیا ہو. حالانکہ یہ مسئلہ دوسرے کئی جزئی واقعات سے اہم تھا جن کے بارے میں ان کتابوں میں لکھا گیا ہے.

۴) بعض سابقہ مصنفین جیسے مسعودی جب یزدگرد سوم کی اولاد کا ذکر کرتے ہیں تو اس

---

(۱) حول السیدہ شہر بانو، ص۲۸

(۲) شعوبیہ، ص۳۲۲

کی بیٹیوں کے نام ادرک، شاہین اور مردآوند بیان کرتے ہیں جو کہ پہلا تو یہ کہ امام سجادؑ کی والدہ ماجدہ کے مذکورہ ناموں میں سے کسی ایک سے بھی میل نہیں کھاتے اور دوسرا یہ کہ کہیں بھی ان لڑکیوں کی قید واسارت کی بات نہیں کرتے.(۱)

۵) سب سے اہم تاریخی دستاویز جس پر امام سجاد علیہ السلام کی والدہ کے نام کے حوالے سے اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ منصور کے محمد بن عبداللہ المعروف نفس زکیہ کے نام خطوط ہیں جو کہ مدینہ میں علوی وطالبی (اولاد ابو طالب) مخالفین کا رہبر تھا اور اس کے اور منصور کے درمیان ہمیشہ چپقلش رہتی تھی. نفس ذکیہ کے نسبی افتخار کے دعوے کو رد کرتے ہوئے ایک خط میں منصور اسے لکھتا ہے:

ما ولد فیکم بعد وفاۃ رسول اللّٰہ افضل من
علی ابن الحسین وھو الام ولد (۲)

''یعنی رسولؐ خدا کی رحلت کے بعد تم لوگوں کے درمیان علی بن الحسینؑ سے افضل شخصیت متولد نہیں ہوئی حالانکہ وہ بھی ام ولد کنیز سے متولد ہوئے'' اور منصور کی اس بات کہ علی بن الحسینؑ ام ولد کنیز کے بیٹے تھے نہ محمد نفس زکیہ نے اعتراض کیا اور نہ کسی اور نے اگر آپ ایرانی شہزادی کے بیٹے ہوتے تو کوئی تو اسے ٹوکتا. اگر یہ داستان سچ ہوتی تو خود محمد نفس زکیہ اس کا حوالہ دیتے. ان سب قرائن سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی والدہ کو اس نام ونسب کے ساتھ ایرانی قرار دینا ایک مصنوعی اور من گھڑت روایت ہے جس میں دوسری روایات سے صرف نظر کیا گیا ہے جن میں آپ کی والدہ کو سندھ یا کابل سے قرار دیا گیا ہے حالانکہ قرن سوم سے پہلے تک تو اکثر ناقلین نے انہیں سندیا کابل کی کنیز شمار کیا ہے.(۳)

---

(۱) شعوبیہ ،ص۳۰۴

(۲) الکامل فی التاریخ، ج۲،ص۵۷۰

(۳) حول السیدہ شھر بانو،ص۴۸

امام سجادؑ کی والدہ کا کربلا میں موجود نہ ہونا

اس بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ شیعی کتب جن میں امام سجاد علیہ السلام کی والدہ کی اسیری کے بعد والی زندگی کا ذکر ہوا ہے، ان سب میں لکھا ہے کہ آپ کی وفات اس وقت ہوگئی تھی جس وقت امام سجادؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ (۱) اور ان میں لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ایک کنیز دائی کے طور پر امام سجادؑ کی پرورش کی ذمہ داری نبھاتی رہی اور لوگ اسے آپ کی والدہ سمجھتے تھے، جب آپ نے اس کی آگے شادی کردی تو تب لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ تو آپ کی دائی تھی نہ کہ والدہ تھی۔ (۲) لہٰذا شیعی معتبر کتب کے لحاظ سے قطعی طور پر امام پاکؑ کی والدہ کا کربلا میں موجود نہ ہونا ثابت ہے، چاہے آپ کا نام و نسب کچھ بھی ہو۔

بی بی شہر بانو کا مقبرہ

سابقہ مطالب سے بھی اور اس بات سے بھی کہ امام سجاد علیہ السلام کی والدہ آپ کے تولد کے ساتھ وفات پاگئیں اس بات کا جواب بھی روشن ہو جاتا ہے اور ہمارے ہم عصر محققین نے قطعی دلیلوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شہر رے کے مشرق میں کوہ بی بی شہر بانو پر جو مقبرہ ہے اس کا امام سجاد علیہ السلام کی والدہ سے کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ عمارت بعد والی صدیوں میں بنائی گئی ہے جیسا کہ اس مقبرہ کے تعویز پر تعمیر کی تاریخ ۸۸۸ ہجری لکھی ہوئی ہے اور اس عمارت کا دروازہ جس طرح کا میناکاری شدہ ہے یہ صفوی دور کا ہے اور اس پر اضافے قاجاری دور کے فن کاری نمونے ہیں۔ (۳)

شیخ صدوق سالہا سال شہر رے میں رہا اور اس سے مکمل واقفیت رکھتے تھے، ان کا اس مقبرے کے بارے میں اپنی کتابوں میں ذکر نہ کرنا بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ یہ

---

(۱) عیون اخبار الرضاؑ، ج۲، ص۱۲۸

(۲) بحار الانوار، ج۴۶، ص۸

(۳) شعوبیہ، ص۳۲۶

مقبرہ شیخ صدوق کے زمانے یعنی چوتھی صدی ہجری میں موجود نہیں تھا. دوسرے لکھنے والے جنہوں نے شاہ عبدالعظیم اور رے میں مدفون دوسری ہستیوں کا تذکرہ کیا ہے انہوں نے بھی ایسے کسی مقبرے کا تذکرہ نہیں کیا. لہٰذا احتمال یہی ہے کہ بعد کے زمانوں میں کوئی نیک بی بی جن کا نام شہربانو ہوگا یہاں دفن ہوئی ہو اور پھر مدتیں گذرنے کے بعد لوگوں نے غلطی سے اسے امام سجاد علیہ السلام کی والدہ سمجھنا شروع کر دیا ہو چونکہ اس کا نام بھی شہربانو تھا اور آپؑ کی والدہ بھی شہربانو کے نام سے مشہور ہو چکی تھیں یا بعض نے جان بوجھ کر لوگوں کے ذہنوں میں ایسی بات ڈالی ہو اور مختلف مقاصد کے پیش نظر اس بات کو تقویت دیتے رہے ہوں.(۱)

یزید کی توبہ

سوال ۱۴: کیا یزید نے توبہ کر لی تھی اور کیا ایسے شخص کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟

جواب : یہ سوال دو حصوں (تاریخی اور کلامی) پر تقسیم ہوتا ہے دوسرے حصے کا جواب کئی اور سوالوں کے جواب پر موقوف ہے جیسے کہ آیا ایسے گناہ عظیم کے بعد کیا ایسا شخص توبہ کی توفیق حاصل کر سکتا ہے؟ اس کی توبہ واقعی ہوگی یا ظاہری، جن آیات یا روایات میں بطور عام قبول توبہ کا ذکر ہوا ہے کیا یہ مورد ان سے مستثنیٰ ہے یا نہیں وغیرہ. لیکن ان سب سوالوں کی نوبت تب ہی آئے گی جب تاریخی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ یزید اپنے گناہوں پر پشیمان ہو گیا تھا اور اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا اور اس نے بارگاہ خدا میں توبہ و استغفار کی تھی لیکن اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر ان سوالوں کی نوبت ہی نہیں آئے گی.

پوری اسلامی تاریخ میں مورخین اور محدثین کی اکثریت اور دوسرے مسلمان علماء

---

(۱) اس مقبرہ کے امام سجادؑ کی والدہ سے مربوط نہ ہونے کے حوالے سے دیکھئے: باشان (کریمیان) و دانشنامہ ایران (کلمہ شہربانو) واسلام

یزید کو ایک ظالم و گناہ گار شخص شمار کرتے ہیں اور اسے اپنے گناہوں میں خصوصاً واقعہ عاشورہ کے حوالے سے قصوروار ٹھہراتے ہیں اور اسے خطاء پر سمجھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ غزالی جیسے بعض افراد بھی تھے جس نے احیاء العلوم میں یزید پر اس لئے لعنت کرنے سے انکار کیا کہ ہوسکتا ہے اس نے توبہ کرلی ہو۔

غزالی کی عالم اسلام میں مسلّم شخصیت کے باوجود اس کی یہ بات مقبولیت حاصل نہ کرسکی، اسی زمانے میں اس کے ہم عمر بڑے بڑے علماء جیسے ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ ہجری) نے اس نظریے کو بڑی شدت سے رد کردیا حتیٰ کہ اس بارے میں ایک کتاب (الرد علی لمتعصب العنید) بھی لکھی. بعد میں اسی طرح کی باتیں بعض مستشرقین نے بھی کیں، جیسا کہ لامنس یہودی نے مقالات دائرہ المعارف اسلام میں ایسا لکھا ہے اور آج کل پھر بعض علمی محافل میں اس طرح کی بات کی جارہی ہے اور شبہ دوسری طرح پیش کیا جارہا ہے ان سب سے اس بحث کی تاریخی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

یزید کی توبہ کے حوالے سے جو تاریخی ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱) ابن قتیبہ نے الامامة والسياسة (ج ۲ ص ۸) میں لکھا ہے کہ یزید کے دربار میں کچھ حوادث پیش آئے کہ فبكىٰ يزيد حتىٰ كادت نفسه تفيض "یعنی یزید اس طرح رویا کہ قریب تھا کہ اس کی روح بدن سے نکل جائے۔

۲) جب شہداء کے سر اور اسراء کو دربار یزید میں لایا گیا تو یزید پر اس کا سخت گہرا اثر ہوا اور اس نے اس شنیع جنایت کو ابن زیاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا:

لعن الله ابن مرجانه لقد بغضى الى المسلمين
وزرع لى فى قلوبهم البغضاء. (۱)

"خداوند ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر لعنت کرے جس نے مجھے
مسلمانوں کی نظروں میں برا اور ناپسندیدہ بنا دیا اور ان کے

---

(۱) سبط ابن جوزی، تذکرہ الخواص، ص ۲۵۶

دلوں میں میرے لئے کینہ کاشت کردیا"

یزید کی طرف منسوب ایک دوسرے کلام میں یوں وارد ہے کہ یزید اپنے آپ کو امام علیہ السلام کی مخالفتوں کے باوجود بڑا بردبار ظاہر کرتا ہے جو امام حسینؑ کے نواسہ رسولؐ ہونے کی وجہ سے ان کے قتل پر راضی نہیں تھا اور اس جرم کا ابن زیاد مرتکب ہوا۔(۱)

۳) جب یزید نے قافلہ کربلا کو مدینہ کی طرف بھیجا تو امام زین العابدین کو یہ خطاب کیا:

لعن اللّٰه ابن مرجانه اما واللّٰه لوانی صاحبه فسألنی خصلة ابدا الا اعطیته ایاها ولدفعت الحتف عنه بکل ما استطعت ولوبهلاک بعض ولدی. (۲)

"خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے، خدا کی قسم اگر میں امام حسینؑ کے مقابل ہوتا تو ان کی ہر خواہش پوری کرتا اور ہر ممکن طریقے سے موت کو ان سے دور کرنے کی کوشش کرتا، اگرچہ اس میں میرا اپنا کوئی بچہ مارا جاتا"

اگر ان سب باتوں کو مان لیں اور ان کی سند میں کوئی اشکال نہ کریں تو ان سے چند نکات کا استفادہ ہوتا ہے:

الف) کربلا کے واقعہ میں اصلی قصوروار ابن زیاد تھا اور یزید نے نہ امامؑ کے قتل کا حکم دیا تھا اور نہ ان پر سختی کرنے کی بات کی۔

ب) یزید ابن زیاد کے اس عمل پر سخت غصے میں تھا اور اس پر لعنت کی۔

ج) یزید نے امامؑ کے قتل پر سخت افسوس کا اظہار کیا۔

ان نکات میں سے پہلے نکتہ کے بارے میں تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ یزید جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ تاریخ میں یہ بات موجود ہے کہ یزید نے برسر اقتدار آتے ہی اور

---

(۱) الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۵۷۸

(۲) حوالہ سابق، ج۲، ص۵۷۸

اپنے باپ کی نصیحتوں کے برخلاف حاکم مدینہ ولید بن عتبہ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

اذا اتاک کتابی ھذا فاحضر الحسین بن علی
وعبد اللّٰہ بن الزبیر فخذھما بالبیعة لی فان امتنعا
فاضرب اعناقھما وابعث لی برؤسھما. (۱)

''جیسے ہی تمہیں میرا خط ملے تو حسینؑ بن علیؑ اور عبداللہ بن زبیر کو
طلب کر کے ان سے میری بیعت طلب کرو اگر قبول نہ کریں تو
ان دونوں کو قتل کر کے ان کے سر میرے پاس بھیجو''

بعض تاریخوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب امامؑ مکہ تشریف فرما تھے تو یزید نے بعض گماشتوں کو حاجیوں کے روپ میں مکہ بھیجا تا کہ مناسک حج کے دوران امام کو کعبہ کے پاس قتل کر دیں.(۲) جیسا کہ ابن عباس نے بھی یزید کے نام اپنے ایک خط میں اس کا تذکرہ کیا ہے.(۳) اس طرح تاریخی کتابوں میں آیا ہے کہ جب امامؑ عراق کی طرف سفر اختیار کر رہے تھے تو یزید نے ابن زیاد کو لکھا کہ امام حسینؑ کے ساتھ سختی وشدت کا مظاہرہ کرے.(۴) اور بعد میں خود ابن زیاد نے بھی یہ اعتراف کیا کہ یزید نے اسے امام حسینؑ کے قتل کا حکم دیا تھا.(۵)

ابن عباس نے بھی اپنے خط میں یزید کو امام حسینؑ اور بنی ہاشم کے جوانوں کا قاتل قرار دیا

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۴۱

(۲) لھوف، ص۸۲

(۳) تذکرہ الخواص ص ۲۷۵ ،ولسیت انساذا عوانک الی حرم اللہ لتقتل الحسینؑ
و تاریخ یعقوبی ج۲، ص۲۴۹

(۴) ابن عبد ابہ العقد الفرید، ج۵ ص۱۳۰، و سیوطی تاریخ الخلفاء، ص۱۶۵

(۵) تجارب الامم ج۲ ص۷۷ و کتب یزید الی عبید اللہ بن زیاد ان اغزابن الزبیر فقال:
واللہ لا اجمعھا للفاسق ابداً اقتل ابن رسول اللہ و اغزوا ابن زبیر

اوراس کی توبیخ کرتے ہوئے کہا:

انت قتلت الحسین بن علی ولا تحسین لا ابا ک

نسیت قتلک حسینا و فتیا ن بنی عبد المطلب (۱)

''بد بخت یہ خیال نہ کرنا کہ میں اسے بھول چکا ہوں جو تو نے

حسین اور بنی عبدالمطلب کو قتل کیا ہے''

یہ حقیقت اس زمانے میں اس حد تک روشن تھی کہ حتیٰ یزید کے بیٹے معاویہ ثانی نے مسجد جامع دمشق میں برسر منبر اپنے باپ کو ملامت کرتے ہوئے کہا: وقد قتل عترۃ الوسول (۲) ان تاریخی ثبوتوں کے پیش نظر حکم یزید سے امام حسینؑ کا قتل نا قابل انکار حقیقت ہے جس سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کرسکتا۔ (۳)

اور دوسرا نکتہ یہ کہ یزید ابن زیاد پر سخت ناراض ہوا، یہ خلافت حقیقت ہے تاریخ شاہد ہے کہ جب پہلی مرتبہ یزید کو امام حسینؑ کی شہادت کی خبر پہنچی تو اس پر وہ بہت خوش ہوا اور ابن زیاد کی کھل کر تعریف کی، سبط ابن جوزی نے لکھا ہے کہ یزید نے ابن زیاد کی خوب تعریف کی اسے بڑے قیمتی تحائف بھیجے اور اس کے ساتھ راتوں کو شراب خوری کی محفلیں منعقد کیں اور اسے اپنے خاندان کے ایک فرد کے عنوان سے اپنے قریب کیا، اور ابن جوزی نے یزید کے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن سے واضح پتہ چلتا ہے کہ یزید ابن زیاد کے قتل امام حسینؑ والے عمل سے مکمل راضی و مطمئن تھا۔ (۴) اس طرح تاریخ شاہد ہے کہ یزید نے ابن زیاد کو عراق کی گورنری سے معزول کرنے کا کوئی اقدام نہیں اٹھایا بلکہ

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۴۸

(۲) حوالہ سابق، ج۲، ص۲۵۴

(۳) مزید تفصیلات دیکھیں: الرکب الحسینی فی اشام م و منه الی المدینة المنورة ج ٦ از مجموعة مع الرکب الحسینی من المدینة الی المدینه ج ٦ ص ٥٦۔ ٦١

(۴) تذکرہ الخواص، ص۲۹

جب سن ۶۳ ہجری میں ابن زبیر نے قیام کیا تو یزید نے ابن زیاد کو حکم دیا کہ ابن زبیر کے مقابلے کے لئے جاؤ.(۱)

لہٰذا بالفرض اگر یزید نے ابن زیاد سے اظہار ناراضگی کیا تھا تو اسے مصنوعی عمل شمار کیا جائے گا، حضرت زینب بنت علی سلام اللہ علیہا اور امام سجادؑ کے خطبوں کی وجہ سے جب حالات بگڑنے لگے تو یزید اس طرح کے اظہار پر مجبور ہو گیا تا کہ اس برے عمل کی وجہ سے اس کے بارے لوگوں میں جو نفرت و غصہ پیدا ہو چکا ہے اسے کم کیا جا سکے اور تیسرا نکتہ یعنی یزید کا قتل امامؑ پر افسوس کا اظہار کرنا بھی تاریخی شواہد کے برخلاف ہے کیونکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ جب شہداء کے سر اور اسیروں کا قافلہ دمشق میں دربار یزید میں وارد ہوا تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور چھڑی سے امام حسین علیہ السلام کے دندان مبارک پر گستاخی کی.(۲) اسی طرح اس نے ایسے اشعار پڑھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں بنی ہاشم سے بدر کا انتقام لینے کی خواہش موجود تھی.(۳) کیونکہ جنگ بدر میں یزید کا نانا، ماموں اور دوسرے بڑے بڑے قریش، پیغمبرؐ کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے، انہی اشعار میں یزید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تکذیب بھی کی اور اسے صرف حکومت تک پہنچنے کا ایک حربہ قرار دیا.

لعبت هاشم بالملک فلا خبر جاء ولا حواله سابق نزل ۴

''بنی ہاشم نے حکومت بازی کی ورنہ نہ آسمان سے کوئی خبر آئی اور نہ وحی اتری''

ہاں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا اس کا اظہار افسوس اس وقت تھا جب دمشق کے حالات بگڑنا شروع ہوئے، اب اس کی طرف سے خوشی کا اظہار حالات کو مزید خراب کر سکتا تھا لہٰذا اس نے مصنوعی افسوس کا اظہار شروع کر دیا. اس بحث کے آخر میں دو نکات کا ذکر ضروری ہے:

---

(۱) تجارب الامم، ج ۲، ص ۷۷ (۲) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۴۵

(۳) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱۴، ص ۲۸۰

(۴) مقتل خوارزمی، ج ۲، ص ۵۸، تذکرہ الخواص، ص ۲۶۱

پہلا یہ کہ : جیسا کہ یزید کی گفتگو سے ظاہر ہے اس کا اظہار افسوس صرف ایک سیاسی چال تھی اور اس میں کوئی ایسا قرینہ نہیں تھا جس سے اس کی توبہ واستغفار و پشیمانی کا پتہ چلتا ہو، لہٰذا اس کا یہ عمل بھی سیاسی عمل کے طور پر جانچا جانا چاہیے نہ کہ اسے یزید کی توبہ کے طور پر لیا جائے اور پھر یہ بحث کریں کہ آیا اس کی توبہ کے پیش نظر اس پر لعنت جائز ہے یا نہیں؟

دوسرا یہ کہ : بالفرض قبول کرلیں کہ یزید نے توبہ کی تھی تو اس کے بعد والے اعمال میں دیکھیں کہ آیا اس توبہ کا کوئی اثر آتا ہے یا نہیں جب کہ تاریخ تو اسکے برخلاف بتلاتی ہے کیونکہ یزید نے واقعہ عاشورہ کے بعد اپنی منحوس حکومت کے باقی ماندہ دو سالوں میں دو عظیم جرائم کا ارتکاب کیا۔

۱) مدینہ میں قتل عام اور اس شہر کو اپنے سپاہیوں پر تین دن تک مباح قرار دے دینا اور بہت سے صحابہ کا اس میں قتل ہو جانا، یہ واقعہ حرہ کے نام سے مشہور ہے۔(۱)

۲) مکہ پر حملے کا حکم کہ جس میں اس کی فوج نے منجنیق سے اس مقدس شہر پر حملہ کیا اور کعبہ کی حرمت کو توڑا اور کعبہ پر آگ پھینک کر اسے جلا دیا۔(۲)

لہٰذا یہ مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ نہ صرف یہ کہ کوئی تاریخی حوالہ ایسا نہیں ملتا جو یزید کی توبہ پر دلالت کرتا ہو بلکہ تمام تاریخی قرائن اس کے توبہ نہ کرنے پر دلالت کرتے ہیں لہٰذا یزید پر لعنت کا حکم تمام مسلمانوں کے نزدیک ثابت رہے گا۔

---

(۱) الکامل ابن اثیر، ج۲ص۵۹۳

(۲) حوالہ سابق، ص۶۰۲

دوسرا حصہ

فلسفۂ قیامِ امامِ حسین علیہ السلام

سید ابراہیم حسینی

امربالمعروف و نهی عن المنکر

سوال ۱۵ : امام حسین علیہ السلام نے جو یہ فرمایا "میں نے امربالمعروف اورنہی عن المنکر کی خاطر قیام کیا ہے" اس کا کیا مطلب ہے ؟

جواب: امام پاک علیہ السلام کی اس گفتگو سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصلی مقام ومرتبہ کا پتہ چلتا ہے، امام پاک علیہ السلام اپنے اس کلام کے ذریعے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بنیادی کردار کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس طرح کہ آپ اپنے قیام کا اصل ہدف ومقصد اس وظیفہ کی انجام دہی کو قرار دیتے ہیں، اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصلی حیثیت کی طرف توجہ کی جائے تو حضرت کے اس کلام کا مطلب واضح وروشن ہو جائے گا.

امر المعروف اور نہی عن المنکر کا اصول تمام الٰہی ادیان میں موجود ہے اور اسے تمام انبیاء ورسل، آئمہ اور مومنین کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے. یہ مسئلہ صرف ایک شرعی وفقہی وظیفہ ہی نہیں ہے بلکہ انبیاء ورسل کی نبوت ورسالت کا معیار اور ان کی بعثت کی ایک علت

بھی تھا، کیونکہ یہ مادی کائنات حق و باطل، خیر وشر، نیکی و بدی، اچھائی و برائی، نور وظلمت اور فضائل ورذائل کے دائمی ٹکراؤ کی جگہ ہے اور یہ امور کبھی آپس میں اس طرح گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ ان کی پہچان اور ان پر عمل سخت مشکل ہو جاتا ہے، الٰہی ادیان میں لوگوں کو حق و باطل، خیر وشر، خوب و بد، نور وظلمت اور فضیلت ورذیلت کی پہچان کرواتے ہوئے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ہر معروف کو انجام دیں اور ہر منکر (برائی) سے رک جائیں، یوں وہ اس ہدایت کے ذریعے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کیے جاتے ہیں.

رسولؐ خدا نے اس اہم شرعی فریضے کی اہمیت اور خاص مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتا ہے وہ زمین میں خدا، کتاب خدا اور رسولؐ خدا کا جانشین ہے''(۱)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

''شریعت (دین) کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے''(۲)

قرآن کریم میں بھی مومنین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس وظیفہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اقامہ نماز، عطاء زکات اور اطاعت خدا و رسولؐ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے،(۳) جیسا کہ سورہ توبہ میں ہے. امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا:

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انبیاء کا راستہ ہے اور صالح و نیک افراد کا نصب العین ہے. یہ ایسا واجب ہے کہ تمام واجبات پر اس کے ذریعے عمل ہوتا ہے، راستوں کی امنیت اسی سے حاصل ہوتی ہے، کمائی اس سے حلال ہوتی ہے. دشمن اس

---

(۱) میزان الحکمۃ، ج۳،ص۸۰

(۲) غرر الحکم، ج۲،ص۴۰۰

(۳) سورہ توبہ، آیت ۷

کی وجہ سے انصاف پر مجبور ہوتے ہیں اور تمام کام اسی سے
سیدھے ہوتے ہیں۔(۱)

بنابریں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بنیاد واساس امام حسینؑ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء ورسل، ائمہ، صالحین اور مومنین کا وظیفہ وفریضہ ہے، البتہ سیدالشہداء کے زمانے میں معروف ومنکر سخت گڈمڈ ہو چکے تھے، ایک طرف منکر زندگی کے تمام شعبوں میں رچ بس چکا تھا تو دوسری طرف معروف زندگی کے تمام پہلوؤں سے اٹھ چکا تھا، یہ صورتحال اگر باقی رہتی تو اس سے اسلام اور سنت نبوی وعلوی کا چراغ بجھ جاتا، امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ اس موجودہ صورتحال پر اعتراض اور دین اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احیاء اور اس کا دفاع اب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی خاطر آپ نے قیام کی اصلی وجہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے معاشرہ کی اصلاح کو بیان فرمایا:

انی لم اخرج اشرا و لا بطرا و لا مفسدا ولا ظالما
وانما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدیؐ
ارید آن امر بالمعروف وانھی عن المنکر.

امر بالمعروف اور خطرہ

سوال ۱۶ : امر بالمعروف اورنہی عن المنکر کی شرائط میں سے ایک شرط خطرے اور ضرر سے محفوظ ہونا ہے، یہ شرط نہ صرف یہ کہ موجود نہیں تھی بلکہ یزید کے ماضی اور بنی امیہ کی حکومت کے سابقہ کردار، ظلم و ستم اور بے گناہوں کے قتل و کشتار کو دیکھتے ہوئے یہ بات مسلّم تھی کہ یہ شرط پوری نہیں ہوگی اور امام حسینؑ یا کوئی بھی

---

(۱) اصول کافی، ج۵، ص۵۵، حدیث۱

اگر ایسا اقدام کرے گا تو اسے سخت خطرہ پیش آئے گا ایسی صورت میں امام حسینؑ نے کیسے اپنی نہضت شروع کی اورامر بالمعروف و نہی عن المنکر کا قدم اٹھایا ؟

جواب : ہمیں چاہیے کہ اس وظیفہ کی شرائط وخصوصیات ائمہ معصومینؑ کی روش سے سمجھیں، ہر عمل کے جواز کی شرعی دلیل یہ ہے کہ ائمہؑ نے اسے انجام دیا ہے دوسرے لفظوں میں ائمہؑ کا کردار ورفتار احکام شرعی کی دلیل شمار ہوتا ہے.

لہٰذا مثال کے طور اگر دلیل نے امر بالمعروف کو احتمال تاثیر اور امنیت از ضرر کے ساتھ مشروط کیا ہو اور اپنے عموم واطلاق کے ساتھ اس مورد کو بھی شامل ہو جائے تب بھی امام حسین علیہ السلام کا یہ عمل اس دلیل کا مخصص یا مقید ہو جائے گا اور یہ بات سب سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اہم تر مصلحت درپیش ہو تو پھر یہ دو شرطیں بے معنی ہو جائیں گی ایسی صورت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا ہو گا اگر چہ ضرر اور خطرے کا احتمال ہی کیوں نہ موجود ہو، لہٰذا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی مصلحت کی اہمیت کا احتمال ضرر کے ساتھ موازنہ کرنا ہوگا، اگر اس فریضہ کی مصلحت اہم ہو اور شرعا اس کی ادائیگی ضروری ہو (جیسے کہ بقاء کا تقاضا ہو) تو پھر وہ ضرر برداشت کرنا ضروری اور امر بالمعروف کو ترک کرنا جائز نہیں ہوگا.

دوسرے لفظوں میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر عام حالات میں کہ جب لوگوں کو گناہ ومعصیت سے روکنا اور واجبات کی ادائیگی پر آمادہ وتیار کرنا مقصود ہوتا ہے یہ فرق رکھتا ہے اس امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے جو کلیت وعموم رکھتا ہے دین کی بقاء اور احکام وشعائر الٰہی کا احیاء اس پر موقوف ہو جس کا ترک کرنا مسلمانوں کے لئے نا قابل برداشت نقصانات ومشکلات کا باعث بن سکتا ہو، جیسا کہ یزید کے دور میں اسلامی معاشرہ کفر کی قومیت میں بدل جانے کے قریب پہنچ چکا تھا اور حالات کو دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ عنقریب

دین وشریعت کے آثار مٹ جائیں گے اور اسلام کا فاتحہ پڑھ دیا جائے گا.

پہلی صورت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں یہ شرط ہے کہ ضرر سے امنیت ہو لیکن دوسری صورت میں اس کا وجوب اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ دین کی مدد کی جائے اور اسلام سے خطرے کو دور کیا جائے، اگر چہ اس راہ میں اپنی جان ومال کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے.

یہ خطرہ جو دین کو درپیش تھا امام حسینؑ ہر کسی سے زیادہ اس خطرے کا احساس کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ اس قیام کی ابتداء ہی میں جب مدینہ میں مروان نے آپ کو مشورہ دیا کہ یزید کی بیعت کرلیں تو آپ نے فرمایا:

> انا للّٰہ وانا الیہ راجعون وعلی الاسلام
> السلام اذقد بلیت الامۃ براع مثل یزید
> ''اس مصیبت پر کلمہ استرجاع پڑھا جائے اور اسلام پر سلام
> وداع بھیج دیا جائے جب امت کی حاکمیت یزید جیسے شخص کے
> ہاتھ میں ہو''

یعنی جب یزید مسلمانوں کا حاکم ہو تو اسلام کا انجام معلوم ہے جہاں یزید ہے وہاں اسلام نہیں اور جہاں اسلام ہے وہاں یزید نہیں ہو سکتا، ایسے منکر اور خطرے میں امام حسینؑ پر اسلام کے دفاع کے لئے کھڑا ہونا لازم ہو جاتا ہے وہ اسلام کے مورچے کو خالی نہیں چھوڑ سکتے، چاہے اس میں ان کی اپنی اور ان کے عزیزوں کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے اور ان کی بہنیں اور بیٹیاں اسیر ہو جائیں. کیونکہ امام پاکؑ اسلام کی بقاء کو اپنی جان سے بڑھ کر سمجھتے تھے، لہٰذا آپ نے اپنی جان اسلام پر قربان کر دی باوجود اس کے کہ آپ کے بچوں اور خاندان والوں پر بے پناہ مصیبتیں آئیں اور بڑی سختی سے دو چار تھے لیکن آپ نے اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی نہ کی.

پس امام حسینؑ کا قیام امر بالمعروف ونہی عن المنکر کفر والحاد اور ظلم وستم سے مقابلہ و مبارزہ کی خاطر تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ظلم وستم کے خلاف ایسے مبارزہ کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ ایک شخص (امام حسینؑ کی طرح) اپنے خاندان والوں کے ساتھ قیام کرے اور یہ سب ظالم لشکر کے گھیرے میں ہوں پھر بھی اپنی عزت نفس کی حفاظت کرتے ہوا پنے شرعی فریضے پر کاربند رہے۔

یہ امام حسینؑ ہی کی ہستی جنہوں نے کربلا میں یوم عاشورہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی خاطر ایسی شجاعت اور قوت قلبی کا مظاہرہ کیا کہ بڑے بڑے امتحانات سے سرفراز و سرخرو ہو کر باہر نکلے اور شہیدان راہ حق میں سے سید الشہداء کے رتبہ پر فائز ہوئے. یہاں پر مناسب ہے کہ شہید مرتضیٰ مطہری کے ایک لطیف بیان کی طرف اشارہ کیا جائے کہ وہ فرماتے ہیں:

> ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وجوب کو اس صورت میں تو سب مانتے ہیں جب اس پر کوئی ضرر مترتب نہ ہو، لیکن جب ضرر کا سامنا کرنا پڑے تو اس صورت میں بعض کہتے ہیں کہ اب یہ وظیفہ واجب نہیں رہے گا، اس کا وجوب وہیں تک ہے جب تک امر و ناہی کو کسی قسم کا کوئی جانی و مالی یا ناموس کا ضرر، درپیش نہ ہو، ان لوگوں نے اس اصول کی قدر و قیمت کو گھٹا دیا ہے. جب کہ بعض کہتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس سے کہیں بڑھ کر ہے. اگر یہ ایک معمولی سا مسئلہ ہو تو پھر ضرر کے احتمال کے ساتھ ہی اس کا وجوب ختم ہو جائے گا. لیکن اگر کسی جگہ پر قرآن، عدالت اور وحدت اسلامی خطرے سے دوچار ہوں تو اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں یہاں امر بالمعروف نہیں

کروں گا چونکہ میری جان کو خطرہ ہے یا میری عزت کو خطرہ ہے
یا لوگ اسے پسند نہیں کرتے"

پس معلوم ہوا کہ اہم بڑے مسائل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کوئی حد نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے خطرات ونقصانات کے باوجود یہ وظیفہ واجب ہوگا. اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ سیدالشہداء کی تحریک نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی قدر وقیمت انتہائی عظیم مرتبے پر ثابت کردی. آپ نے نہ صرف اپنی جان اس راہ میں قربان کردی، اپنے عزیزوں کی قربانیاں بھی پیش کردی بلکہ اپنے اہل بیت کی قید پر بھی اس راہ میں راضی ہوگئے. امام پاکؑ کے اس عمل سے ثابت ہوگیا کہ اہم مسائل میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر قسم کے خطرے کے باجود واجب ہوگا.

سوال ۱۷ : شرعی تکالیف کی عمومی شرائط میں سے ایک شرط قدرت ھے اور اھل بیت عصمت و طھارت کی روایات میں بیان ہوا ھے کہ یہ فریضہ صرف ان لوگوں کی ذمہ داری ھے کہ جو اس کی قدرت رکھتے ھوں جب کہ امام حسینؑ اپنی نھضت و قیام میں لوگوں کی جھالت، بے دینی اورعافیت طلبی وغیرہ جیسے عناصر کی وجہ سے ان کی حمایت و مدد سے محروم تھے اور آپ اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ ایک مقتدر و مسلح حکومت کو نھیں گرا سکتے تھے تو پھر آپ نے کیونکر مسلح قیام کیا اور امر بالمعروف و نھی عن المنکر پر اقدام کیا؟

جواب : شہید مطہری اس بارے میں فرماتے ہیں:

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ایک اور شرط قدرت ذکر کی گئی ہے انما یجب علی القوی المطلع.(۱)

---

(۱) فروع کافی، ج۵،ص۵۹

"کمزور ناتواں شخص کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اپنی قدرت کو محفوظ رکھتے ہوئے نتیجہ حاصل کرے، جہاں طاقت خرچ ہو وہاں ایسا قدم نہ اٹھائے"

یہاں بھی بعض سے ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ میں فلاں کام کی قدرت نہیں رکھتا اور اسلام بھی کہتا ہے اگر تم میں قدرت نہیں ہے تو نہ کرو، پس مجھ سے تکلیف ساقط ہے، ایسے لوگوں کے لئے جواب یہ ہے کہ اسلام کہتا ہے کہ جاؤ قدرت حاصل کرو یعنی قدرت شرط وجود ہے جس کی تحصیل ضروری ہوتی ہے جیسا کہ وضوء نماز کے وجود کی شرط ہے نہ کہ قدرت شرط وجوب ہے کہ جس کی تحصیل ضروری نہیں ہوتی جیسے استطاعت وجوب حج کی شرط ہے.

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے تو قدرت کی تحصیل اس حد تک واجب واہم ہے کہ کبھی حرام کام بھی واجب ہو جاتا ہے مثلاً خلفاء جور سے کوئی عہدہ لینا اور ان کی حکومت میں خدمت کرنا حرام ہے. لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس عہدے کے ذریعے آپ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر قدرت حاصل کر سکتے ہیں تو آپ پر اس عہدے کو لینا واجب ہے اور تاریخ اسلام میں ایسے اشخاص موجود ہیں جنہوں نے ائمہ معصومینؑ کے حکم سے حکومت جور میں عہدے لئے تاکہ ایسی قدرت حاصل کر سکیں.

بعض کے نزدیک قدرت شرط وجوب ہے کہ اگر خود بخود قدرت حاصل ہو جائے تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے ورنہ واجب نہیں. ان کے جواب میں عرض کریں گے کہ دیکھیں اسلام کی نظر میں اس فریضہ کی کتنی اہمیت ہے؟

اس اصول کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اسے بقائے اسلام کا ضامن قرار دیا گیا ہے اور اس کی خاطر امام حسینؑ اور ان کے ساتھی شہید ہو جاتے ہیں اور اہل بیت عصمت و طہارت کی مستورات قید ہو جاتی ہیں، ایک روایت میں آخری زمانے کے بعض لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

لا جبون امر ا بالمعر و ف ونهى عن المنكر الا اذ ا امنوا الضر ر.

''لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف اس وقت واجب قرار دیتے ہیں جب انہیں کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو'' (۱)

دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

ان الا مربا لمعروف وا لنهی ون المنکر سبیل الا نبیا منهاج الصلحاء بها تقا م الفرایض وتا من المذا هب و تعمر الارض وینتصف من الا عداء. (۲)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر انبیاء کا راستہ ہے صالحین کا شیوہ ہے اس سے فریضے قائم ہوتے ہیں، راستے پُر امن ہوتے ہیں زمین آباد کی جاتی ہے اور دشمنوں سے حقوق حاصل کیے جاتے ہیں''

جس فریضہ کی اتنی زیادہ اہمیت ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ اگر اتفاقاً اس کی قدرت تم میں موجود ہو تو اسے انجام دو ورنہ ضرورت نہیں ہے. اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اگر اتفاقاً تم اپنے آپ میں یہ قدرت پاؤ کہ اسلام کی حفاظت کر سکتے ہو تو کرنا ورنہ اگر دیکھو کہ ایسا نہیں کر سکتے تو ضرورت نہیں ہے. احتمال تاثیر والی شرط کے بارے میں بھی یہی کہیں گے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ احتمال تاثیر موجود نہیں ہے لہٰذا یہ تکلیف ساقط ہے. (۳) احتمال تاثیر کے حوالے سے صحیح طریقہ کار دیکھنا ہو تو واقعہ عاشورہ میں دیکھیں کہ اہل بیتؑ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو بھی اختتام کار نہیں سمجھتے بلکہ ابن

---

(۱) فروع کافی، ج۵، ص۵۵

(۲) حوالہ سابق

(۳) حماسہ حسینی، ج۱، ص۳۱۲_۳۰۲

زیاد و یزید کے درباروں میں اس حسینی مقصد وہدف کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یعنی ان کی نظر میں شہادت امام حسینؑ ایک لحاظ سے اس تحریک کا نقطہ آغاز تھی نہ کہ اختتام.

سوال ۱۸: امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب کی ایک شرط احتمال تاثیر ہے اور یہ چیز امام حسینؑ کی نہضت میں موجود نہیں تھی، کیونکہ معلوم تھا کہ یزید اور یزیدی نہ حکومت کو چھوڑیں گے اور نہ اپنی روش کو چھوڑیں گے پس امام حسینؑ نے کس شرعی دلیل و حجت کے ساتھ اس کام پر اقدام کیا اور اس کام کو اپنا ایک مقدس و واجب وظیفہ شمار کیا؟

جواب: جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی شرائط، خصوصیات اور احکام ہمیں امام حسینؑ سے سیکھنے چاہئیں، جس عمل کے جواز کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ امام حسینؑ نے اسے انجام دیا ہے، امامؑ کا عمل وگفتار احکام شرعی کی دلیل ہوتے ہیں.

دوسری طرف سے احتمال تاثیر دو طرح کا ہوتا ہے، ایک دفعہ ایک شخص معصیت و گناہ انجام دے رہا ہے اسے نہی عن المنکر کرنا چاہتے ہیں. اس میں اگر تاثیر کا احتمال نہ دیں تو اسے نہی از منکر کرنا واجب نہیں ہے لیکن کبھی نہی عن المنکر کی تاثیر کا احتمال فی الحال تو نہیں ہوتا لیکن یہ ہمیں علم ہے کہ مستقبل میں اس پر اثر واقع ہو جائے گا تو اس صورت میں نہی عن المنکر واجب ہے یہ ویسے ہی واجب ہے جیسے فی الحال احتمال تاثیر ہو تو واجب ہوتا ہے.

. مثلاً اگر ہم احتمال دیں کہ اگر گمراہ فرقوں میں سے کسی ایک سے یا گناہ وفساد پھیلانے والے مرکز سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کے نقصانات، برے اثرات اور برے مقاصد لوگوں میں بیان کئے جائیں تو کچھ مدت کے بعد یہ مراکز بند ہو سکتے ہیں اور معاشرے میں ان کے فساد میں کمی کی جا سکتی ہے یا کم از کم ان کے فساد کو پھیلنے سے روکا

جا سکتا ہے، اگر ان کے کارندے اپنی حرکتوں سے ہاتھ نہ ہی کھینچیں تو کم از کم ہمارے نہی عن المنکر کی وجہ سے ان کا منفی پروپیگنڈا مزید گمراہی کا باعث تو نہیں بن سکے گا. اس مورد میں جب کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تاثیر احتمال مستقبل میں موجود ہے تو یہ وظیفہ واجب ہوگا، آج کی دنیا میں بھی جن اقوام نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی و استقلال حاصل کیا ہے انہوں نے یہی راستہ منتخب کیا، انہوں نے قربانیاں دی، سختیاں جھیلی اور جذبات کو ابھارا، اس کے باوجود دشمن کو عمومی نظروں میں شرمسار کیا، ان کے قبضے اور تسلط کی بنیادیں کمزور کرتے ہوئے بالآخر تدریجاً اسے ختم کر دیا، ان مبارزوں میں جس نے پرچم ہاتھ میں اٹھا لیا وہ کامیاب ہوگیا، ان کی قربانی کی قیمت ان کی ملت کی آزادی اور غیروں کے قبضے سے چھٹکارے کی صورت میں حاصل ہوئی، ان کی اس جنگ کا نتیجہ اگرچہ مستقبل میں حاصل ہونے والا تھا لیکن یہ کامیابی و سرخروئی کی جنگ شمار کی جاتی ہے، کیونکہ ان کا ہدف حکومت و اقتدار نہیں بلکہ ملت کی اصلاح و نجات ہوتا ہے، خدا والے بھی اپنے الٰہی انسانی بلند اہداف کی خاطر کبھی ایسے مبارزات کے لئے اٹھتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ جانتے ہیں دشمنان خدا انہیں قتل کر کے ان کے سر نیزوں پر اٹھالیں گے، لیکن پھر بھی وہ اسلام و توحید کی نجات کے لئے جنگ و جہاد کرتے ہیں تا کہ ان کے قیام کی وجہ سے لوگوں میں آہستہ آہستہ بیداری پیدا ہو اور تاریخ کا رخ موڑا جا سکے.

اُس دور میں جو صورتحال پیش آچکی تھی اس میں احکام قرآن اور وجود اسلام کو بڑے سخت خطرات کا سامنا تھا، جن سے اسلام کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا، یہاں تک کہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ عنقریب اسلام کا سورج ڈوب جائے گا اور شرک و جاہلیت دوبارہ لوٹ آئے گی، اب کیا امام حسینؑ صرف احتمال ضرر یا حتیٰ یقینی ضرر کے پیش نظر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر بیٹھ جاتے اور اسلام کو یوں غروب ہوتا دیکھتے رہتے. ان سب عوامل کے علاوہ شرط احتمال تاثیر موجود تھی، بلکہ امام حسین علیہ السلام کو تاثیر کا یقین تھا، آپ کو علم تھا کہ آپ کی

نہضت وقیام اسلام کو مکمل محفوظ کر کے اس کی بقائے کلی کا ضامن بن جائے گا. آپ جانتے تھے کہ اگر بنی امیہ آپ جیسی ہستی (جو کہ نواسہ رسول، لوگوں کی اسلامی و معنوی امنگوں کے ترجمان اور معاشرہ کے انتہائی پاکیزہ و معزز و محترم افراد میں ہیں) کو قتل کر دیں تو پھر ان کا اقتدار بھی مستحکم نہیں رہ سکے گا، لوگوں کی شدید نفرت اور غیظ و غضب کا ایک سیلاب ان کی طرف بہہ نکلے گا جس سے بچنے کے لئے انہیں دفاعی حالت اختیار کرنا ہوگی تا کہ چند دن اپنی منحوس حکومت کے لرزتے ہوئے ستونوں کو مزید کھڑا کر سکیں.

سید الشہداء جانتے تھے کہ آپ کی شہادت اور خاندان اہل بیت کی اسارت سے لوگوں پر بنی امیہ کی اسلام اور رسول اکرمؐ کے ساتھ دشمنی اور ان کی حکومت کی حقیقت و ماہیت روشن ہو جائے گی اور آپ کی شہادت کا ردعمل یہ ہوگا کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہوں گی، امویوں کے سامنے سرکشی و نافرمانی کی جرات ان میں پیدا ہوگی اور لوگوں کا دینی شعور اور اسلامی احساس بیدار ہوگا.

امام حسینؑ جانتے تھے کہ بنی امیہ جب آپ کو شہید کریں گے تو ان کی حکومت بدنام ہو جائے گی اور لوگوں پر ان کی حکومت کا غلط راستہ روشن ہو جائے گا اور یہ بات تو واضح ہے کہ جو حکومت دین اور خاندان رسالت کی دشمن ہو تو اگرچہ لوگوں پر کچھ مدت تک فرمانروائی کر سکتی ہے لیکن اسلامی خلافت کے عنوان سے مزید حکومت نہیں کر پائے گی.

واقعہ کربلا نے مسلم دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا، یہ ایسے ہی تھا جیسے خود رسول اکرمؐ کو شہید کر دیا گیا ہو، تمام شہروں میں اموی حکومت کے خلاف لوگوں کے غم و غصہ سے بھرپور جذبات ابھرتے چلے گئے اور پے در پے تحریکوں کا آغاز ہونا شروع ہو گیا یہاں تک جو حکومت اسلام کے نام سے کفر و شرک کی ترویج کر رہی تھی گر گئی اور اہل بیتؑ کے پاک خون کا صلہ یہ ملا کہ اسلام نجات پا گیا اور لوگوں کے دلوں میں بنی امیہ کے خلاف ایک دینی جذبہ بیدار ہو گیا.

پس معلوم ہوگیا کہ امام حسینؑ کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر شرعی وفقہی لحاظ سے بھی واجب تھا اور امام پاکؑ نے اس فریضہ کی ادائیگی کی خاطر اپنی اور اپنے عزیز ترین اور لائق ترین جوانوں اور ساتھیوں کی جانیں بھی قربان کر دیں اور سب کو عظیم اسلامی مقاصد پر قربان کر دیا، باوجود اس کے کہ آپ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے لیکن آپ نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دین اور ہدف کا دفاع کیا۔

یہاں پر شہید مطہری کی بات کی طرف اشارہ کر دینا زیادہ مناسب ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک اور شرط احتمال تاثیر ہے یعنی یہ فریضہ نماز وروزہ کی طرح صرف تعبدی نہیں ہے مثلاً ہمیں حکم ہے کہ ہر حال میں نماز پڑھو، اب یہ سوال نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کیا میرا نماز پڑھنا اثر رکھتا ہے یا نہیں، لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو حکمت عملی کے ساتھ انجام دینا ضروری ہے یعنی فائدہ کو مدنظر رکھیں، فائدہ خرچ سے زیادہ ہونا چاہیے، یہ نظریہ خوارج کے نظریے کے برعکس ہے وہ کہتے تھے کہ حتیٰ اگر ذرہ برابر بھی تاثیر کا احتمال نہ ہو تب بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہیے۔ بعض نے خوارج کی نابودی کی وجہ اسی چیز کو قرار دیا ہے، تشیع میں تقیہ کا حکم جو آیا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں حکمت عملی ضروری ہے، تقیہ کے لغوی معنی دفاعی اسلحہ سے استفادہ کے ہیں، یعنی جنگ میں ضرب لگاؤ لیکن کوشش کرو کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے، احتمال تاثیر کے یہ معنی قطعاً نہیں کہ آپ گھر میں بیٹھ جائیں اور

کہیں کہ میں احتمال تاثیر دیتا ہوں یا نہیں دیتا ہوں بلکہ آپ پر
لازم ہے کہ جا کر تحقیق کریں اور دیکھیں کہ آیا فائدہ ہوتا ہے یا
نہیں، بغیر تحقیق کے یہ بات قابل قبول نہیں ہوگی''

یزید کی بیعت نہ کرنا

سوال ۱۹ :امام حسینؑ کس دلیل و منطق کی بنیاد پر یزید کی بیعت پر حتیٰ کہ مصلحت کی خاطر بھی راضی نہ ہوئے؟

جواب : پہلے یہ دیکھا جائے کہ ہر تاریخی فیصلہ سخت بحرانی حالات میں خاص علل و اسباب کے پیش نظر کیا جاتا ہے کہ جہاں طرفین پہلے سے ایسی صورتحال کا اندازہ رکھتے ہوں سنت نبویؐ اور عدالت علوی سے انحراف کا زاویہ پہلے سے ہی شروع ہو چکا تھا، لیکن ظاہری فریب و دھوکہ دہی کے ساتھ معاملات آگے بڑھ رہے تھے، اہل بیتؑ اور پاک طینت صحابہ جیسے سلمان، ابوذر و عمار وغیرہ ہر مناسب موقع پر لوگوں پر حق کا اظہار کر کے انہیں آگاہ کرتے رہتے تھے، لیکن تاریخ ایک ایسے موڑ پہنچتی ہے کہ اب فریقین سمجھتے ہیں کہ آخری بات کر کے معاملہ نمٹا دیا جائے، معاویہ کی موت اور یزید کی تخت نشینی کے ساتھ وہ موقع آن پہنچا، ایک طرف یزید نے ہر چیز کا انکار کرتے ہوئے کہا:

لعبت هاشم بالملک فلا خبر جاء ولا حواله سابق نزل(۱)

''بنی ہاشم نے حکومت کا ڈھونگ رچایا ورنہ آسمان سے نہ کوئی
خبر آئی نہ وحی اتری''

یزید نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ دھمکی یا قتل و کشتار کے ذریعے کسی کو اپنے خلاف کوئی فعالیت نہیں کرنے دے گا، اس طرح وہ مرگ معاویہ کی خبر عام ہونے سے پہلے پہلے امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر سے بیعت لے لینا چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ قتل

---

(۱) مقتل خوارزمی، ج۲،ص۵۸، تذکرہ الخواص، ص۲۶۱

کی دھمکی تک چلا گیا، ایسی صورتحال میں امام حسین علیہ السلام کو بھی اپنا قطعی فیصلہ کرنا تھا، آپ کی مہارت یہ تھی کہ کوفیوں کی دعوت کے جواب میں اپنی حقانیت کا انتہائی عقلمندی سے اظہار کریں اس طرح کہ سب پر اتمام حجت ہو جائے اور آپ نے اپنی تحریک و قیام میں مظلومیت کا عنصر بھی شامل کیا تا کہ رہتی دنیا تک ظالموں کا چہرہ قابل نفرت رہے اور اس نفرت میں نہ کبھی کمی آئے اور نہ ختم ہونے پائے لہٰذا یہ رنگ صرف شہادت و اسارت ہی سے بقاودوام پاسکا۔

امام حسینؑ جنہوں نے بیت وحی میں تربیت پائی اور خود ترجمان وحی تھے، سمجھتے تھے کہ امت اسلام کی امامت و رہبریت کے لئے ایسی صلاحیتیں درکار ہیں جو یزید اور یزید جیسوں میں نہیں پائی جاتیں آپ فرماتے ہیں:

ما الامام الا العامل بالکتاب والقائم بالقسط بدین الحق والحابس نفسہ علی ذات اللّٰہ

''امام نہیں ہوسکتا مگر وہ جو کتاب خدا کے مطابق حکم کرے، عدالت کو برپا کرے دین حق کا پابند ہو اور اپنے آپ کو ذات خدا کے لئے وقف کردے''

جب ولید بن عتبہ نے امام حسین علیہ السلام کو دارالامارہ آنے کی دعوت دی اور آپ کو مرگ معاویہ کی خبر دی اور پھر یزید نے اسے بیعت لینے کے حوالے سے جو خط لکھا امام کو پڑھ کر سنایا۔(۱) تو امام پاکؑ نے جواب میں فرمایا:

''اگر میں یہاں خلوت میں پوشیدہ بیعت کرلوں تو یہ تمہارے لئے کافی نہیں ہوگا، تم چاہو گے کہ میں علی الاعلان بیعت کروں تا کہ

---

(۱) تاریخی یعقوبی اور مقتل خوارزمی میں ہے کہ یزید نے صریحاً ولید کو لکھا تھا اگر حسین اور ابن زبیر بیعت نہ کریں تو انہیں قتل کردو اور ان کے سر میرے پاس بھیجو (تاریخ یعقوبی، ج۲ص۱۵مقتل خوارزمی، ج۱ص۱۸۰)

سب لوگوں کو پتہ چل جائے''

تو ولید نے کہا ہاں یہی بات ہے تو آپ نے فرمایا:

''صبح تک صبر کرو دیکھیں صبح کیا ہوتا ہے''

مروان جو کہ وہاں موجود تھا اس نے ولید سے کہا اب اگر حسین بیعت کیے بغیر یہاں سے چلے گئے تو پھر تم ان پر قابو نہیں پا سکو گے، لہٰذا انہیں یہیں روک لو اور یہاں سے بغیر بیعت کے نہ جانے دو، اگر بیعت نہ کریں تو انہیں قتل کر دو. امام حسینؑ نے فرمایا:

''اے زرقا کے بیٹے کس میں جرأت ہے کہ مجھے قتل کرے تم یا یہ، تم نے جھوٹ بولا ہے اور پستی کا مظاہرہ کیا ہے پھر آپ نے ولید کو مخاطب قرار دیتے ہوئے فرمایا: اے امیر ہم نبوت کا خاندان، رسالت کی کان، فرشتوں کی آمد و رفت کی جگہ اور نزول رحمت خدا کا محل ہیں، خداوند نے ہمارے ذریعے ابتداء فرمائی اور ہم ہی پر اختتام فرمائے گا اور یزید ایک فاسق، فاجر، شرابخور، بے گناہوں کا قاتل اور علی الاعلان فسق و فجور کرنے والا شخص ہے، مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا. کل صبح دیکھیں گے کہ ہم میں سے کون بیعت و خلافت کا زیادہ حقدار ہے''

جب امام حسینؑ وہاں سے چلے آئے تو مروان نے ولید سے کہا تم نے میری بات نہیں مانی اب خدا کی قسم کبھی تمہیں دوبارہ ایسا موقع نہیں ملے گا، ولید نے اس سے کہا:

''تم پر بڑا افسوس ہے تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ اپنا دین و دنیا تباہ کر لوں، خدا کی قسم حسینؑ کے قتل کے بدلے پوری دنیا بھی مجھے مل جائے تو یہ کام نہیں کرنا چاہتا، عجیب ہے میں حسینؑ کو صرف اس وجہ سے قتل کر دوں کہ وہ کہتے ہیں میں یزید کی بیعت

نہیں کرتا، خدا کی قسم اگر کوئی خون حسینؑ کے ساتھ خدا سے
ملاقات کرے گا تو اس کا میزان عمل سبک ہوگا اور خدا قیامت
کے دن پر اس پر نظر نہیں کرے گا، رحمت خدا اس کے شامل حال
نہیں ہوگی اور اس کے لئے دردناک عذاب ہے"(۱)

تاریخ کا یہ حصہ امام حسینؑ کے قیام کے اسباب، ہدف و مبداء کے تعین اور آپ کے بیعت نہ کرنے کی وجوہ جاننے کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ آپ نے ایسی کئی چیزیں ذکر فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک بیعت کے انکار اور قیام کے وجوب کے لئے کافی ہے۔

امام حسینؑ نے جن موارد کو انکار بیعت اور مخالفت پر قیام کی وجوہ کے طور پر ذکر فرمایا ہے یہ ایسے امور تھے جن کی صحت کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور ان کا مسلّم ہونا سب کے نزدیک واضح و روشن تھا، حتیٰ کہ یزید کے چچازاد حاکم مدینہ ولید نے بھی ان باتوں کا انکار نہ کیا اور امام پاک علیہ السلام کی منطق، استدلال اور مدلل گفتگو کے سامنے کچھ کہہ نہ سکا۔

حضرت نے جو گفتگو فرمائی اس میں یہ جملہ "مثلی لا یبایع مثلہ" امام کی ممتاز بے نظیر شخصیت کے ساتھ ساتھ یزید کی پست زندگی پر بھی مکمل روشنی ڈالتا ہے کہ فرمایا مجھ (حسین) جیسا جس کا ماضی اتنا تابناک ہے اور آج اس معاشرے میں مجھ سے زیادہ کوئی بھی مستحق رہبریت نہیں ہے، یزید جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ جو عظیم المرتبہ اسلامی اہداف کو پورا کرنے کے لئے مرکز نگاہ ہے، مسلمانوں کی عظمت و عزت کا منبع و مصدر ہے، کلمہ اسلام کی بلندی کا ذریعہ ہے، قرآن و امر بالمعروف کا حامی ہے برائی و منکر سے روکنے والا ہے یعنی وہ رسولؐ خدا کا قائم مقام و جانشین ہے اس کی اطاعت و

---

(۱) سمو المعنی، ص ۱۱۳، ۱۱۴، مقتل خوارزمی، ص ۱۸۴، باب ۹

فرمانبرداری کا عہدو پیمان بیعت کہلاتا ہے.

بیعت کے صحیح معنی یہ ہیں کہ میں حقیقی وواقعی خلیفہ کے اوامر کا فرمانبردار و پابند رہوں گا اور اس کے احکام کی انجام دہی کے لئے ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار رہوں گا، یہی اطیعو اللّٰہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم کا تقاضا ہے. یزید کی اس طرح کی بیعت اگرچہ صرف ظاہری اور دفع ضرر ہی کی خاطر کیوں نہ ہو یہ ہر طرح کے فسق وفجور، علی الاعلان شرابخوری وگناہ اور حقوق کی پامالی کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنا اور فاسق وفاجر اور ظالم افراد پر اظہار اعتماد شمار ہوگی اور امام حسینؑ جیسی شخصیت سے اس عمل کا سرزد ہونا نہ شرعی طور پر ممکن تھا اور نہ عرفی طور پر.

اس بیعت کا مطلب یہ ہے کہ بے گناہوں کے قتل اور اسلام کی عزت وآبرو کو بازیچہ بنانے میں، میں ہر طرح سے آپ کی معاونت کرنے پر تیار ہوں. امام حسینؑ کا مقدس و پاک دامن اس پست بیعت کے داغ سے کبھی آلودہ نہیں ہوسکتا تھا اسی وجہ سے امام حسینؑ نے ایک بدیہی، مسلّم اور مورد اتفاق حکم کے طور پر فرمایا: مثلی لا یبایع مثلہ" کیونکہ کوئی باضمیر مسلمان قطعاً یہ بات نہ کہتا کہ امام حسینؑ کو یزید کی بیعت کرنی چاہیے.

حضرت امام حسینؑ نے اپنے درخشاں وتابناک ماضی، اپنی عظیم اسلامی شخصیت کا اور یزید کے گذشتہ کردار کا حوالہ دیتے ہوئے جو نتیجہ ذکر فرمایا وہ سب کے لئے قابل قبول تھا، ہاں اگر تمام مسلمان ذلت وپستی کو قبول کرتے ہوئے یزید جیسے کی بیعت کرلیں اور اس کی امارت پر راضی ہوجائیں تب بھی امام حسینؑ جو فضائل واخلاق اور عظیم مقامات کے مالک ہیں، اسلام اور قرآنی تعلیمات کی نجات کے لئے مسلمانوں اور اسلام کی امیدوں کا مرکز ہیں اس شخص کی بیعت کیسے کرسکتے ہیں جو شرارت، پلیدی، گناہ اور فسق وفجور کا مرکز ہے. امام حسین علیہ السلام کی بات سب سے الگ ہے، آپ اہل بیت نبوت، معدن رسالت

فرشتوں کی رفت و آمد کا مرکز، مہبط رحمت الٰہی اور امام حسن علیہ السلام کے بعد واحد نواسئہ رسول تھے، آپ نے مکہ سے کربلا جاتے ہوئے ایک منزل پر فرزدق سے فرمایا:

''ان لوگوں نے خدا کی اطاعت چھوڑ کر شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے، فساد کا اظہار کرتے ہیں، حدود خدا کا خیال نہیں رکھتے، شراب پیتے ہیں اور فقراء و مساکین کے اموال غصب کر چکے ہیں، اب دین، عزت، شرف کی مدد و نصرت اور کلمہ خدا کی سربلندی کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کی سب سے بڑی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے'' (۱)

جب بات یہاں تک پہنچ جائے کہ یزید جیسا شخص مسند رسول اکرمؐ پر بیٹھ کر اپنے آپ کو مسلمانوں اور پورے عالم اسلام کا دینی و سیاسی رہبر سمجھنے لگے تو پھر امام حق کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ خطرے کا اعلان کرے اور اس کی حکومت کو ناجائز حکومت کہتے ہوئے اس کے خلاف اعلان جنگ کرے، کیونکہ بڑے بڑے صحابہ و تابعین کا اس پلید فطرت شخص کی بیعت کر لینا لوگوں کی نظروں میں اس کی حکومت کی صحت و جواز پر مہر و تائید تھی جو حقیقی خلافت کی نابودی، اسلامی رہبریت و امامت کی تمام شرائط سے عدول اور معاشرے کو گمراہی و ضلالت کے سپرد کرنے کے مترادف تھا، مومنین کی گردنوں میں اس بیعت کی مثال اس طوق گردن اور زنجیروں والی تھی جس کا بوجھ ان کی روح پر پہاڑوں سے بھی زیادہ تھا۔

امام حسینؑ نے اس منطق کے ساتھ قیام کیا اور اس بات پر ڈٹے رہے اور فرمایا:

ما الامام الا العامل بالکتاب والقائم بالقسط والدائن بدین الحق والحابس نفسه علی ذات الله. (۲)

---

(۱) تذکرۃ الخواص، ص۲۵۲

(۲) تاریخ طبری، ج۴، ص۲۶۲

''امام نہیں ہو سکتا مگر وہ جو کتاب خدا کے مطابق حکم کرے، عدالت کو برپا کرے، دین حق کا پابند ہو اور اپنے آپ کو ذات خدا کے لئے وقف کر دے''

عاشورہ کے دن آپ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، آپ اس دن بھی اپنی اس منطق کا تکرار فرماتے ہیں:

اما واللّٰہ لا اجیبھم الی شئی مما یریدون حتیٰ القیٰ اللّٰہ وانا مخضب بدمی.(۱)

''خدا کی قسم جو مجھ سے یہ چاہتے ہیں (بیعت یزید) وہ میں ہرگز قبول نہیں کروں گا، یہاں تک کہ خدا سے ملاقات کرلوں اس حال میں کہ میری داڑھی میرے خون سے رنگین ہوگی''

امام حسینؑ کے دور کے اسلامی معاشرے کے بارے میں بہتر اور منصفانہ نظریہ کے لئے یہاں ہم ایک روشن فکر اہل سنت محقق جناب سید قطب (مصری انقلابی عالم ومفسر) کے نظریے کو پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''اموی حکومت اسلامی خلافت نہیں تھی، بلکہ ایک ظالم و استبدادی حکومت تھی جو وحی اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ جاہلیت کے افکار سے پُر تھی، یہ بات سمجھنے کے لئے کہ اموی حکومت کن بنیادوں پر استوار تھی، بیعت یزید کی کیفیت کو جان لینا ہی کافی ہے، معاویہ نے مختلف لوگوں کو بلا بلا کر یزید کی بیعت کے حوالے سے مشورہ کرنا شروع کیا۔ یزید بن مقفع نامی شخص نے معاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا آپ امیر المومنین

---

(۱) سمو المعنی، ص۱۱۸

> ہیں. پھر یزید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا معاویہ کے بعد امیر المومنین یہ ہے اور پھر کہا جو بھی یزید کو نہ مانے اس کے لئے تلوار ہے، معاویہ نے اس سے کہا تم بیٹھ جاؤ ماشاء اللہ تم بڑے پائے کے خطیب ہو"

اس کے بعد سید قطب ذکر کرتے ہیں کہ کیسے مکہ میں معاویہ نے یزید کی بیعت لینے کے لئے ہر طرح کے حربے جیسے زبردستی، دھونس، دھاندلی، دھوکہ و دھمکی سے استفادہ کیا.(۱) وہ یزید کی بعض کثافت کاریوں جیسے شراب خوری، زنا اور ترک نماز وغیرہ کو نقل کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں:

> "یزید کے سیاسی کارنامے جیسے قتل حسینؑ، خانہ کعبہ کا محاصرہ، اس پر سنگ باری، خانہ کعبہ کی تخریب اور اسے جلانا اور واقعہ حرہ سب شاھد ہیں کہ یزید کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس میں ذرا بھر مبالغہ نہیں ہے...... یزید کی خلافت کے لئے نامزدگی اسلام، اسلامی نظام اور اسلام کے اہداف و مقاصد پر بڑی کاری ضرب تھی.(۲)

معاویہ کے دور میں نظام حکومت دن بدن اسلامی روش سے دور ہوتا گیا اور حکومت کی ظاہری شکل وصورت میں عجیب تبدیلیاں وجود پذیر ہوگئیں اور معاویہ نے اس میں یزید کی ولی عہدی کی صورت میں آخری کیل ٹھونک دی اور جیسا کہ سید قطب نے لکھا ہے یہ قلب اسلام اور نظام اسلام پر بڑی کاری ضربت تھی لہٰذا امام حسینؑ پر (امام حق ہونے کے ناطے) اس کا ازالہ کرنا ضروری تھا اور اسلام کے پیکر پر وارد ہونے والے زخموں پر مرہم رکھنا ضروری تھا اور آپ پر لازم تھا کہ لوگوں کو مطلع کریں کہ یہ حکومت شرعی و اسلامی نہیں

(۱) العدالة الاجتماعية فی الاسلام، ص ۱۸۰ اور ۱۸۱

(۲) العدالة الاجتماعية فی الاسلام، ص ۱۸۱

ہے اور اسلامی حکومت کے ساتھ اس کی کوئی مشابہت نہیں ہے۔

امام پاکؑ نے اپنے قیام کے ساتھ دین و شریعت کی نظر حکومت یزید کے بارے میں لوگوں پر واضح کر دی، اگر امام خاموش رہتے یا یزید کی بیعت کر لیتے تو لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اسلامی نظام کے بارے شبہات جنم لیتے اور اسلام باقی نہ رہتا۔

امام غزالی (اہل سنت کے بہت بڑے عالم) اموی حکومت کے مفاسد کے بارے میں لکھتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ جو دھچکا اسلام کو بنی امیہ کے فتنوں سے لگا وہ اتنا زیادہ شدید تھا کہ اگر اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کو لگتا تو وہ مکمل نابود ہو جاتا اور اس کی بنیادیں تباہ ہو کر رہ جاتیں'' (۱)

یہ مختصر طور پر تذکرہ تھا ان نقصانات اور خطرات کا جو یزید اور اموی حکومت سے اسلامی حکومت کو اٹھانا پڑے اور جس نے اسلامی حکومت کو جو کہ اسلامی عدالت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی لوگوں کی نظروں میں ناپسندیدہ بنا دیا۔ اگر امام حسینؑ اسلام کی مدد کو نہ اٹھتے اور حکومت کو اسلامی حاکمیت سے جدا نہ کرتے تو اسلام کے دامن پر ہمیشہ ننگ و عار کے دھبے رہ جاتے اور عدالت اور دین کا ممتاز حکومتی نظام مکمل طور پر پامال ہو جاتا۔

یزید کی حکومت کے خطرات

سوال ۲۰ : ولید نے جب امام حسینؑ سے یزید کی بیعت طلب کی تو امامؑ نے ﴿انا للّٰہ وانا الیہ راجعون﴾ پڑھا، اس کا مطلب کیا تھا، کیوں امام پاکؑ نے فرمایا کہ یزید کی حاکمیت کی صورت میں اسلام کا فاتحہ پڑھ دیا جائے؟

جواب : امام حسینؑ نے جس خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے یہ کلمہ استرجاع کہلاتا ہے اور امام اس کے پڑھنے سے اس خطرے کو استرجاعی خطرہ کہہ سکتے ہیں اور یہ اس دور میں اسلام یا

---

(۱) الاسلام والاستبداد السیاسی، ص ۱۸۷ اور ۱۸۸

اسلامی معاشروں کو پیش آنے والے خطرات میں سے سب سے اہم اور سب سے زیادہ تباہ کن خطرہ تھا. اس ارتجاعی دیو کا مطلب جاہلیت، بت پرستی اور شرک کے دور کی طرف لوٹنا تھا اور آہستہ آہستہ اس کا یہ منحوس وخوفناک چہرہ نمایاں ہوتا جارہا تھا، بنی امیہ کے اسلامی معاشرہ کی دینی اقدار کو مٹانے، اسلامی نظام کو ختم کرنے اور دینی شعائر کی تحقیر جیسے خطرناک عزائم، دھونس وزبردستی کے ذریعے نافذ کیئے جارہے تھے. بڑے بڑے اسلامی شہر جہاں بڑی بڑی اسلامی شخصیات سکونت پذیر تھیں جیسے مکہ ومدینہ، کوفہ اور بصرہ سخت دباؤ کی صورت مرگ بار سکوت کا شکار تھے، زیاد، سمرہ اور مغیرہ جیسے اموی حکمرانوں کا ظلم و تشدد، بے گناہوں کا بے محابا قتل وکشتار، ماردھاڑ، مسلمانوں کی اہانت وتذلیل اور جعلی رپورٹوں نے لوگوں کو سخت خوف وہراس میں مبتلا کردیا تھا. اموی اسلامی معنویت کو ختم کر کے دین دار اور اسلامی آداب واقدار کے پابند افراد کو جنہیں معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا سرکوب ونابود کردینا چاہتے تھے.

علائلی لکھتے ہیں: اسلامی مفکرین کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ بنی امیہ جرثومہ فساد تھے اور جاہلی زندگی کی تمام رسوم وحدود کو زندہ کرنا ان کی طبیعت کا جزو لاینفک تھا(۱)

سبط ابن جوزی لکھتے ہیں: میرے جد نے کتاب التبصرہ میں لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ شریعت مٹائی جارہی ہے تو اس قوم کی طرف تشریف لے گئے تاکہ شریعت کی بنیادوں کو استوار کیا جاسکے.(۲)

اگر بنی امیہ کی خیانتوں کے لئے یزید کو کھلی چھٹی دے دی جاتی تو جیسا کہ معاویہ چاہتا تھا اذان اور توحید ورسالت کی گواہی ختم کردی جاتی اور اسلام کا نام تک باقی نہ رہتا اگر نام باقی رہتا تو بھی اسلام کا مطلب وہ طریقہ ہوتا جو یزید و بنی امیہ کی روش اور طریقہ تھا.

---

(۱) سمو المعنی، ص۲۸

(۲) تذکرہ الخواص، ص۲۸۳

اگر یزید کی خلافت کے خلاف اسلامی معاشرہ میں اتنا شدید ردعمل نہ ہوتا تو یزید کو جانشین رسول کے طور پر قبول کرلیا جاتا اور اسلامی مملکت بدکاری، فحاشی، رقص وغناء، شراب وکباب، اور سگ بازی وبندر بازی جیسے گناہوں کا مرکز بن کر رہ جاتی، کیوں کہ معاشرے اپنے امراء وسلاطین کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے کاموں کو اپنے لئے نمونہ عمل بناتے ہیں.

لہذا اسلام کی حفاظت اور ارتجاعی خطرہ جو یزید کی روش سے درپیش تھا سے دفاع کی خاطر ایسی تحریک ونہضت کی ضرورت تھی جس سے سب لوگوں پر واضح وروشن ہو جائے کہ اموی حکمران اسلامی اصولوں کو پامال کر رہے ہیں، اس خاطر لوگوں کے دینی جذبات ان کے خلاف ابھارنے کی ضرورت تھی تاکہ لوگ ان کی مخالفت میں شدت کا مظاہرہ کریں اور ان کے کرتوتوں اور کاموں سے آگاہ ہو کر انہیں اسلام کے دشمن اور خائن کے طور پر پہچان لیں، ان دو مقاصد کی خاطر سید الشہداء کا قیام ضروری تھا یعنی بنی امیہ کے کردار سے پردہ ہٹا کر ان کی اسلامی معاشرے میں پہچان کروانا اور لوگوں کے دینی جذبات کو ان کے خلاف ابھارنا اور لوگوں کی توجہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مبذول کروانا تاکہ اسلامی شعائر باقی رہ سکیں.

دشمن کی انتہائی سنگدلی بھی امام پاک علیہ السلام کو راہ خدا میں جہاد سے نہ روک سکی، کیونکہ آپ ایسے مجاہد تھے جس نے حکم خدا سے قیام شروع فرمایا، اب آپ کے لئے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ آپ کو ظاہری غلبہ حاصل ہو یا نہ ہو کیونکہ دونوں صورتیں آپ کے لئے شرف تھیں قرآن فرماتا ہے:

قل هل تربصون بنا لا احدى الحسنيين

"کہہ دو ہمارے بارے میں تم کس بات کے منتظر ہو سوائے دو اچھائیوں میں سے ایک کے یعنی شہادت اور کامیابی"

پس امام حسینؑ راہ خدا و راہ حق میں شہید ہوئے اور آپ کے قاتل، خدا، تمام ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت میں گرفتار ہو گئے اور آپ خداوند کے ہاں بلند ترین مرتبے پر فائز ہو گئے.(۱)

کربلا میں اتمام حجت

سوال ۲۱ : میدان کربلا میں اتمام حجت سے کیا مراد ہے ؟

جواب : نہضت عاشورہ میں امام حسینؑ کی کچھ تبلیغی روشیں ایسی تھیں جن کے ذریعے لوگوں کو حقیقت سے آگاہ کیا جا سکے، یہ روشیں جہاں نہضت عاشورہ کو تحریف وانحرافات سے بچا کر استمرار و دوام بخشنے کا باعث تھیں. وہاں اپنے چاہنے والوں کی دلی تقویت اور سپاہ کوفہ میں تزلزل ایجاد کرنے کا بھی باعث تھیں اور دشمن کے پروپیگنڈا کا توڑ بھی تھیں. ان روشوں میں سے ایک روش اتمام حجت کی روش تھی، امام حسینؑ نے اس روش سے دشمن کے لئے کسی عذر و بہانے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور لوگوں کے لئے حق کا ساتھ دینے کے سارے مقدمات فراہم کر دیئے تھے اور اتمام حجت کی یہ روش ناواقف لوگوں کو آپ کی دشمنی سے روکنے کا باعث بھی تھی، اتمام حجت کو ڈائیلاگ اور گفتگو کی ترویج کا ذریعہ شمار کیا جاتا ہے، یہ روش آپ نے اپنے نانا رسولؐ خدا اور بابا امیر المومنین علیہ السلام کی روش سے اپنائی تھی.

آپ دیکھ رہے تھے کہ دعوت، تبلیغ اور ارشاد و رہنمائی کی روش چھوڑ کر اس کی جگہ دھونس دھمکی کی روش کو اپنا لیا گیا ہے، لہٰذا آپ کی مسلسل یہ کوشش تھی کہ اپنے استدلال اور اتمام حجت کے ذریعے لوگوں پر گفتگو اور مذاکرے کے اصول کی اہمیت کو روشن کریں اور یہ اصول سنت حسنہ کے طور پر لوگوں میں باقی رہ جائے.

---

(۱) مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والشھداء والصالحین. (مجلۃ العدل شمارہ ۹ سال ۲)

آپ اپنے ایک اتمام حجت میں فرماتے ہیں:

''کیا میں دختر رسول اور سب سے پہلے اسلام لانے والے پسر عم رسول کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداء اور جعفر طیار میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا رسولؐ خدا کا یہ فرمان آپ لوگوں نے نہیں سنا کہ حسنؑ و حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں، اگر میری بات نہیں مانتے ہو تو تمہارے درمیان جابر بن عبداللہ انصاری، ابو سعید خدری، سھل بن سعد ساعدی، زید بن ارقم اور انس بن مالک موجود ہیں ان سے پوچھو، کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا کہ اس کا انتقام لینے کی خاطر میرے خلاف تم کھڑے ہو گئے ہو یا میں نے کسی کا مالی نقصان کیا ہے جو مجھ سے وصول کرنا چاہتے ہو یا میں نے کسی کو زخمی کیا ہے کہ اس کا قصاص مجھ سے لینا چاہتے ہیں؟

انہوں نے جواب میں کچھ نہ کہا تو امام نے فرمایا:

''اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث اور اے یزید بن حارث کیا تم لوگوں نے مجھے یہ خط نہیں لکھے تھے کہ پھل پک چکے ہیں اور باغات سبز ہو چکے ہیں آپ جلدی تشریف لے آئیں کہ آپ تیار لشکر کی طرف آئیں گے؟ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا کہ میں پست لوگوں کی بیعت کر لوں یا غلاموں کی طرح بھاگ جاؤں (۱)

امام حسینؑ نے اس بات سے ثابت کر دیا کہ منطقی گفتگو، اصول پسندی و سرفرازی

---

(۱) تاریخ طبری، ج ۵، ص ۴۲۷۔۴۲۳

سے کوئی منافات نہیں رکھتی، یہی سیرت آپ کے پیروکاروں میں بھی نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت عباسؑ، زہیر بن قین، اور حبیب ابن مظاہر نے مختلف موقع پر خونخوار دشمن سے گفتگو فرمائی اور ان پر حجت تمام کی۔

شہادت کا علم

سوال ۲۲ : کیا امام حسینؑ جانتے تھے کہ آپ شہید کر دیئے جائیں گے؟ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کیوں خود چل کر اپنی قتل گاہ (جائے شہادت) کی طرف تشریف لے گئے؟

جواب : شیعہ روایات واحادیث کی روشنی پر ائمہ اہل بیت علیہم السلام خداوند کی طرف سے علم غیب کے حامل تھے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احدا الا من ارتضیٰ من رسول۔

''خداوند غیب کا عالم ہے وہ اپنے غیب پر کسی ایک کو بھی مطلع نہیں کرتا مگر اپنے منتخب رسول کو''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ علم غیب خداوند کے ساتھ خاص ہے، کوئی ایک اس سے مطلع نہیں ہو سکتا مگر وہ رسول جسے خداوند خود منتخب فرمائے اور نیز دوسرے انسان بھی خدا اور رسول کی تعلیم کی ذریعے علم غیب سے مطلع ہو سکتے ہیں۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائی صاحب تفسیر المیزان اس بارے میں فرماتے ہیں:

شیعہ عقیدے کے مطابق امام حسینؑ، رسولؐ خدا کے جانشینوں میں سے تیسرے جانشین تھے اور صاحب وِلایت کلیہ تھے، امام علیہ السلام کا علم اشیاء وحوادث کے بارے عقلی ونقلی ادلہ کے مطابق دو قسم پر ہے۔

قسم اوّل :

امامؑ ہر حال میں اذن خدا کے ساتھ اس کائنات کی حقیقتوں کا عالم ہونا چاہیے ان

حقائق کا تعلق عالم محسوس ہو یا عالم محسوس سے ماوراء ہو جیسے آسمانی موجودات اور مستقبل میں پیش آنے والے حالات وواقعات ۔

دوسری قسم :عام عادی علم ہے، پیغمبر وامام بھی دوسرے افراد کی طرح عادی علم کے مجری میں قرار پاتے ہیں اور جو مناسب سمجھتے ہیں وہ انجام دیتے ہیں. توجہ کرنی چاہیے کہ حوادث کے بارے میں امام کا قطعی و ناقابل تغیر وتبدل علم جبر کا موجب نہیں ہوگا، جیسا کہ خداوند کا علم انسان کے افعال کے بارے میں جبر کا باعث نہیں بنتا، کیونکہ خداوند کی مشیت انسان کے اختیاری افعال کے متعلق ہوئی ہے یعنی خداوند علم رکھتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دیتا ہے.

امام حسینؑ کے بارے میں متواتر روایات کے ساتھ ثابت ہے کہ رسولؐ خدا اور امیر المومنین علیہ السلام نے آپ کی شہادت کی خبر دے رکھی تھی اور یہ روایات تاریخ و حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں، صحابہ، رسولؐ اور رسولؐ خدا کے اقرباء ان روایات کو سن چکے تھے، (کچھ بلاواسطہ اور کچھ بالواسطہ)

اسی طرح جب امام حسینؑ نے مدینہ سے مکہ کی طرف اور پھر مکہ سے عراق کی طرف سفر کا عزم فرمایا تو بڑی بڑی اسلامی شخصیات نے سخت فکر مندی کا اظہار کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شہادت امام حسینؑ کے بارے میں رسولؐ خدا کی روایات کو سن چکے تھے نیز بنی امیہ کے اسلامی ممالک پر تسلط کی وجہ سے اس دور کے حالات اور بنی امیہ کے ظلم واستبداد کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں خوف و مایوسی کے چھا جانے کی وجہ سے وہ اموی حکومت کے خلاف مبارزہ ومقابلہ سے مایوس ہو چکے تھے، نیز حضرت امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ کے دوادوار میں کوفیوں کے سابقہ کردار کو دیکھتے ہوئے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ آپ اپنی موت وشہادت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں، اس کے برخلاف نتائج کی توقع نہ ہونے کے برابر تھی.

امام حسینؑ نے اپنی شہادت کی خبر تو تسلسل کے ساتھ دی، لیکن کسی کو یزید کے حکومت سے ہٹائے جانے اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے حوالے سے کوئی خبر نہیں دی، البتہ سب کو ان کی یہ شرعی ذمہ داری ضرور بتلائی کہ آپ کا ساتھ دیں اور یزید کی بیعت واطاعت سے پرہیز کریں بلکہ اس کے خلاف قیام وانقلاب برپا کریں. اگرچہ آپ جانتے تھے کہ ایسا انقلاب قطعاً برپا نہیں ہوگا بلکہ آپ خود اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ شہید کر دیئے جائیں گے، لہٰذا آپ اپنی شہادت کی خبر لوگوں کو دیتے رہے، بھی تو ان کے جواب میں جو آپ کو عراق سے روکنا چاہتے تھے آپ نے فرمایا:

> میں نے نانا رسولؐ خدا کو خواب میں دیکھا ہے جس میں آپ نے مجھے اس سفر کا حکم دیا ہے جس پر عمل کرنا میرے اوپر لازم ہے.(١)

کشف الغمہ میں امام زین العابدینؑ سے نقل ہوا ہے کہ ہم جس منزل پر بھی اترتے اور وہاں سے روانہ ہوتے تو میرے بابا حضرت یحیٰؑ بن زکریا علیہ السلام کی شہادت کا تذکرہ کرتے، ایک دن فرمایا: ''زمانے کی ستم ظریفی دیکھیں کہ یحیٰؑ علیہ السلام کے سر اقدس کو کاٹ کر بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کو تحفہ کے طور پر بھیجا گیا.(٢) پس قطعی اسنادو مدارک سے ثابت ہے کہ امام حسینؑ اپنی شہادت اور ظاہری کامیابی کے حاصل نہ ہونے سے مکمل طور پر آگاہ تھے اور آپ کے قیام کا مقصد یزیدی حکومت کو باطل اعلان کرنے، دین کا احیاء کرنے، فکری انحرافات وشبہات کو دور کرنے اور یزیدی حکومت کی طرف سے اسلام پر پڑنے والی ضربتوں سے اسلام کو نجات دلانے کی خاطر تھا.

یہ امام حسینؑ ہی کا کام تھا کہ آپ نے کوفیوں کی دعوت کا مثبت جواب دیتے ہوئے اپنی حقانیت کو اس طرح تدبیر ومعقولیت کے ساتھ اجاگر کیا کہ سب پر آپ کی طرف سے

---

(١) تاریخ طبری، ج٤ ص٢٩٢، الحسن و الحسین سبطا رسو ل اللہ،ص٩١،٩٢

حجت تمام ہوگئی۔ آپ کی نہضت میں مظلومیت کا عنصر شامل ہوگیا جس سے ظالموں کے چہرے قیامت تک کے لئے نفرت آمیز ہو گئے اور آپ کی نہضت کو دوام تب ہی حاصل ہو سکتا تھا کہ اس میں الٰہی رنگ موجود ہوتا جو کہ آپ کی شہادت اور بہنوں، بیٹیوں کی اسارت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

نفس کو ہلاکت میں ڈالنا

سوال ۲۳ : اگر انسان کا مقصد قتل ہو جانا، مظلوم بننا اور اہل و عیال کا قیدی بنا لیا جانا ہو تو یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہے جو کہ قرآن کی نظر میں ﴿ولاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ﴾ (بقرہ ۱۹۵) جائز نہیں ہے، بنا بریں کیسے امام علیہ السلام قتل وشہادت کی خاطر نکلے اور آپ نے اپنے اختیار کے ساتھ اس کے مقدمات فراہم کیے؟

جواب : ۱) القاء نفس در التھلکۃ یا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یعنی اپنے آپ کو اپنے اختیار کے ساتھ موت کے سپرد کرنا ان عناوین میں سے ہے جن پر کبھی حرمت کا حکم لاگو ہوتا ہے اور کبھی وجوب کا، یوں نہیں ہے کہ ہمیشہ یہ موضوع حرمت ہو بلکہ بعض حالات میں واجب ہو جاتا ہے۔ بالفرض اگر آیت میں عمومیت پائی جائے تب بھی دوسری ادلہ کے ساتھ اسے تخصص لگانا حتمی ہوگا، اگر اسلام کو نابودی کا خطرہ درپیش ہو اور اسے بچانا **القاء نفس در التھلکۃ** (نفس کو ہلاکت میں ڈالنے) پر موقوف ہو تو کیا یہاں بھی اسے حرام کہیں گے؟ کیا جو شخص اپنی جان بچانے کی خاطر اسلام کو ہلاکت وخطرے میں ڈال دے اسے

---

(۱) تاریخ طبری، ج۴ص۲۹۲، الحسن و الحسین سبطا رسول اللہ،ص۹۱،۹۲

(۲) قمقام ص۳۵۹نظم در رالمسمطین ص۲۱۵،مزید تفصیلات،الف :مقتل خوارزمی ف۸، ص۱۶۰،ف۹،ص۱۸۷،ف۱۰،۲۱۸،ص۱۹۱،۱۹۲،ب:طبری،ج۶،ص۳۱،پ: کامل،ج۳ ص ۲۷۸،ت:قمقام،ص۳۳۳،ث:قمقام،ص۲۶۳،۲۶۴،ج:ترجمہ تاریخ ابن اعثم،ص ۳۴۶ میں دیکھیں۔

عقلاً و شرعاً ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا؟ کیا یہ بہترین جہاد و ایثار کا مورد نہیں ہے؟

جہاد و دفاع، دعوت توحید، بشر کو غیر خدا کی پرستش سے آزادی دلانا، اسلام کی حفاظت کرنا، دین کو نابودی سے بچانا یا اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت یہ سب وہ امور ہیں جن میں یقیناً جانیں چلی جاتی ہیں پھر بھی یہ سب واجب ہیں، اگر محاذ جنگ پر ایک اہم مورچے کی حفاظت میں لشکر کے بعض افراد کا قتل ہو جانا لازم آتا ہو لیکن ملک کی حفاظت کی خاطر یہ نقصان برداشت کیا جاتا ہے، یہ جانوں کو ہلاکت میں ڈالنا نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

۲) اسلام کا یہ حکم (یعنی نفس کو ہلاکت میں ڈالنا حرام ہے) ایک ارشادی حکم ہے نہ کہ تاسیسی حکم ہے یعنی اسلام نے یہ حکم عقل کی تائید میں دیا ہے، عقل چونکہ اسے قبیح کہتی ہے لہٰذا اسلام نے بھی اسے حرام کہا ہے اور واضح ہے کہ عقل اسے وہاں قبیح کہے گی جہاں اہم تر مصلحت سامنے نہ ہو، لیکن اگر کوئی اہم تر مصلحت نفس کی ہلاکت پر موقوف ہو تو وہاں عقل اس کام کو نہ صرف قبیح نہیں کہے گی بلکہ جائز بھی کہے گی اور کبھی اسے لازم اور حسن کہے گی۔

۳) ہلاکت و تھلکہ کئی طرح سے ہو سکتا ہے، ان میں سے ایک قسم ضائع ہونا ہے اور ممکن ہے مذکورہ بالا آیت سے مراد یہی ہو اور یہ وہاں ہو گا جہاں ہلاکت کسی صحیح شرعی و عقلی مقصد کی خاطر نہ ہو لیکن اگر دین کی حفاظت اور احکام و شریعت کے دفاع جیسے صحیح مقصد کی خاطر جان دی جائے تو اس کو القاء فی دار التھلکہ یعنی نفس کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں کہیں گے، جو شخص دین اور عمومی مصلحتوں کی خاطر قتل ہوتا ہے اسے ضائع نہیں کہیں گے بلکہ وہ دوام و ابدیت پا گیا ہے، پس معلوم ہوا کہ کسی اہم دینی مصلحت کے حصول یا مفسدہ کے دفع کی خاطر جان دینا ہلاکت نہیں ہے بلکہ شہادت ہے، جیسا کہ مال کا خرچ کرنا اگر بلا مقصد ضائع کیا جائے تو یہ اسراف ہے جو کہ حرام ہے، لیکن اگر عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر خرچ ہو تو بہت بجا و مشروع ہے۔

۴) میدان جنگ و جہاد میں مورچے پر ڈٹ جانا خصوصاً جہاں مورچے کو چھوڑنے سے لشکر اسلام کو شکست اور لشکر کفر کو کامیابی مل سکتی ہو اگر چہ اس سے شخص کو اپنی شہادت کا یقین ہو نہ صرف ممدوح و پسندیدہ ہے بلکہ واجب ہے. کوئی بھی اس پامردی، دلیری اور ثابت قدمی کو ہلاکت شمار نہیں کرتا بلکہ یہ عمل تو ہمیشہ سے خصوصاً صدر اسلام میں جنگجوؤں اور سپہ سالاروں کے قابل فخر کارناموں میں شمار ہوتا رہا ہے، جیسا کہ حضرت جعفر طیار کی جنگ موتہ میں پامردی و ثابت قدمی اور ایثار و قربانی اس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی اسے ہمیشہ شہادت وسعادت شمار کیا جاتا رہا ہے نہ کہ ہلاکت وخودکشی.

۵) مذکورہ بالا آیت اگر چہ نفس کے ہلاکت میں ڈالنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے لیکن اس آیت میں **القاء فی التھلکة** کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ اس طرح نہیں ہے کہ جہاں نہی کا تعلق خارجی امور جیسے شراب وخنزیر سے ہوتا ہے بلکہ اس کا مصداق تب ہی تحقق و وجود پذیر ہوگا جہاں یہ عنوان منطبق ہوگا اب ممکن ہے ایک اقدام یا ایک عمل ایک شخص کی نسبت تو اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنے میں شمار ہو لیکن کسی دوسرے شخص کی نسبت ایسا نہ ہو، ان چند مقدمات کے بیان کے بعد اب اصل بات کی طرف آتے ہیں کہ:

پہلا تو یہ: کہ امام پوری امت میں سے وہ فرد ہے جو شرعی احکام کا سب سے زیادہ عالم اور ہر طرح کی خطاء واشتباہ سے معصوم ہے، لہٰذا اس سے جو عمل بھی صادر ہوگا وہ امر الٰہی کے عین مطابق ہوگا.

دوسرا یہ کہ: بنی امیہ امام حسین علیہ السلام کو قتل کر کے ہی دم لیتے چاہے آپ عراق جاتے یا وہیں مکہ میں رہ جاتے، آپؑ نے اس بارے میں تمام مصلحتوں کا ملاحظہ فرمایا اور جو بھی آپ کے قیام کو وقت نظر کے ساتھ ملاحظہ کرے گا وہ سمجھ سکتا ہے کہ آپ کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ آپ کی شہادت ومظلومیت سے اسلام کی بقاء اور احیاء دین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور اس مقصد کے لئے آپ نے تمام تر ضروری اقدامات کئے.

تیسرا یہ کہ : امام حسینؑ کا اپنے قیام، بیعت نہ کرنے اوران تمام مصائب کو برداشت کرنے سے صرف اور صرف مقصد دین وشریعت کونجات دلانا تھا اور یہ وہ عظیم مقصد و ہدف تھا جس کے لئے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دینا بھی مہنگا سودا نہیں تھا۔اس وجہ سے آپ نے شہادت کو اختیار کیا اور بڑی بڑی مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے سہہ لیا۔

امام حسینؑ کا اصل مقصد حکم خدا کی انجام دہی، حق کی حمایت اور بنی امیہ کی حکومت کا بطلان اوران کے افکار واہداف کی نابودی تھا اوران اہداف و مقاصد کا حصول اس بات پر موقوف تھا کہ ان کے سامنے سر نہ جھکایا جائے اور سرحد شہادت تک استقامت و ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا جائے،لہٰذا دین وعقیدہ کی حفاظت کی خاطر استقامت وثابت قدمی باعث سربلندی وفخر شمار ہوگی اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کے موضوع سے خارج ہے .

عورتوں کا کردار

سوال ۲۴ : جب امام حسینؑ جانتے تھے کہ شہید ہو جائیں گے تو پھر اپنے خاندان کو ساتھ کیوں لے گئے؟ امام حسینؑ کے عاشورائی انقلاب میں عورتوں کا کیا کردار ہے؟

جواب : امام حسین علیہ السلام کی نہضت وتحریک کے دورُخ تھے،دونوں کے لحاظ سے تقسیم کار انجام پائی، ایک رخ فداکاری وشہادت کا تھا اور دوسرا رخ پیغام پہنچانے کا تھا، یہ پیغام پہنچانا سختیاں اور مصائب جھیلے بغیر ممکن نہیں تھا،عورتوں کا اصلی کردار اس دوسرے رخ اور وظیفہ کو پورا کرنے میں ظاہر ہوا، اگرچہ عورتیں مجاہدین کی تربیت اور جنگ میں ان کے جذبہ کو ابھارنے اور میدان کی طرف بھیجنے کے حوالے سے بھی اپنا موثر کردار ادا کرتی رہیں اور دوسرے کاموں میں بھی پشت پناہ رہیں لیکن ان کا اصلی کردار یہی پیغام کربلا کا پہنچانا تھا۔

نہضت حسینی اور اسلام کی تبلیغ کے حوالے سے عورتوں کے کردار پر گفتگو کرنے سے پہلے دو مقدمات کا بیان ضروری ہے، پہلا یہ کہ سید الشہداء کے کام با قاعدہ طے شدہ حکمت عملی کے مطابق تھے اور سفر کی صعوبتوں سے واقفیت کے باوجود اپنے اہل بیت کو کوفہ ساتھ لے جانا بھی اسی وجہ سے تھا کہ آپ کو رسولؐ خدا نے الہام کے ذریعے جو خواب آپ نے دیکھا تھا، حکم دیا اس میں حضورؐ نے فرمایا:

ان اللہ شاء ان یراھن سبایا(۱)

''خداوند کی مشیت مستورات کو قیدی دیکھنا ہے''

اس سے آپ سمجھ گئے کہ اہل بیت عصمت وطہارت کی قید رضائے خدا ہے آپ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اپنے اہل بیت کو ساتھ لے جائیں، حضرتؑ نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق درحقیقت اپنے مبلغ اسلامی مملکت کے مختلف شہروں حتیٰ کہ دارالخلافہ میں بھیجے جنہوں نے حضرت کا پیغام سب لوگوں تک پہنچا دیا،

دوسرا مطلب عورتوں کے تاریخی کردار کے حوالے سے گفتگو کرنا ہے، کوئی بھی عورتوں کے تاریخی کردار سے انکار نہیں کرسکتا، کم از کم عورتوں کے بالواسطہ کردار کو سب تسلیم کرتے ہیں، اس لحاظ سے کہ عورت مرد کی تربیت کرتی ہے اور مرد تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے اور عورت کا مرد کی تعمیر میں جو کردار ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، جو مرد تاریخ بنانے میں ادا کرتا ہے، تاریخی کردار کے حوالے سے عورتوں کی تین قسمیں ہیں:

الف) وہ عورتیں جو ایک قیمتی شے کی مانند تھیں، لیکن ان کا کوئی عمل ودخل کبھی نہیں رہا، جیسا کہ اکثر لوگ عورت کو انسان کے بجائے ایک قیمتی شے سمجھتے ہیں جسے گھر کی چاردیواری میں حفاظت سے رکھا جانا چاہیے، یہ عورتیں اپنے اسی قیمتی ہونے کے تصور سے مردوں پر مؤثر واقع ہوتی رہیں. ایسے معاشروں میں تاریخ ساز صرف مرد ہوتے ہیں .

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۶۴

ب) بعض معاشروں میں عورت صرف ایک شے ہونے کے تصور سے باہر نکل کر معاشرے میں وارد ہو جاتی ہے لیکن اپنی حدود گم کر بیٹھتی ہے، سب جگہوں پر موجودگی کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو دیتی ہے. ان معاشروں میں عورت ایک شخص ہے، لیکن بے ارزش بے قدر و قیمت شخص جسے علم، ارادہ، اجتماعی شخصیت اور کام کرنا جیسے عناوین دے کر اسے شخصیت دی جاتی ہے اور صرف ایک شے ہونے سے نکالتے ہیں لیکن دوسری طرف سے مرد کے لئے اس کی قدر و قیمت کو ختم کر دیتے ہیں، عورت کی طبیعت یہ ہے کہ مرد کے لئے اہمیت کی حامل رہے اگر یہ چیز اس سے لے لی جائے تو اس کے لئے ایک بڑا روحی صدمہ ہوگا ایسے معاشروں میں اگرچہ معاشرہ بنانے والے مرد و زن ہوتے ہیں. لیکن عورت ایک سستی، کم ارزش جنس بن جاتی ہے، عورت کو مرد کی نظر میں وہ احترام و عزت نہیں دی جاتی جو اسے ملنی چاہیے.

ج) اسلام کی نظر میں عورت کی بڑی اہمیت ہے یعنی ایک طرف سے علم مہارت، شجاعت ،قوت ارادی جیسے معنوی و انسانی کمالات حتیٰ کہ معنوی فضائل کو اعلیٰ سطح پر رکھتی ہو اور دوسری طرف سے بدکردار نہ ہو، قرآن کریم نے عورت کو یہی قدر و قیمت دی ہے، مثلاً حضرت حواء کو حضرت آدمؑ کے ساتھ مخاطب قرار دیتے ہوئے کہا. اس درخت کے نزدیک نہ جانا (۱) حضرت سارا بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی مانند فرشتوں کو دیکھتی تھیں اور ان کے ساتھ گفتگو کرتی تھیں، حضرت مریم کو خداوند اپنے ہاں سے رزق دیتا جس سے حضرت زکریا بھی تعجب میں پڑ گئے اور فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہ کو کوثر (خیر کثیر) کہا جاتا ہے.

تاریخ اسلام میں ایسی عورت کا بہترین نمونہ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا ہیں، آپ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں کہ آپ کو جب حضور اکرمؐ کی طرف سے صرف گھر

---

(۱) عیسائیت میں یہ غلط فکر رائج ہے کہ مرد (آدم) اصلیت رکھتا ہے اور عورت (حواء) کو ثانوی حیثیت حاصل ہے جب کہ قرآن اس غلط فکر کی نفی کرتا ہے، اس بارے میں مفصل گفتگو شہید مطہری نے حماسہ حسینی ج ۱، میں کی ہے دیکھیں ص ۳۰۶۔۳۰۴

کے کاموں پر مامور کیا گیا، آپ مسجد میں ایسا خطبہ ارشاد فرماتی ہیں کہ بوعلی سینا جیسے فلاسفہ بھی توحید کے بارے میں ایسے دقیق مطالب انشاء کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں لیکن بی بی یہ خطبہ پس پردہ ارشاد فرماتی ہیں، یعنی بی بی نے مردوں کے مقابل اپنے حرم کی حفاظت کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ عورت معاشرے میں کس حد تک مؤثر ہو سکتی ہے.

ان دو مقدمات کو سامنے رکھتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ تاریخ کربلا صرف مرد کی تشکیل دی ہوئی نہیں ہے بلکہ مرد + عورت نے اسے تشکیل دیا ہے لیکن ہر ایک نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے اس میں کردار ادا کیا ہے، مردوں کا کردار تو واقعہ عاشورہ میں واضح ہے اور عورتوں کا کردار خصوصاً ثانی زہراء سیدہ زینب علیہ السلام کا کردار عصر عاشورہ کے بعد صحیح طور سے شروع ہوا اور اس کے بعد سب کام آپ کے سپرد ہوئے. آپ نے بھائی کی لاش پر اس انداز میں عزاداری کی کہ دوست و دشمن سب رو دیئے، یہ در حقیقت امام حسین علیہ السلام کی پہلی مجلس عزا تھی جو بی بی نے برپا کی، اب امام سجادؑ، عورتوں، بچوں کی حفاظت کی ذمہ داری آپ کے سپرد تھی، دروازۂ کوفہ پر بی بی نے لہجۂ علیؑ اور حیائے فاطمہؑ کے ساتھ ایسا خطبہ دیا جس نے لوگوں کے ذہنوں میں مولا علیؑ کے اعلیٰ ترین خطبوں کی یاد تازہ کر دی اس خطبے میں بی بی نے کوفیوں کو ان کے کیے پر سخت سرزنش کی. اسلام ایسی ہی حیاء و عفت اور اسلامی حریم کی حفاظت کرنے والی اجتماعی ترقی یافتہ عورت کی تربیت کرنا چاہتا ہے.(۱)

مذکورہ بالا گفتگو کے پیش نظر انقلاب عاشورہ میں امام حسین علیہ السلام کا اپنے اہل بیتؑ کو ساتھ لے جانا کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے.

۱) عورتوں اور بچوں میں بھی پیغام رسانی کی صلاحیت ہے.

۲) ان کی اس صلاحیت کے علاوہ دشمن ان کے مقابلے سے بھی عاجز ہوتا ہے کیونکہ

---

(۱) حماسہ حسینی، ج۱، ص۳۱۱_۳۹۷، ج۲، ص۲۳۶_۲۳۱

عورتوں اور بچوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اگر انہیں نقصان پہنچائے گا تو اس سے عمومی جذبات کو ٹھیس پہنچے گی اور تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ان کے خلاف یہ بات ذہنوں میں نقش ہو جائے گی، جیسا کہ واقعہ کربلا میں دشمنوں نے عورتوں اور بچوں پر ظلم کیے جس کی وجہ سے خود اپنے گھر کے افراد کے سامنے شرمسار و سرافکندہ ٹھہرے۔

دوسرا یہ کہ : عرفانی لحاظ سے امام حسینؑ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی پوری ہستی بغیر کچھ بچائے اخلاص کے ساتھ راہ خدا میں پیش کر دی ، یہ اسی عظیم خلوص کا ہی اثر تھا کہ پوری تاریخ انسانیت میں واقعہ کربلا مسلم و غیر مسلم سب کو متاثر کرتا رہا اور قیامت کے دن بھی آپ کا وہ درجہ ہوگا کہ سب محشر والے اس پر رشک کریں گے اس بارے میں مزید وضاحت کے لئے چند نکات پر توجہ ضروری ہے۔

پہلا) پیغام پہنچانا

اسلام وشریعت کی نظر میں اجتماعی ذمہ داری صرف مردوں پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اسلام مسلمان و پابند عورتوں کو بھی حق و باطل اور ولایت و رہبریت کے حوالے سے ذمہ دار قرار دیتا ہے، عورتوں پر بھی رہبر حق (امام حق) کا دفاع کرنا لازم ہے اور ناحق حکومتوں اور فاسد و نالائق حکمرانوں پر تنقید کرنا بھی ان کا وظیفہ ہے نیز مختلف اجتماعی کاموں میں بھی انہیں حاضر ہونا چاہیے۔ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا نے جو امام معصوم (حضرت علیؑ) کی حمایت اور حکمرانوں کے غلط و ظالمانہ رویوں کا پردہ چاک کرنے کی رسم ڈالی تھی اس راہ و رسم کو جاری رکھتے ہوئے خواتین نے خصوصاً ثانی زہراء نے نہضت عاشورہ میں امام کا قدم قدم پر ساتھ دیا۔

ہر تحریک عموماً دو عناصر پر مشتمل ہوتی ہے ایک خون اور دوسرا پیغام۔ خون سے مراد مسلح قیام ہے، جس میں یقیناً مقدس ہدف کی خاطر جانیں چلی جاتی ہیں اور پیغام سے مراد اس انقلاب کے اہداف و مقاصد کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی عاشورائی

تحریک میں بھی یہ دونوں عنصر نظر آتے ہیں کیونکہ عصر عاشورہ تک امام حسین علیہ السلام کا قیام پہلے عنصر کا مظہر تھا یعنی مظہر خون وشہادت تھا اس وقت میں پرچم داری اور رہبریت آپ کے ہاتھ میں تھی، اس کے بعد دوسرا عنصر شروع ہوا اس میں پرچم داری امام سجادؑ اور سیدہ زینبؑ کے ہاتھ میں تھی، ان ہستیوں نے اپنے آتشی خطبوں کے ذریعے امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت کا پیغام لوگوں تک پہنچایا اور اموی پلید حکومت کو رسوا کر دیا۔

اموی حکومت نے معاویہ کے دور میں ہی اہل بیتؑ کے خلاف پروپیگنڈا خصوصاً شام کے علاقے میں وسیع سطح پر شروع کیا ہوا تھا اس کے پیش نظر اگر امام حسین علیہ السلام کے باقی ماندہ خاندان والے ان کی حقیقت کو لوگوں پر نہ کھولتے تو دشمن اور ارباب اقتدار امام حسین علیہ السلام کی عظیم تحریک کو مسخ کر دیتے، جیسا کہ بعض نے امام حسینؑ کے بارے میں یہ تہمت لگائی ہے کہ امام حسینؑ ذات الریہ نامی بیماری سے فوت ہوئے۔

لیکن یہ آپ کے خانوادہ کی اسارت کے دوران وسیع تبلیغات ہی تھیں جنہوں نے دشمن کو اس مقدس نہضت میں تحریف نہ کرنے دی، یوں عاشورہ میں امام حسینؑ کے خاندان کی شرکت کی ضرورت مزید روشن ہو جاتی ہے جب ہم امویوں کی شام پر حکومت کے حوالے سے تحقیق کرتے ہیں۔

دوسرا) بنی امیہ کے پروپیگنڈے کا توڑ

جب سے سرزمین شام کو مسلمانوں نے فتح کیا اس وقت سے شام پر خالد بن ولید اور معاویہ بن ابی سفیان حکمران رہے، وہاں کے رہنے والوں نے نہ رسولؐ خدا کا کلام سنا نہ اصحاب کی سیرت سے واقف ہوئے اور نہ اسلام کو کم از کم اس طرح پہچانا جیسے وہ مدینہ میں رائج تھا، اگرچہ سرزمین شام کی فتح میں اصحاب رسولؐ میں سے ۱۱۳، افراد شریک تھے یا تدریجاً وہاں آکر آباد ہو گئے لیکن ان کے حالات زندگی دیکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ چند افراد کو چھوڑ کر باقی سب نے بہت کم مدت کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت

سے استفادہ کیا اور انہوں نے چند ایک حدیثوں سے زیادہ روایات بھی نقل نہیں کیں۔ اس کے علاوہ ان میں اکثر افراد حضرت عمر و عثمان اور معاویہ کی ابتدائے حکمرانی کے دوران وفات پا گئے اور امام حسینؑ کے قیام کے وقت ان میں سے صرف گیارہ افراد زندہ بچے تھے جو شام میں سکونت پذیر تھے۔ وہ بھی ستر یا اسی سال کے بوڑھے تھے جو اجتماعیات میں شرکت پر گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے ہیں اور نہ ہی ان کا عام لوگوں میں کوئی اثر و رسوخ تھا، لہٰذا اس دور کی جوان نسل حقیقی اسلام سے نابلد و ناواقف تھی، شاید ان کی نظر میں اسلام بھی ایک حکومت ہی کا نام تھا جیسا کہ اس سرزمین پر اسلام کے وارد ہونے سے پہلے وہاں حکومتیں برقرار تھیں۔ معاویہ کے دربار کی زیبائش مسلمانوں کے اموال میں لوٹ مار، بڑے بڑے محل بنانا، لوگوں کو شہر بدر کرنا، جیلوں میں ڈالنا اور مخالفوں کو قتل کروا دینا ان کے لئے یہ سب کام عام سی بات تھی، کیوں کہ یہی نظام وہ پچاس سال پہلے ملاحظہ کر چکے تھے اور یقیناً وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ مدینہ میں رسولؐ خدا کا دور بھی ایسا ہی ہوگا۔(۱)

معاویہ نے تقریباً ۴۲ سال شام پر حکومت کی، اس نے اس لمبی مدت میں شام والوں کی اس طرح کی تربیت کی کہ وہ دینی بصیرت سے بالکل بے بہرہ تھے اور معاویہ کے فرامین و خواہشات کو بے چوں و چرا تسلیم کرنے والے تھے۔(۲)

معاویہ نے اس مدت میں نہ صرف فوجی و سیاسی لحاظ سے شام والوں کو اپنے زیر تسلط رکھا بلکہ فکری و مذہبی لحاظ سے بھی انہیں اندھا، بہرا اور گمراہ بنا دیا تاکہ وہ انہیں جو چیز بھی احکام اسلام کے عنوان سے بتلائے وہ اسے بغیر کسی چوں چرا کے مان لیں۔

پلید اموی حکومت نے اپنے زہریلے و شیطنت آمیز پروپیگنڈے کے ذریعے اہل بیت رسول کو شامیوں کی نظروں میں ناپسندیدہ بنا دیا اور اس کے برعکس بنی امیہ کو رسولؐ خدا کے

---

(۱) سید جعفر شهیدی، قیام امام حسین علیه السلام، ص۱۸۵

(۲) آیتی، محمد ابراهیم، بررسی، تاریخ عاشوره، ص۴۷

قریبی اور رشتہ داروں کے عنوان سے پیش کیا، یہاں تک جب عباسیوں کی حکومت برقرار ہوگئی اور ابوالعباس سفاح خلیفہ بن گیا تو امرائے شام میں سے دس افراد اس کے پاس پہنچے اور اس سے کہا خدا کی قسم مروان (اموی حکمران) کے قتل کے زمانے تک ہمیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ رسولؐ خدا کے بنی امیہ کے علاوہ بھی کوئی رشتہ دار ہیں جو آپ کے وارث ہوسکتے ہیں، اب آپ کے قیام کے بعد ہمیں پتہ چلا ہے.(۱)

لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ بعض مقتل کی کتب میں لکھا ہے کہ جب کربلا کے اسیروں کا قافلہ بازار دمشق میں پہنچا تو ایک شخص نے امام زین العابدینؑ کے سامنے آکر یہ گستاخی کی کہ خدا کا شکر ہے جس نے تم لوگوں کو قتل و نابود کیا اور لوگوں کو تمہارے شر سے بچالیا، امامؑ خاموشی سے سنتے رہے جب وہ شامی سب کہہ چکا تو آپ نے قرآن سے اپنی شان میں نازل ہونے والی آیات کی تلاوت فرمائی جیسے:

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل بیت ویطھر

کم تطھیرا (احزاب ۳۳)

اور فرمایا کہ یہ آیات ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہیں"

وہ شخص متوجہ ہوگیا کہ اس نے جو کچھ ان قیدیوں کے بارے سن رکھا تھا وہ درست نہیں تھا یہ لوگ خارجی نہیں ہیں بلکہ اولاد رسولؐ ہیں وہ شخص اپنے کہے ہوئے پر پشیمان ہوا اور توبہ کی.(۲)

بنا برین قافلۂ اسراء منزل بہ منزل اپنے سفر میں خطبوں اور گفتگو کے ذریعے صورتحال بتلاتا گیا اور سید سجاد علیہ السلام و ثانی زہراء علیہ السلام نے اپنے خطبوں کے ذریعے شام میں بنی امیہ کے سالہا سال کے پروپیگنڈے کے اثر کو دھو ڈالا.

---

(۱) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۷ ص۱۵۹

(۲) خوارزمی مقتل الحسینؑ، ج۲، ص۶۱، للھوف ص۷۴

تیسرا) ظالموں کے چہرے سے نقاب کھینچنا

امام حسینؑ کے خاندان کی واقعہ کربلا میں شرکت کی ایک اور وجہ یزید اور اس کی حکومت کی سفاکیت، بے رحمی اور ظلم کو اجاگر کرنا تھی، لوگوں کی طرف سے پیغام کی قبولیت اور پیغام لانے والوں کی تبلیغات کے مؤثر ہونے کی ایک اہم وجہ مظلومیت کا عنصر ہے، یہی وجہ ہے کہ مختلف سیاسی گروپ اور جماعتیں اپنے جلوس میں اپنی مظلومیت کو پیش کرتی ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے اذہان پر اثر انداز ہوسکیں، کیونکہ انسان فطری طور پر ظالم اور ظلم سے متنفر ہے اور مظلوم کے ساتھ فطری طور پر دلی ہمدردی پیدا ہوتی ہے، واقعہ کربلا میں صرف مظلوم نمائی نہیں تھی بلکہ حقیقتاً اہل بیت کی قربانی میں مظلومیت کا عنصر شامل تھا. اسیروں نے سید الشہداء اور دوسرے شہیدوں کے پیغام کو بڑے اچھے طریقے سے لوگوں تک پہنچایا، اس طرح کہ آج بھی ان کی آواز انسانی ضمیر میں گونج رہی ہے.

عورتیں اور بچے جن کے پاس نہ جنگی اسلحہ تھا اور نہ جنگ کی قدرت تھی لیکن انہیں بھی انتہائی ظلم و بربریت کے ساتھ ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا، حسین علیہ السلام کا چھ ماہ کا شیر خوار اصغر تشنہ لبوں کے ساتھ فرات کے کنارے سنگدلی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا، حسین کی چار سالہ بچی سکینہ باپ کے پامال شدہ بدن پر آتی ہے تو اسے طمانچے مارے جاتے ہیں. مردوں کو شہید کر دینے کے بعد عورتوں کے خیام کو آگ لگادی جاتی ہے ...... یہ سب وہ عوامل تھے جو سید الشہداء کے پیغام کے پہنچانے اور یزیدی حکومت کی حقیقت کے روشن کرنے میں خون شہداء سے کم تر نہیں تھے، کربلا میں بچوں کی العطش کی آوازیں اور علی اصغر کا خون آلود کرتہ ہی تو تھے جنہوں نے جنگ کربلا اور کربلا میں بہنے والے خون کو زندہ رکھا.

امام سجادؑ نے شام میں جب چاہا کہ اموی حکومت کی حقیقت روشن کریں تو فرمایا:

> "میرے باپ کو اس طرح شہید کیا گیا، کہ ان کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور جیسے پرندے کو پنجرے میں بند کر

کے مارا جاتا ہے اس طرح میرے باپ کو شہید کیا گیا"

یہاں اگر امام سجاد علیہ السلام صرف یہ جملہ کہتے کہ میرا باپ شہید کردیا گیا تو شام والے جو کہ اہل بیتؑ کی صحیح معرفت نہیں رکھتے تھے ان پر اس جملے کا کوئی خاص اثر نہ ہوتا، کیونکہ وہ یہی کہتے کہ جنگ میں لوگ مارے جاتے ہیں کیا ہوا کہ حسینؑ بھی مارے گئے.

امام سجادؑ نے فرمایا میرے بابا کو قتل کرنا ہی چاہتے تھے تو اس طرح کیوں قتل کیا؟ کیوں پرندے کی طرح ان کے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا؟ کیوں لب فرات انہیں پیاسا مارا گیا؟ کیوں انہیں دفن نہ کیا گیا، کیوں ان کے خیام پر حملہ کیا گیا اور کیوں ان کے چھ ماہ کے بچے کو قتل کیا گیا؟ یہ جملے اس حد تک ناقابل برداشت تھے کہ شام میں ایک طوفان برپا کردیا اور اموی حکومت کے خلاف ایک فکری ثقافتی انقلاب کی بنیاد پڑ گئی .

آخری بات یہ کہ یزید مردوں کے قتل اور عورتوں کو قیدی بنالینے سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اس نہضت کو یہیں دبا دے اور سب پر اس کی حکومت کا ایسا رعب و دبدبہ بیٹھے کہ کوئی بھی اس کے خلاف قیام کی جرأت نہ کرے، لیکن اس کے برعکس امام حسینؑ کے خونی قیام اور آپ کے خاندان کی مظلومانہ پیغام رسانی نے لوگوں کے دلوں سے ہر خوف نکال کر انہیں خون حسینؑ کے انتقام اور اموی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر آمادہ کردیا.

تیسرا حصّہ

سیاسی فکر

علی رضا محمدی

سیاسی فکر

سوال ۲۵ : کیا امام حسینؑ کا قیام حکومت کے خلاف سرکشی و خروج تھا؟ اور اصولی طور پر کس موقع میں حکومت کے خلاف قیام و خروج جائز ہے؟

جواب : عاشورہ کے دن لشکر ابن سعد سے عمرو بن الحجاج نے بآواز بلند کہا:

یا اهل الکوفه : الزموا طاعتکم و جماعتکم و لا ترتا لوا فی قتل من مرق من الدین و خالف الامام.

اس نے اپنی گفتگو میں امام حسین علیہ السلام کو دین سے نکل کر امام وقت کے خلاف خروج کرنے والا قرار دیا اور اسی فکر کی جڑیں بھی آج بھی موجود ہیں

یہ بات مسلم ہے کہ امام حسینؑ نے ظالم حکومت کے خلاف خروج کیا، لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ہر حکومت کے خلاف خروج جائز نہیں ہے، اگر بعض

مکاتب فکر ایسا سمجھتے ہیں حق خروج کا بلا واسطہ تعلق ہے حکومت کی بے چون وچرا اطاعت کے ساتھ جو کہ ایک سیاسی فلسفہ کے بنیادی مسائل میں سے ہے، اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے کہ آیا حکومت وقت کے خلاف قیام کیا جا سکتا ہے؟ پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمیں حکومت کی پیروی واطاعت کیوں کرنا چاہیے؟ کیا حکومت کی اطاعت مطلقہ فرض ہے اور کسی صورت میں بھی اس کی مخالفت نہیں کی جا سکتی؟ اور اگر کہیں اس کی مخالفت کی جا سکتی ہے تو اس کی حدود وقیود کیا ہیں؟ ان سوالوں کے جواب ہم جمہوری نظریہ اور حق الہی نظریہ دونوں کے مطابق ذکر کریں گے.

پہلا) ڈیموکریٹک نظریہ میں حق خروج

مغرب کی نظر میں حکومت کے جواز کا دارومدار اجتماعی قرارداد اور لوگوں کی رضا پر ہے، حکومت کی اہم ترین ذمہ داری ووظیفہ لوگوں کی فلاح و بہبود اور امن وامان کا مہیا کرنا ہے، اس کے مقابل لوگوں کا وظیفہ حکومت کی اطاعت ہے. حکومت قانون سازی اور اس کے اجراء میں لوگوں کی نمایندہ ہوتی ہے، اجتماعی وعمومی امن وامان کی برقراری جیسا کہ ھابز نے کہا یا قدرتی حقوق کی پاسداری کی خاطر جیسا کہ لاک نے کہا، ھابز کی طرح کے مفکرین جو کہ قراردادی نظریہ کے حامی ہیں لوگوں کو حکومت کے خلاف خروج یا شورش کا حق بالکل نہیں دیتے، یا کم از کم افراد کو نہیں دیتے اگر چہ ملت کے لئے ایسے حق کے قائل ہوں، جیسا کہ امریکہ کی آزادی کے اعلامیے میں آیا ہے حکومتیں اپنا عادلانہ اقتدار ان لوگوں سے حاصل کریں گی جن پر حکومت کی جاتی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ جب کسی حکومت کی شکل ان اہداف کے خلاف سرگرم ہو جائے تو لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس حکومت کا تختہ الٹ دیں یا اسے تبدیل کردیں اور اس کی جگہ نئی حکومت قائم کریں.(۱)

جان لاک اگر چہ انسانوں کے قدرتی حقوق کا دفاع کرتا ہے اور حکومت کے

---

(۱) جان سالویں شاپیرو، لیبر الیسم، ص۱۵۷

انحراف کی صورت میں لوگوں کے حق شورش کی بات کرتا ہے، لیکن اس بارے میں کوئی واضح بات نہیں کرتا، وہ مدنی حکومت (شہری حکومت) کے بارے میں اپنے ایک رسالے میں لکھتا ہے.

اس قانون کی بناء پر جو کہ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین پر مقدم ہے اور سب پر برتری رکھتا ہے لوگ آخری فیصلے کا حق محفوظ رکھتے ہیں، جب تک زمینی دادرسی موجود نہ ہو لوگ درگاہ الٰہی سے توسل کر سکتے ہیں.(۱) لیکن اس کے باوجود ریاست کے افراد ان کے خلاف شورش کا حق نہیں رکھتے جنہیں وہ صحیح امین نہیں سمجھتے اگر چہ یہ حق پوری ملت کو (اکثریت کے ذریعے) حاصل ہو.(۲)

یہی وجہ ہے کہ ڈیموکریسی کے بہت سے حامی بھی ایک ڈیموکریٹک نظام میں شورش کے حق کے قائل نہیں ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ڈیموکریٹک نظام کے اندر اس سے صرف نظر کیا جانا چاہیے کیونکہ جمہوری نظام میں اقلیتوں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا مناسب موقع ملتا ہے، وہ درحقیقت حق شورش کو ایک ادارے کی شکل میں قرار دیتے ہیں.(۳) ڈیموکریٹک حکومتوں میں حق شورش قرار نہ دینے کے نظریے پر کافی اعتراضات کئے گئے مثال کے طور پر:

پہلا اعتراض: جب فرد حکومت کو اپنی سعادت وخوش بختی کے موافق نہ پائے تو اپنی پہلی موافقت سے پیچھے کیوں نہیں ہٹ سکتا.(۴)

دوسرا اعتراض: یہ احتمال کہ برسر اقتدار اکثریت دوسروں کے حقوق پامال کر سکتی ہے ہمیشہ رد نہیں کیا جا سکتا. جیسا کہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ڈیموکریٹک حکومتیں بھی ظالم و جابر اور سختی کرنے والی ہو سکتی ہیں، تاریخ سے ثابت ہے کہ عمومی ارادہ کا اصول بھی استبداد

---

(۱) جان جاک شوالیہ آثار بزرگ سیاسی، ص۱۰۴

(۲) جین ہمپٹن فلسفہ سیاسی، ص۱۰۷

(۳) سروش محمد، مقاومت و مشروعیت، فصل نامہ حکومت اسلامی، سال ہفتم شمارہ سوم پائیز ۱۳۸۱، ص۷۹

(۴) فلسفہ سیاسی، ص۱۱۷

وڈکٹیٹرشپ میں بدل سکتا ہے۔(۱)

تیسرا اعتراض : یہ کون تشخیص دے گا کہ ڈیموکریسی میں اقلیت کوکافی حدتک مواقع ملتے ہیں اورکون یہ فیصلہ کرے گا کہ اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری ہوچکی ہے اور شورش وخروج کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہ تشخیص (جو بھی کرے) اقلیت کی نظر کے موافق نہ ہوتو ان کا یہ دعوی اپنی جگہ پر باقی رہے گا کہ ان کے حقوق کا خیال نہیں رکھا جارہا اور فرینٹز نیومن کے بقول ڈیموکریسی کے حامی نظریہ والوں نے حق شورش وخروج کے حوالے سے کوئی چارہ اور راہ حل نہیں سوچا۔(۲)

چوتھا اعتراض : ڈیموکریسی کے نظریہ میں چونکہ حقوق کی بنیاد اکثریت کی رائے ہوتی ہے اور یہ چیز اہم شمار ہوگی، لہٰذا کوئی بھی عمومی سوچ کے برخلاف کسی چیز کوحق یا ارزش شمار نہیں کرسکتا اور اسے دلیل نہیں بنا سکتا، بنابرین شورش وخروج کا کوئی موقع باقی نہیں رہے گا۔ ڈیموکریسی میں سیاسی فضا معاشرہ میں کھلی نہیں رہ پاتی اور اکثریت جو کہ درحقیقت اقلیت ہوتی ہے اسے نسبی اکثریت حاصل ہوتی ہے اقتدار پر قابض ہوجاتی ہے اور یہ نسبی اکثریت مطلق اکثریت پرحکومت کرتی ہے جس سے افراتفری پھیلنے کی فضا پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے۔(۳)

دوسرا) نظریہ حق الٰھی میں شورش و خروج

اس نظریہ کے مطابق حکومت کی مشروعیت وجواز الٰہی اذن کی بناء پر ہوتا ہے اور حکومت حاکیت الٰہی سے سرچشمہ پاتی ہے۔ یہ بہت قدیمی نظریہ ہے اور تاریخ میں مختلف شکلوں میں موجودرہا ہے۔ مشرقی قدیم شہنشاہیت میں شہنشاہوں کواور فراعنہ کے دور میں فرعونوں کو خدا سمجھا جاتا تھا، بعض نظریات کے مطابق بادشاہ کی منشاء خدائی ہوتی تھی

---

(۱) ایلن ڈوبنو آنا، تاملی درمبادی دموکراس ترجمہ بزرگ نادرزاد، ص۴۳ اور۷۱

(۲) فرینٹزنیومن، آزادی و قدرت و قانون، ص۳۶۸

(۳) مقاومت و مشروعیت، ص۸۱

اور اس کی حاکمیت خداوند کی مشیت سے ہوتی تھی، قرون وسطیٰ میں عیسائی معتقد تھے کہ حکومت الٰہی و خدائی منشاء رکھتی ہے اور مشرق میں جو بادشاہ کو ظل الٰہی کہا جاتا تھا اس کی حقیقت بھی یہی بادشاہ کے خدا کے ساتھ رابطے کا اظہار تھی.(۱)

اس نظریہ میں حق شورش و خروج کے حوالے سے مختلف نظریات ہیں .

۱) کتاب مقدس فصل ۱۳ کی ابتداء میں ہے:

سب پر حاکموں کی اطاعت واجب ہے کیونکہ ہر اقتدار خداوند کا عطا کردہ ہے اور ہر حاکم کو اس نے مقرر کیا ہے لہٰذا جو حاکم کے خلاف سرکشی کرے گا اس نے الٰہی نظام پر خروج کیا ہے اور اپنے آپ کو عذاب و سزا کا مستحق بنالیا ہے.

تھامس قدیس کا نظریہ بھی یہی تھا کہ کسی کو ظالم حاکم کا مقابلہ کرنے یا اسے قتل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے. ہاں عمومی اقتدار کے ساتھ ایسا کیا جا سکتا ہے.(۲) گذشتہ دور میں مغربی سیاست کے اعلامیوں میں یہ پیغام ہوتا تھا کہ چونکہ حاکم مشیت خدا کے ساتھ برسر اقتدار آتے ہیں لہٰذا بادشاہ کو ماننا پڑے گا اگرچہ وہ ظالم و ستمگر ہو اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے.(۳)

اھل سنت کا نظریہ

مسلمانوں کی غالب اکثریت نے ایسا نظریہ قبول نہیں کیا اور اکثر اسلامی فرقے ظالم حکمران کے خلاف خروج اور اسے معزول کر دینے کو جائز سمجھتے ہیں اگرچہ شورش اور آشوب کے پھیل جانے کا ڈر جواز شورش کا فتویٰ دینے سے ہمیشہ ایک اہم مانع شمار ہوتا رہا ہے.(۴) البتہ بعض نے ابو حنیفہ کی طرح نہ صرف جواز شورش کا فتویٰ دیا بلکہ خود ظلم کے

---

(۱) فلسفه سیاست از موسسه آموزشی و پژوهشی امام خمینی ، ص ۱۲۷

(۲) مقاومت و مشروعیت ،ص ۸۱

(۳) ژاک روزجان ، قرارداد اجتماعی، ترجمه مرتضیٰ کلانتریان ،ص ۳۱۸

(۴) موسوعة الفقهیه ،ج ۶،ص ۲۲۰

خلاف قیام کر کے عملاً اس کی حمایت بھی کی (۱) اس کے مقابل حنبلی فرقہ والے حاکم کے خلاف خروج کو غلط قرار دیتے ہیں اور اسے جائز نہیں سمجھتے اور بد قسمتی سے آج کل غالب اہل سنت میں اس نظریئے کو قبول کیا جاتا ہے کیونکہ:

پہلا یہ کہ پیغمبر اکرمؐ سے مروی بعض روایات جیسے ﴿ اسمعوا واطیعوا فانما علیھم ماحملوا و علیکم ﴾ سے سطحی استفادہ اسی کا کیا گیا۔

دوسرا یہ کہ اس نظریہ کے حامل اکثر افراد حکمرانوں سے قریبی مراسم رکھتے تھے۔

تیسرا یہ کہ عقلی میلانات ان میں کم تر ہوتے چلے گئے اور معتزلہ جیسے عقلی میلانات رکھنے والے فرقے کنارے پر کر دیئے گئے ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ہمارے علماء ظالم حکمرانوں کے خلاف قیام کو واجب قرار دیتے ہیں جب کہ اشعری مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے غزالی جیسے علماء اسے جائز نہیں سمجھتے۔(۲) بد قسمتی سے اہل سنت کے اندر ان افکار و نظریات کا پایا جانا باعث بنا کہ آج کے دور میں بعض عرب ممالک کے اندر مبارزہ کرنے والے دین کے پابند گروہ اس فکر میں مبتلا ہیں کہ ظالم حکومت کے خلاف مسلح قیام کہیں شریعت کے خلاف نہ ہو۔

۳) شیعہ نظریہ

چونکہ مسئلہ شورش و خروج کا حکومت کی مشروعیت سے تعلق ہے، لہٰذا ہم اس مسئلہ کو مختصر طور پر شرعی و غیر شرعی حکومت کے لحاظ سے دیکھیں گے۔

ا۔۳) ظالم حکومت میں شورش و خروج

شیعہ عقیدہ کے مطابق امامؑ کی موجودگی کے دور میں چونکہ امام و رہبر میں عصمت شرط ہے لہٰذا غیر معصوم حاکم جیسا بھی ہو غاصب اور جائز (ظالم) شمار ہوگا، اس کا حکومتی

---

(۱) مقاومت و مشروعیت، ص۸۴

(۲) مقاومت و مشروعیت، ص۸۴

معاملات چلانا غصب اور ناجائز ہے، اسی طرح غیبت کے دور میں بھی جو حاکم امام عصر کی طرف سے اذن نہ رکھتا ہو وہ غاصب و جائز ہے اور ایسا اذن صرف فقیہ عادل کو حاصل ہے اس کے غیر کے لئے ثابت نہیں ہے، لہٰذا جو حکومت فقیہ عادل جامع الشرائط کی نظارت کے ماتحت نہ ہو وہ حکومت حکومت جور و طاغوت شمار ہوگی۔(۱) جب حکومت کو مشروعیت حاصل نہ ہو تو اسے حکمرانی کا کوئی حق نہیں اور لوگوں پر اس کی اطاعت لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اضطراری اور عام عادی صورت حال کے لحاظ سے فرق کرنا ہوگا کیونکہ :

اضطراری و مجبوری کی صورت حال میں اگر چہ حکومت ذاتی طور پر مشروعیت نہیں رکھتی لیکن موجودہ سیاسی و اجتماعی حالات کے پیش نظر حکومت کی بعض مخالفتوں سے چشم پوشی کرنا ہوگی تاکہ اس سے برتر مصلحت کو حاصل کیا جاسکے یا زیادہ فساد و برائی سے بچا جاسکے، ایسی صورت حال میں اطاعت کا لازمی ہونا اس وجہ سے نہیں کہ وہ شرعی حکومت ہے بلکہ ایک ثانوی عنوان یعنی اضطراری صورت حال اس کا باعث بنی ہے۔

مثال کے طور پر شیعہ فقہاء حکومت جور کے ساتھ تعاون کو حرام قرار دیتے ہیں، لیکن بعض مواقع پر جیسے اسلامی سرزمین پر دشمن کے حملوں کو روکنے اور اسلامی سرزمین کے دفاع کے لحاظ سے حکومت جور کے ساتھ تعاون اور اس کی اطاعت کو واجب قرار دیتے ہیں اب واضح سی بات ہے کہ اس کے معنی حکومت جور کو جواز فراہم کرنے کے نہیں ہیں بلکہ یہ سب اسلامی معاشرہ کی مصلحتوں کی خاطر مجبوری کے حالات میں کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی دلیل اصلی اسلامی تعلیمات ہیں، جیسا کہ امام ہشتم امام رضا علیہ السلام سے ایک شخص نے یہی سوال کیا کہ غیروں کے حملوں کے مقابلے میں اسلامی سرحدوں کی محافظت کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا اگر اسلامی مرکز اور مسلمانوں کو خطرہ درپیش ہو تو جنگ کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس جنگ کا مقصد سلطان کی تقویت نہیں ہوگی بلکہ اسلامی معاشرہ کا دفاع اس کا مقصد

---

(۱) امام خمینی، ولایت فقیہ، ص ۴۷

ہوگا، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

وان خاف علی بیضۃ الاسلام والمسلمین قاتل فیکون قتالہ لنفسہ ولیس للسلطان. (۱)

خروج کے مراحل

اسلامی تعلیمات کے مطابق حاکم جور کے مقابل خروج کے مختلف مراحل ہیں:

پہلا، انکار، حکومت جور کی بیعت سے انکار کردے اور اس کے احکام نہ مانے جیسا کہ ائمہ معصومین کی سیرت یہی رہی ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے حکام وقت کی بیعت نہ کی یا امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کردیا اور عبداللہ بن زبیر سے فرمایا:

انی لا ربایع لہ ابدا لان الامر انما کان لی من بعد اخی الحسن (۲)

''میں کبھی یزید کی بیعت نہیں کروں گا کیونکہ بھائی حسن کے بعد خلافت میرا حق تھی''

بعض دفعہ اہم مصلحت کے پیش نظر حکومت کے ساتھ ہمکاری کرنا پڑتی ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایسا کیا، آپ اس بارے فرماتے ہیں:

فخشیت ان لم انصر الاسلام واھلہ ان اری فیل ثلما اوحد ما تکون المصیبۃ بہ علی اعظم من فوولا یتکم (۳)

''مجھے یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر میں اسلام اور اہل اسلام کی مدد نہ کروں تو اس میں ایسا شگاف ...... دیکھوں گا کہ جس کی مصیبت میرے لئے تمہاری ولایت کے فوت ہونے سے بڑھ کر ہو''

اس کے برخلاف امام حسینؑ حکومت یزید کے لئے ایسا بھی نہیں کرسکتے تھے، چونکہ اگر ایسا کرتے تو یہ اس کے فسق وفجور اور ظلم واستبداد کی تائید شمار ہوتا، جس کا ارتکاب یزید

---

(۱) کلینی فروع کافی، ج ۵ ص ۲۱

(۲) محمد باقر مجلسی بحار الانوار ج ۴۴ ص ۳۲۵

(۳) نہج البلاغہ، خ ۶۲

کھلے عام کرتا تھا اس کا نتیجہ دین اسلام کی مکمل نابودی کی صورت میں نکلتا. امام حسینؑ حتیٰ کہ انتہائی مجبوری کی صورت میں بھی اس کی بیعت پر راضی نہ ہوئے اور آپ نے خود اس کی وجہ بھی ذکر فرمادی کہ:

ان السنة قد امتیت وان البدعة تدا حییت (۱)

''سنت کو مار دیا گیا اور بدعت کو زندہ کر دیا گیا''

دوسرا مرحلہ) قیام ومبارزہ

حاکم جور کے مقابل دوسرا وظیفہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ہے، جس کی ابتداء زبانی کلامی متوجہ کرنے سے ہوتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے عملی اقدام ہو جو اس کی حکومت کے گرا دینے تک جاری رہے. اس حوالے سے خروج اور شورش کی خاص اہمیت ہے، عثمان کے خلاف بعض مسلمانوں کی شورش مسلمانوں کا اس حوالے سے پہلا تجربہ تھا. حاکم جور کے مقابل قیام کی دوسری مثال امام حسینؑ کی نہضت ہے کہ امام پاکؑ نے (۲) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وظیفہ کی خاطر یزید کی مخالفت میں قیام فرمایا آپ نے ظالم کی مخالفت کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے طور پر واجب شمار کیا ہے اور آپ نے علماء کی اس بات پر سرزنش کی کہ انہوں نے کیوں ظالموں کے ساتھ مصالحت کر کے آرام سے بیٹھنا قبول کرلیا ہے آپ فرماتے ہیں:

بالادهان والمصانعة عندا لظلم تامنون کل ذلک مما مرکم الله به من النهی و التناهی وانتم عنه غافلون (۳)

''کیوں تم نے موت سے ڈر کر ظالموں کو قدرت دے دی کہ وہ

---

(۱) تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۸۰

(۲) تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۸۰

(۳) بحرانی تحف العقول، ص ۱۶۸

اپنی خواہشات کو حاکم کردیں اور کمزوروں پر قبضہ جمالیں اور مستضعفین کو دبا کے رکھیں اور حکومت اپنی مرضی سے چلائیں"

امام حسین علیہ السلام نے حکومت بنی امیہ کے ناجائز حکومت ہونے کو ثابت کرنے کے لئے حقیقی رہبر اور امام کی شرائط بیان فرمائیں.

فلعمری ما الامام الا العامل بالکتاب والآخذ بالقسط والدائن بالحق والحابس نفسه علی ذات الله .(۱)

اور آپ نے اپنے ایک خطبہ میں حر بن یزید ریاحی کے فوجی دستے کو یزیدی حکومت کے خلاف قیام کی ضرورت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

الا وان ھولاء القوم قد لزموا اطاعة الشیطان وترکوا طاعة الرحمن واظھروا الفساد وعطلوا الحدود و استاثروا بالفیء واحلوا حرام الله وحرموا حلال الله وانا احق من غیر .(۲)

"اس قوم نے شیطان کی اطاعت اپنالی ہے اور رحمان کی اطاعت چھوڑ دی ہے، انہوں نے فساد پھیلا دیا ہے، حدود خدا کو معطل کر دیا ہے، فئی المسلمین کو اپنے لئے خاص کر دیا ہے. انہوں نے حرام خدا کو حلال اور حلال خدا کو حرام کر دیا ہے جب کہ میں خلافت کا دوسروں سے زیادہ حق دار ہوں"

---

(۱) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص۳۱۴

(۲) تاریخ طبری، ج۳، ص۳۰۶

۴۔۳) شرعی حکومت میں سرکشی وخروج

شیعہ عقیدے کے مطابق حکومت حق اور شرعی حکومت امام معصومؑ کی امامت اور رہبریت میں قائم ہوتی ہے اور غیبت کے دور میں اسے امام معصومؑ کی طرف سے اذن کی ضرورت ہے جو کہ جامع الشرائط فقہاء کو دیا گیا ہے۔

مسلّم ہے کہ امام معصومؑ کی حکومت میں ان کے خلاف سرکشی وخروج ناقابل توجیہ ہے، کیونکہ عصمت کی خصوصیت کے پیش نظر ان سے کسی غلطی، اشتباہ، انحراف یا گناہ کا امکان ہی موجود نہیں ہے، لہٰذا ان کے خلاف سرکشی قطعی طور پر بغاوت شمار ہوگی، جس کا مقابلہ کرنا واجب ہے. اس بارے میں علامہ حلّی کہتے ہیں جو بھی امام عادل کے خلاف خروج کرے اس کے خلاف جنگ کرنا واجب ہے(۱) اور اگر امام غائب ہوں اور ولی فقیہ جامع الشرائط کی حکومت برقرار ہو تو اس صورت میں خروج کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟

جیسا کہ یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ نظریہ حق الٰہی میں حکمران کی اطاعت اذن الٰہی کی حدود میں کی جاسکتی ہے. ان حدود سے باہر قطعاً اس کی اطاعت جائز نہیں ہے، لہٰذا کسی حکمران کی اطاعت مطلقہ قابل قبول نہیں ہے، جیسا کہ حضرت امیرؑ نے فرمایا:

لا طاعت المخلوق فی معصیة الخالق . (۲)

''کہ خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو تو وہاں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی''

ائمہ معصومینؑ میں عصمت کی وجہ سے چونکہ کوئی فرمان یا عمل ان سے خلاف شرع صادر ہی نہیں ہوگا کہ ان کے خلاف خروج کی ضرورت پیش آئے، لیکن معصومین کی طرف سے جنہیں غیبت کے دور میں منصوب کیا گیا ہے ان کی اطاعت کی حدود صرف شرعی احکام اور اجتماعی مصالح ہیں جیسا کہ حضرت امیر المومنینؑ نے جب مالک کو مصر کی گورنری پر منصوب فرمایا تو اس کی بہت تعریف وتمجید فرمائی اور پھر مصر والوں سے ارشاد فرمایا:

---

(۱) تذکرۃ الفقہاء، ج۹، ص۴۱۰

(۲) نہج البلاغہ، حکمت ۱۶۵

...... فاسمعوا له واطيعوا امره فيما طابق الحق (۱)

''مالک کی اطاعت کرو اس کے ان اوامر میں جو حق کے مطابق ہوں''

اسی طرح آپ نے جب عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا حاکم منتخب فرمایا تو بصرہ والوں سے ارشاد فرمایا:

''جب تک یہ خدا اور اس کے رسول کے مطیع رہیں ان کی اطاعت کرو، اگر کسی بدعت کے مرتکب ہوں یا حق سے منحرف ہو جائیں تو فوراً مجھے بتلاؤ تا کہ اسے معزول کر دوں'' (۲)

البتہ حاکم کے کاموں میں حق و باطل کے تعین، یا حکومت کے کاموں اور ان کی طرف سے جاری کردہ احکام میں حق و باطل کی تعین صرف ان لوگوں سے ممکن ہے کہ جو اسلامی حقوق کے مبانی اور شرعی معیار سے مکمل واقفیت کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضوں سے بھی مکمل آگاہ ہوں.

اس کے علاوہ جو چیزیں حاکم کا اشتباہ یا انحراف شمار ہوتی ہیں اس کی مختلف صورتیں ہیں کہ ان میں سے بعض تقویٰ و عدالت کے معیار سے ہٹ کر ہیں اور بعض کا تعلق اسلامی مسائل یا اجتماعی معاملات کو غلط سمجھنے سے ہے (۳) اور ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کو مدنظر رکھنا چاہیے کیونکہ تقویٰ و عدالت کے معیار سے ہٹنا کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہے. اس سے حاکم خود بخود معزول ہو جائے گا اور اس کی حکمرانی کا جواز ختم ہو جائے گا. لیکن اگر حالات و مسائل کے صحیح تجزیہ و تحلیل میں غلطی کا مرتکب ہو جائے اور وہ بھی نادر اتفاق ہو یا اس وجہ سے ہو کہ اس نے اس معاملے کے ماہرین سے مشورہ نہ کیا ہو اور خود فیصلہ کر لیا ہو تو ایسا سب حکومتوں میں پیش آتا رہتا ہے یہ عقلی و شرعی طور پر بھی چشم پوشی کے

---

(۱) نہج البلاغہ، خط ۳۸

(۲) شیخ مفید، الجمل، ص ۴۲۰

(۳) مشروعیت و مقاومت، ص ۱۰۶

قابل ہے، جیسا کہ شہید صدر اس بارے میں فرماتے ہیں: جب مجتہد ولی امر مسلمین ہونے کے ناطے نہ کہ قاضی ہونے کے ناطے کوئی حکم صادر کرے تو اس حکم کا توڑنا جائز نہیں ہے اگر چہ اس کے مخالف واقع ہونے کا علم ہی کیوں نہ ہو جائے، جسے اس حکم کے خلاف واقع ہونے کا علم ہو جائے وہ اس حکم کی مخالفت کے عنوان سے اپنے علم پر عمل نہیں کر سکتا.(۱)

لیکن اگر حاکم سے غلطیاں پے در پے ہوں تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس میں اجتماعی معاملات کے صحیح ادراک اور ان کے حل وفصل کی صلاحیت لازم موجود نہیں ہے، اس سے اس کی رہبریت کی صلاحیت زائل ہو جائے گی اور وہ اس منصب کے لائق نہیں رہے گا.

نمائندوں کے خلاف سرکشی

سرکشی کی ایک اور قسم حاکم اسلامی کے نمائندوں اور کارندوں کے مقابل سرکشی کرنا ہے، شہید بہشتی اس بارے میں فرماتے ہیں: اگر قانونی ادارے اپنی قانونی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی کریں اور خلاف اسلام روشوں اور طریقوں کے سامنے رکاوٹ ایجاد نہ کریں تو افراد اور اسلامی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ اوپر والے ذمہ دار افراد سے دخالت کی درخواست کریں اگر وہ بھی توجہ نہ کریں اور اسلامی معاشرے کی مصلحتوں کو خطرہ درپیش ہو جائے تو پھر افراد اور اسلامی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ بلا واسطہ رہبر وحاکم سے رابطہ کر کے اس بارے حکم دریافت کریں اور ولی امر کے حکم کے مطابق خود عمل کریں تا کہ اس طریقے سے اسلامی مملکت کی حفاظت کا فریضہ بھی ادا ہو جائے اور معاشرے میں بدنظمی وآشوب کی صورتحال بھی پیدا نہ ہونے پائے.(۲)

امام خمینیؒ نے بھی کارندوں کی اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے کوتاہی کی صورت میں راستہ کھلا رکھا ہے، آپ نے اپنی الٰہی سیاسی وصیت میں ارشاد فرمایا ہے جو چیز شرعا

---

(۱) صدر سید محمد باقر، منہاج الصالحین، ج۱، ص۱۱

(۲) مواضع ما، ص۶۹

حرام ہو اور ملک وملت کے مستقبل کے لئے نقصان دہ ہو اور مملکت اسلامی کی حیثیت کے خلاف ہو اگر سختی سے اسے روکا نہ جائے تو سب لوگ اس کے ذمہ دار ہیں، اگر لوگوں اور حزب اللہی جوانوں کو کہیں ایسی صورتحال نظر آئے تو ان پر مربوط افراد کو اطلاع دینا لازم ہے اگر وہ لوگ اس بارے میں کوتاہی کریں تو خود اس بارے میں اقدام کر کے اسے روکیں۔(۱)

عاشورہ اور دین وسیاست میں رابطہ

سوال۲۶ : کیا امام حسین علیہ السلام کا قیام اورعاشورائی نہضت ان لوگوں کے خلاف دلیل بن سکتے ہیں جو دین و سیاست کی جدائی کے قائل ہیں (یعنی سیکولرازم)؟

جواب: بعض لوگ دین وسیاست کی جدائی ثابت کرنے کے لئے یہ بات کرتے ہیں کہ امام حسینؑ کا قیام سو فیصد ڈیموکریٹک اور لوگوں کی خواہش کے مطابق انجام پایا، اس طریقے سے وہ لوگ خداوند کی حاکمیت نفی کی نسبت امام حسینؑ کی طرف دیتے ہیں ان کے بقول:

> ”امام حسینؑ کا مدینہ سے مکہ کی طرف سفر اور مکہ سے کربلا وکوفہ کی طرف سفر، کوفہ کے لوگوں کی باقاعدہ دعوت اور خطوط اور شدید اصرار کی وجہ سے تھا، تا کہ آپ انہیں اموی حکمرانی کے ظلم وفساد سے نجات دلا کران کی حکمرانی وامارت کے معاملات خود سنبھالیں، یہ دعوت سو فیصد عوامی اور ڈیموکریٹک تھی“

امام حسینؑ کی جنگ، نہضت آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت جو کہ ایک مکمل دفاعی عمل تھا جو اسلام کی حیثیت اور اپنی جان و ناموس کی حفاظت کی خاطر انجام پایا، اس

---

(۱) صحیفہ امام، ج۲۱،ص۴۳۶

کے علاوہ آپ کا عمل یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ امام اور اسلام کی نظر میں خلافت وحکومت نہ یزید وخلفاء کا حق تھی، نہ آپ کا اپنا حق تھی اور نہ خدا کی طرف سے تھی بلکہ امت کی طرف سے ان کے اپنے انتخاب سے تھی۔(۱)

تاریخی واقعات اور امام حسینؑ کی گفتگوؤں کی تحلیل سے مکمل واضح ہو جاتا ہے کہ امام حسینؑ کے سیاسی اقدامات الٰہی ودینی تھے جو کہ سیکولرازم کے حامی حضرات کے نظریہ کو رد کرتے ہیں۔ اس موضوع کی وضاحت اور یہ کہ امام حسینؑ کے اقدامات کس نوع کی حکومت کی خاطر تھے، ضروری ہے کہ دینی حکومت اور سیکولر حکومت کے درمیان اہم فرق کو بیان کیا جائے کیونکہ حکومت کی یہ دو اقسام بڑے اہم امور جیسے حکومت کا فلسفہ اور اس کے اہداف، حکومت کے جواز کی نوعیت، اسلامی حاکم کی شرائط وغیرہ میں بنیادی فرق رکھتی ہیں، لہٰذا مختصر طور پر ان موضوعات کے بارے میں سید الشہداء کا نظریہ بیان کرتے ہیں:

پہلا) حکومت کا فلسفہ اور اہداف

امام حسین علیہ السلام سیکولر یا دنیا میں رائج دوسرے نظام حکومت کے برخلاف حکومت کے مقاصد کو لوگوں کے امن وامان، دنیاوی آسائش اور معیشت جیسے مسائل سے کہیں بڑھ کر سمجھتے تھے، آپ نے مدینہ سے نکلنے سے پہلے کہ جب ابھی تک کوفیوں کی دعوت وبیعت کی بات ہی نہیں ہوئی تھی، اپنے قیام کے مقاصد واہداف میں سے ایک ہدف معاشرہ کی اصلاح اور وظیفہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی انجام دہی کو قرار دیا۔

انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ارید

ان امر بالمعروف و انهیٰ عن المنکر (۲)

امام علیہ السلام کے اس ہدف کا معنی یہ ہوگا کہ اگر امام قطع نظر از علم غیب کوفیوں کی عہد شکنی اور حکومت کے تشکیل نہ پا سکنے کے بارے میں مطمئن ہوتے تب بھی آپ قیام ضرور فرماتے

---

(۱) مھدی بازرگان، آخرت و خدا ھدف بعثت تھران، ص۴۳

(۲) بحار الانوار

کیونکہ آپ کے قیام کا اصلی مقصد دین کا احیاء تھا، حکومت واقتدار تو بعد کے مراحل سے مربوط تھے، امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے آخری ایام میں حج کے موسم میں منیٰ میں ایک تو بڑا اہم خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس دور کی بڑی بڑی سیاسی و مذہبی شخصیات بھی موجود تھیں اس میں آپ نے حکومت کے حصول کے حوالے سے اپنے مقاصد کو یوں بیان فرمایا:

اللھم انک تعلم انہ لم یکن ما کا ن منا تنا فسا فی سلطان ولا التما سا فی فضو ل الحطا م ولکن لنزی المعالم من دینک ونظھر الاصلاح فی بلا دک و یا من المظلومون من عبا دک و یعمل بفرا ئضک و سننک واحکا مک .(۱)

آپ نے فرمایا نہ حکومت حاصل کرنے کا شوق ہے اور نہ دنیاوی مال وثروت حاصل کرنے کی تمنا بلکہ میرا مقصد درج ذیل امور ہیں:

۱) دین الٰہی کی نشانیوں کو آشکار کرنا

۲) روئے زمین پر اصلاح کرنا

۳) مظلوموں کے لئے امنیت ایجاد کرنا

۴) الٰہی واجبات، سنن اور احکام پر عمل کو ممکن بنانا (۲)

امام حسین علیہ السلام نے مکہ سے کوفہ کے راستے میں منزل صفاح پر فرزدق جو سے گفتگو فرمائی اس میں آپ فرماتے ہیں:

یا فرزدق ان ھولاء قو م لزمو ا طا عۃ الشیطا ن وتر کوا اطاعۃ الرحمن واظھر وا لفسا د فی الا رض، وابطلوا

---

(۱) تحف العقول، ص ۲۴۳

(۲) سید جواد ورعی، حکومت از دید گاہ امام حسینؑ، ص ۲۸۸

الحدود و شربوا الخمور و استاثروا فی اموال الفقرا و المساکین وانا اولی من قام بنصرة دین اللّٰہ واعزاز شرعة والجهاد فی سبیلہ لتکون کلمة اللّٰہ هی العلیاء.(۱)

اس گفتگو میں امام پاکؑ بنی امیہ کو اسلامی معاشرے کے اندر سب سے پہلے حقیقی سیکولر کے طور پر ذکر کرتے ہیں، جو دین الٰہی کو ایک طرف کر دینا چاہتے ہیں اور آپ ان کے مقابلے سے اپنا مقصد دین الٰہی کی برپائی بیان کرتے ہیں اور آپ بڑی وضاحت سے حکومت کا فلسفہ کلمۃ اللہ کی برتری کو قرار دیتے ہیں اور واضح ہے کہ اگر دین خدا مکمل طور پر رائج ہو جائے تو اسی میں لوگوں کی دینی واخروی سعادت ہے۔

دوسرا) الٰہی حکومت کا جواز

امام حسین علیہ السلام کی گفتگو اور خطبات پر توجہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حکومت کا جواز صرف الٰہی ہونے کی صورت میں ہے اور فقہاء کی حکومت کو یہ الٰہی جواز حاصل ہے۔ لوگوں کی بیعت اور رائے کو جواز و مشروعیت حکومت میں کوئی دخالت حاصل نہیں ہے، اگرچہ حکومت کے موثر ہونے میں یہ چیز دخیل ہے اور ناواقف، مغرب زدہ یا مفاد پرست افراد جو حکومت کو سیکولر قرار دیتے ہیں (حتیٰ کہ ظہور و حضور امام کے دور میں بھی) ان کا مقصد حکومت سے الٰہی و آسمانی پہلو کا انکار کرنا ہے۔

جب مدینہ کے گورنر نے امام حسین علیہ السلام سے یزید کی بیعت کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا:

ایها امیر انا اهل بیت النبوة و معدن الرسالة و مختلف الملائکة و محل الرحمة و بنا فتح اللّٰہ وبنا

---

(۱) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص۳۳۶

بختم و یزید رجل فاسق شارب الخمر و قاتل النفس

المحترمة معلق بالفسق و مثلی لا یبایع مثله (۱)

اس گفتگو میں آپ اسلامی معاشرہ پر اپنے استحقاق حکومت اور حکومت یزید کے ناجائز وغیر مشروع ہونے کے دلائل ذکر کرتے ہیں جس میں فرمایا یزید، الٰہی انتخاب نہ رکھنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اسلامی مملکت کی حکمرانی و رہبری کا جواز نہیں رکھتا بلکہ الٰہی محارم کے ارتکاب اور حدود الٰہی کی پاسداری نہ کرنے کی وجہ سے اس کی بیعت میں کسی قسم کی کوئی مصلحت بھی نظر نہیں آتی.

اکثر لوگوں کی طرف سے یزید کی بیعت کے باوجود امام حسین علیہ السلام کی اس کی بیعت نہ کرنا اور اس کے خلاف قیام کرنا ثابت کرتا ہے کہ حاکم کی الٰہی مشروعیت ضروری ہے اور دین و سیاست میں گہرا ارتباط موجود ہے جس سے سیکولر نظریہ کا رد ثابت ہوتا ہے اگرچہ آپ یزید کے خلاف قیام نہ کرتے تب بھی آپ کا صرف یزید کی بیعت نہ کرنا بھی اس مطلب کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھا. امام حسینؑ نے متعدد مواقع پر یہ بات ذکر کی کہ ہم ائمہ علیہ السلام کو حکومت کا جواز و مشروعیت وحی و پیغمبر اکرمؐ کے ذریعے حاصل ہوئی ہے آپ فرماتے ہیں.

ان مجاری الامور والاحکام علی ایدی

العلماء باللّٰہ الامناء علی حلالہ و حرامہ (۲)

اس روایت میں بڑی وضاحت سے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ آپ نہ صرف لوگوں کو حکومت کا متولی نہیں سمجھتے بلکہ آپ کی نظر میں حکمرانی کا حق علماء کو حاصل ہے کہ اس کے یقینی مصداق خود ائمہ معصومینؑ ہیں. (۳)

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۴ ص ۳۲۵

(۲) قدردانی قراملکی، محمد حسن، سیکولاریسم، درمسیحت و اسلام، ص ۳۱۷

(۳) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص ۲۷۸

جب عبداللہ بن زبیر نے آپ سے یزید کی بیعت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا ہرگز اس کی بیعت نہیں کروں گا اور اس کی وجہ یہ ذکر کی کہ بھائی حسن کے بعد اسلامی معاشرہ میں حاکیت وحکمرانی کا حق صرف مجھ کو حاصل ہے.

انی لا ابایع له ابدا لا ن الا مر انما کان لی من بعد اخی الحسن(۱)

اسی طرح آپ نے بصرہ والوں کو جو خط لکھا اس میں فرمایا:

ہم اہل بیت رسول ہیں، ہم ان کے ولی، وہی اور وارث ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے لئے سب سے زیادہ ہم حقدار ہیں، دوسروں نے یہ حق ہم سے چھین لیا اور ہم وحدت کی خاطر خاموش ہو گئے، حالانکہ ہم یہ بات جانتے تھے کہ امر ولایت کے ہم ہی حقدار ہیں.(۲)

اسی طرح کوفہ کے سرکردہ افراد کے نام خط میں آپ نے فرمایا:

انی احق بهذ ا الا مر لقرابتی من رسول الله (۳)

''میں امر حکومت کا زیادہ حق رکھتا ہوں اپنی قرابت رسول کی وجہ سے''

تیسرا) اسلامی حاکم کی شرائط

امام حسین علیہ السلام کی نظر میں حکومت کا فلسفہ ومقصد دینی احکام وقوانین کی حکمرانی ہے، تاکہ اس کے زیر سایہ لوگوں کو دنیا وآخرت کی سعادت حاصل ہو سکے اور اس کی مشروعیت وجواز صرف الٰہی انتخاب ونصب سے ہے، لہذا حاکم کے لئے خاص شرائط کا ہونا

---

(۱) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص۳۱۵

(۲) حوالہ سابق، ص۳۷۷

(۳) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص۳۱۷

ضروری ہوگا. جیسے:

۱) احکام الٰہی کا علم

امام حسین علیہ السلام کی خلفاء کے ساتھ مخالفت کا ایک محور یہی نکتہ تھا. آپ نے ایک گفتگو میں خلیفہ دوم کو ارشاد فرمایا:

صرت الحاکم علیھم بکتاب نزل فیھم لا تعرف معجمہ ولا تدری تاویلہ الا سماع الاذان (۱)

''تم ان پر حاکم بن گئے ہو اس کتاب کے ذریعے جو ان (اہل بیتؑ) پر نازل ہوئی اور تم اس کتاب سے کچھ نہیں جانتے، نہ سر بستہ مطالب کو نہ تاویل کو سوائے اس کے جو سنی سنائی باتیں ہیں''

آپ نے منٰی میں بہت سی سیاسی و مذہبی شخصیات کے اجتماع میں فرمایا:

''امور کا اختیار علماء باللہ کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جو کہ خداوند کے حلال و حرام کے امین ہیں اور امام کی موجودگی میں حضور امام میں اس کا روشن مصداق خود امام معصومؑ ہے''

۲) خدا کی کتاب اور سنت رسول پر عامل ہو

آپ نے کوفیوں کے نام اپنے ایک خط میں اس بارے میں فرمایا:

فلعمری فا الامام الا العامل بالکتاب والآخذ با لقسط والدائن بالحق والحابس نفسہ علی ذات اللہ (۲)

اس فرمان میں آپ نے واضح لفظوں میں قرآن پر عمل اور راہ خدا میں اپنے آپ کو وقف کر دینے کو حاکم کی شرائط میں قرار دیا ہے.

---

(۱) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص۱۱۷

(۲) موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص۳۱۳

۴) عدالت برپا کرنے والا ہو

امام حسینؑ کی نظر میں اسلامی حکمران کی اہم ترین شرائط میں سے عدل وانصاف کا برپا کرنا ہے، جیسا کہ آپ نے کوفیوں کے نام اپنے خط میں اس بارے فرمایا والآخذ بالقسط اور نیز متعدد دوسرے موارد میں آپ نے خلفاء اور اموی حکمرانوں کی عدم مشروعیت کی وجہ اس شرط کے نہ ہونے کو قرار دیا۔

بنا بریں امام حسینؑ اور عاشورائی فرہنگ کے مطابق دین کا سیاست کے ساتھ انتہائی محکم واٹوٹ رابطہ ہے، حکومتوں کے اہداف ومقاصد، حاکم وامیر کی شرائط وجواز، حکومت کی کارکردگی سب کے سب الٰہی تعلیمات واحکام کی بنیاد پر ہونے چاہئیں اور اسی ہدف کی خاطر ہوں تاکہ دنیاوی وآخرت کی سعادت کی ضمانت فراہم ہوسکے۔

ابن زیاد کا قتل نہ کیا جانا

سوال ۲۷ : حضرت مسلم بن عقیل کو باوجود اس کے کہ ابن زیاد کے قتل کا موقع ہاتھ آچکا تھا آپ نے اسے قتل کیوں نہ کیا؟

جواب : اہل بیت عصمت وطہارت اور قرآن کریم کی تعلیمات میں ظلم وستم اور دھوکہ و فریب کے ساتھ دشمن کے خلاف کامیابی کو صحیح نہیں سمجھا گیا، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے دور میں ایک جنگ میں دشمن کے افراد ایک جنگل میں چھپ گئے، آپ کو مشورہ دیا گیا کہ اس جنگل کو آگ لگا دیں تو آپ نے ظلم وستم سے اجتناب کے عنوان سے فرمایا:

لا اطلب النصر بالجور (۱)

''میں ظلم وستم کے ساتھ قطعاً کامیابی حاصل نہیں کروں گا''

حضرت مسلم بن عقیل کی تربیت بھی اسی مکتب اسلام واہل بیتؑ میں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ جب ہانی اور شریک بن اعور مریض تھے اور ان کی عیادت کے لئے ابن زیاد ان کے گھر آتا

---

(۱) مقتل ابی مخنف

چاہتا تھا تو شریک نے مسلم سے کہا جب ابن زیاد یہاں آئے تو اسے قتل کر دینا اور دارالامارہ جا کر قبضہ کر لینا، لیکن مسلم کے میزبان ہانی بن عروہ نے اس تجویز کی مخالفت کی، ابن زیاد آکر عیادت کرنے کے بعد اٹھ کر چلا گیا اور شریک نے مسلم سے یہی سوال پوچھا آپ نے اسے کیوں قتل نہ کیا تو آپ نے فرمایا اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو ھانی بن عروہ راضی نہیں تھا کہ خون ابن زیاد اس کے گھر میں گرایا جائے، دوسرا رسولؐ خدا سے روایت ہوئی ہے کہ:

ان الا یمان قید الفتک ولا یفتک المومن.(۱)

''ایمان دھوکے سے قتل میں مقید ہے اور مومن ایسا کام نہیں کرتا''

ھانی نے کہا ہاں اگر آپ اسے قتل کر دیتے تو یہ فاسق فاجر اور حیلہ باز شخص کا قتل ہوتا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا خون میرے گھر میں گرایا جائے.(۲)

ٹیرر (دھوکہ سے قتل) کا عدم جواز

سوال ۲۸: حضرت مسلم کے اس واقعہ کے پیش نظر کیا اسلامی مملکت میں کسی شخص کے اس طرح قتل کا حکم دیا جا سکتا ھے یا بغیر کسی حکم کے کسی کو اس طرح قتل کیا جا سکتا ھے ؟

جواب : اسلام لوگوں کے چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں شرف واحترام پر تاکید کرنے کے علاوہ اسلامی مملکت میں رہنے والے افراد کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں سے قرار دیتا ہے، جان کی حفاظت اور حق زندگی اسلام کی نظر میں اس حد تک اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام ایک بے گناہ انسان کے قتل کو تمام انسانوں کا قتل اور ایک شخص کو زندگی دینے کو تمام انسانوں کو زندگی دینے کے برابر قرار دیتا ہے.(۳)

---

(۱) وقعه الطف، ص۱۱۴

(۲) تاریخ طبری، ج۴، ص۲۷۱

(۳) مائده /۳۲

لہٰذا زندگی کا حق خدا کا عطا کردہ ہے اور اسے چھیننے کا کسی کو حق نہیں ہے سوائے ان ضروری موارد کے کہ جہاں ارتداد (جو کہ اسلامی معاشرہ کے عمومی نظم وامنیت کو تباہ کر دیتا ہے) یا اسلامی نظام کے خلاف بغاوت وجنگ یا بے گناہوں کے قتل جیسی صورت حال پیش آجائے تو یہ خاص موارد اپنا حکم رکھتے ہیں ۔اگر کوئی شخص اپنے ظلم وزیادتی اور اپنے اختیارات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ سے حق زندگی چھین لے اور کسی اسلامی سزا کا اپنے آپ کو مستحق بنالے تو یہ سب بھی اسلام کے عادلانہ نظام عدل کے اصولوں کے مطابق انجام پائے گا اور قتل کے حوالے سے صریح وصاف جواب کے لئے مفہوم شناسی کی بحث کی ضرورت ہے.

ڈیوڈ آرون شورٹز نے ایک مقالہ بعنوان ''بین الملل ٹیرز اور اسلامی حقوق'' میں لکھا ہے، اس چیز کے بارے صحیح قضائی نقطہ نظر مغربی قوانین کی نظر میں منحصر نہیں ہونا چاہیے، مغرب اگر بین الاقوامین ٹیررازم کو صحیح طور پر سمجھ کر روکنا چاہتا ہے تو اسے دیکھنا ہوگا کہ اسلامی حقوق یعنی شریعت کا نظریہ ٹیرر اور شہادت کے حوالے سے کیا ہے اور اس کا کیا حل پیش کرتا ہے.(۱)

لہٰذا اب ہم اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے پہلے مغربی ادب اور پھر اسلامی ادب میں ٹیرر کے مسئلہ کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں:

الف) ٹیرر (دہشت گردی) مغربی ادب

مغربی لغات میں ٹیرر کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''ایک فرد یا گروہ کا جابرانہ رویہ اپنانا یا دہشت گردی ودھونس جیسے طریقوں سے کوئی سیاسی مقصد یا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا''

مغرب میں ٹیرر کے مفہوم کی بہت اہمیت ہے کہ ہر ملک نے اپنے مفادکی بنیاد پر

---

(۱) مجلہ سیاست خارجی سال ھفتم تابستان و پائنہ ۱۳۷۲،شمارہ ۲و۳،ص ۴۳۰

اس کی الگ تعریف کی ہے جس کی وجہ سے اس کے مصادیق میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ مثلاً جو لوگ یا طبقات زندگی کے حق سے محروم ہیں وہ جو سخت اقدامات اٹھاتے ہیں اگرچہ وہ عام عوام کے خلاف نہ ہوں کیا انہیں بھی دہشت پسندی کی زمرے میں شمار کیا جائے گا۔

کیا فلسطینی جنہیں تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ جب وہ اسرائیل کی دہشت گردی کے خلاف اپنا دفاع کرتے ہیں مورد مذمت قرار پائیں گے، لہٰذا انہیں اسرائیلی غاصبوں کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے؟ یا اصل دہشت گرد اسرائیل اور اس کی حامی ان حکومتوں کو قرار دیا جانا چاہیے جنہوں نے ناحق ان انسانوں کو حق زندگی سے محروم کر دیا ہے؟

ب) اسلامی ادب میں ٹیرر

اسلامی ادب میں ٹیرر کے ہم معنی و مترادف لفظ ''الفتک'' ہے جس کے معنی کسی کو دھوکے سے یا چھپ کر قتل کرنے کے ہیں۔

فقہی نقطہ نظر سے :

ا) بے گناہ انسانوں کا قتل حرام ہے، چاہے وہ کسی فرقے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اور جہاں پر بھی ہوں۔ رہبر معظم انقلاب سید علی خامنہ ای نے امریکہ میں نائن الیون (نو ستمبر) کے واقعہ کی جس میں بہت سے بے گناہ افراد مارے گئے تھے مذمت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

> ''اسلام کی نظر میں بے گناہ و بے دفاع انسانوں کا قتل چاہے وہ عیسائی ہوں یا مسلمان یا کوئی اور، ہر جگہ پر ہر طریقہ سے ایٹم بم کے ساتھ یا میزائل کے ساتھ یا کیمیائی اسلحہ کے ساتھ یا جنگی جہازوں کے ساتھ کوئی ملک یا تنظیم یہ کام کرے سب کے سب حرام ہیں اور فرق نہیں کرتا کہ یہ قتل ہیروشیما ہو، ناگاساکی میں

ہو، قانا میں ہو، صبرا وشتیلا میں ہو، دہر یاسین میں ہو، یا بوسنیا میں ہو، عراق میں ہو یا واشنگٹن و نیویارک میں ہو"

اسی وجہ سے رسولؐ خدا سے روایت وارد ہے:

الا یمان قیدالفتک یا الاسلام قید الفتک (۱)

یہ روایت اس مورد کے بارے میں ہے اگر چہ اس کا اطلاق دوسرے ادلہ کے پیش نظر مراد نہیں ہوگا اور اسے قید لگے گی.

۲) بعض افراد اپنے جرم کی وجہ سے مہدورالدم (جن کا خون مباح ہو) شمار ہوتے ہیں ان افراد کا قتل قوانین کے مطابق واجب ہو جاتا ہے. ان کے جرم کی نوعیت ہو سکتا ہے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شرکت کی ہو یا اسلامی نظام کے خلاف قیام کیا ہو یا اسلامی مقدسات کے خلاف سازش میں شریک ہوں جیسے رسولؐ خدا و آئمہ ہدیٰ کو گالیاں دینا یا انہیں اذیت رسانی کرنا، یا ظالم و طاغوتی حکومت کہ جس کے ہاتھ ہزاروں مسلمانوں کے خون سے آلودہ و رنگین ہوں کی مضبوطی کے لئے کوششوں میں شریک ہوں. یہ بات تاریخی طور مسلّم ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر لشکر اسلام کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے رسولؐ خدا نے تمام سپہ سالاروں کو بلا کر ارشاد فرمایا:

"میری پوری کوشش رہی مکہ بغیر خونریزی کے فتح ہو، لہٰذا تم لوگ مقابلہ نہ کرنے والوں میں سے کسی کو قتل نہ کرنا لیکن ان میں سے دس افراد ایسے ہیں کہ جنہیں جہاں بھی پاؤ حتیٰ کہ اگر غلاف کعبہ سے لٹکے ہوئے ہوں انہیں فوراً قتل کر دینا"

یہ دس افراد یہ تھے:

۱۔ عکرمہ بن ابی جہل ۲۔ ھبار بن اسود ۳۔ عبداللہ بن سعد ابی سرح

---

(۱) محمدی ری شہری، میزان الحکمۃ، ج۹، ص۴۵۰۸

۴۔ مقیس بن صبابہ لیثی ۵۔ حویرث بن نقیل، ۶۔ عبداللہ بن خطل

۷۔ صفوان بن امیہ ۸۔ وحشی بن حرب (قاتل حمزہ) ۹۔ عبداللہ بن الزبیری

۱۰۔ حارث بن طلاطلہ۔

اور چار عورتوں کا بھی یہی حکم تھا جن میں سے ایک ہند زوجہ ابوسفیان تھی اور دو عورتیں گانے والی تھیں جو رسولؐ خدا کے خلاف توہین آمیز ترانے گاتی تھیں، یہ سب افراد مجرم یا سازشی تھے جن کے بارے میں حضور اکرمؐ نے حکومتی حکم کے تحت قتل کا حکم صادر فرمایا۔(۱)

وہ نکتہ جس کی بہت اہمیت ہے وہ اس مسئلہ کے نافذ کرنے کا طریقہ کار ہے:

پہلا یہ کہ: یہ حکم مخفی و پوشیدہ نہیں ہے جب ولی امر مسلمین سمجھے کہ ایک شخص یا ایک گروہ دہشت گردی کی کاروائیوں میں مصروف رہا ہے یا سازشی عناصر ہیں جن کو ان کے جرم کی پاداش میں سزا دینا ضروری ہے جو اب اسلامی سزا میں مطلوب ہیں اور اسلامی حکومت کے قابو نہیں آرہے اس صورت میں وہ علی الاعلان یہ حکم صادر کرتے ہیں جہاں بھی ملے اسے قتل کر دیا جائے، جیسا کہ رسولؐ خدا نے مذکورہ افراد کے قتل کا حکم صادر فرمایا اور سپہ سالاروں کے ذریعہ لشکر کے تمام سپاہیوں تک یہ حکم پہنچا دیا گیا۔ اس وجہ سے تمام لشکر کو بھی معلوم ہو گیا کہ کن افراد کو قتل کیا جانا ہے اور کفار کو بھی پتہ چل گیا کہ کون لوگ مہدورالدم ہو چکے ہیں۔ اس مسئلہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے باسیوں یا دوسرے افراد کی امنیت کو خطرہ درپیش ہو، بلکہ اصل و بنیادی اصول وہی ہے کہ سب انسانوں (خواہ وہ کوئی بھی مسلک یا عقیدہ رکھتے ہوں) کی جان، ناموس اور مال محفوظ ہیں اور ان کے تمام حقوق محفوظ ہیں، سوائے ان افراد کے جنہوں نے جرم و خیانت کا ارتکاب کیا ہو، ایسی صورت میں بھی ان کا حکم واضح و علی الاعلان بیان کیا جائے گا، امام خمینیؒ نے سلمان رشدی

---

(۱) الف۔ ابن ہشام، السیرۃ النبوۃ، ج ۴، ص ۵۱، ۵۲، ب۔ تفسیر مجمع البیان، ج ۹، ۱۰، ص ۸۴۸ (تفسیر سورہ نصر) پ: القمی عباس، سفینۃ البحار، ج ۷، ص ۱۷، ت۔ واقدی محمد بن عمر مغازی، تاریخ جنگ ھای پیامبرؐ ج ۲، ص ۶۳۱، ث۔ جعفر سبحانی، فراز ھایی از تاریخ پیامبر اسلامؐ، ص ۴۳۳

کے بارے میں اس طرح حکم صادر فرمایا کہ:

''میں تمام دنیا کے غیور مسلمانوں کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ ''آیات شیطانی'' نامی کتاب کا مصنف جس نے اسلام، رسولؐ خدا اور قرآن کے خلاف کتاب لکھی ہے، نیز اس کے ناشر جو اس کتاب کے مطالب سے آگاہ و واقف تھے سب حکم اعدام (قتل) سے محکوم ہیں، میں غیرت مند مسلمانوں سے چاہتا ہوں کہ ان افراد کو جہاں بھی پائیں انہیں قتل کر دیں اور جو بھی اس راہ میں مارا جائے انشاء اللہ شہید ہوگا اور اگر کسی کو مصنف کتاب کے بارے میں خبر ہو لیکن وہ خود اس کے قتل پر قادر نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ لوگوں کو اس کے بارے میں خبر دے تا کہ اس کے اعمال کی سزا دی جا سکے۔''(۱)

اسی طرح رہبر معظم سید علی خامنہ ای مدظلہ نے بھی قانونی و غیر قانونی شدت کے حوالے سے صریح طور پر فرمایا:

''بعض سازشی عناصر کے قتل کا حکم جو کہ اسلامی عدالت کی پہنچ سے دور ہیں، اسلام میں موجود ہے لیکن حاکم اسلام جب بھی ایسا حکم صادر کرنا چاہے تو اسے صاف و علی الاعلان کہنا چاہیے نہ کہ مخفی و پوشیدہ ایسا حکم جاری کرے''

دوسرا یہ کہ: جن موارد میں مار پیٹ کی ضرورت پیش آتی ہے ساب النبی والائمہ (رسولؐ خدا اور آئمہ طاہرین کو گالی دینے والے) کے علاوہ درج ذیل امور مدنظر رکھنا ہوں گے۔

الف) ایسے تمام موارد میں آگاہ اسلامی رہبر سے اذن و اجازت کی ضرورت ہو گی (جو کہ

---

(۱) صحیفہ نور، ج۲۱، ص۸۶

غیبت امام کے دور میں فقہاء ہیں)(۱)

ب) اگر اسلامی حکومت موجود ہو تو خود حکومت جس کی سربراہی عادل، مدبر، سمجھدار اور فقیہ کے ہاتھ میں ہے اقدام کرے گی، لیکن اگر تمام شہروں میں حکومت یا موثر فقیہ موجود نہ ہو تو تمام فقہاء میں سے کوئی بھی اس کی اجازت دے سکتا ہے۔

ج) یہ اجازت کسی فرد یا جماعت کو اس کے موارد کے تعین کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ فقیہ بلند مرتبہ و بے نظیر امام خمینیؒ کے مبارزاتی پروگرام میں سرفہرست یہ تھا کہ سابق فاسد حکومت اور اس کے کارندوں کی نابودی کے لئے کوششیں کی جائیں۔

تیسرا یہ کہ: رسولؐ خدا، آئمہ ہدیٰ اور سیدہ فاطمہ زہراء علیہم السلام کو نعوذ باللہ گالی دینے والے کا الگ حکم مقرر کیا گیا ہے۔(۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام کی نظر میں بے گناہ انسانوں کا قتل دہشت گردی کے عنوان سے ہو یا اس کے علاوہ، سیاسی مقصد کی خاطر ہو یا مذہبی، مسلمان کا ہو یا عیسائی یا یہودی یا کوئی اور، دنیا میں جہاں بھی ہو، جس طریقہ سے بھی قتل کیا جائے صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ کام گناہ شمار ہوتا ہے اور اس کے مرتکب کو سزا دی جائے گی۔

اب وہ اعدام اور پھانسیاں جو انقلاب اسلامی سے پہلے انجام پائی ان کی دو قسمیں تھیں:

الف: ان میں سے بعض گروہ اور انجمنیں جیسے فدائیان اسلام یہ لوگ شرعی حدود کے پابند تھے اور مجتہدین کے ساتھ رابطے میں تھے، اگر وہ کسی کے قتل کے مرتکب ہوتے تو مجتہد جامع الشرائط سے اس کے مفسد اور واجب القتل ہونے کا باقاعدہ فتویٰ لیتے تھے جیسے ہژیر، کسروی، رزم آرا و...... وغیرہ کا قتل تھا۔ لہٰذا یہ قتل شرعی معیار کے مطابق تھا، چونکہ فقیہ جامع الشرائط کا فتویٰ اسلامی قوانین کی رو سے معتبر اور حجت ہے۔

---

(۱) تحریر الوسیلۃ، ج ۱، ص ۴۶۲

(۲) مزید تفصیلات دیکھیں: الف: فاضل لنکرانی، تفصیل الشریعہ فی شرح تحریر الوسیلہ کتاب الحدود، ص ۳۲۵، ۳۱۸، ب موسوی اردبیلی آیت اللہ سید عبدالکریم، فقہ الحدود والتعزیرات، ص ۵۲۱-۵۱۱

ب: وہ قتل جو سیاسی اہداف وغیرہ کی خاطر بغیر کسی فقہی وشرعی حکم کے انجام پاتے جیسے کہ مجاہدین خلق یا کیمونسٹوں نے قتل کئے ایسے قتل اسلامی قوانین کے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوں گے.

عاشورہ اور اسلامی انقلاب

سوال ۲۹: کس دلیل کی وجہ سے آپ مدعی ھیں کہ انقلاب اسلامی ایران قیام امام حسین علیہ السلام سے متاثر تھا، عاشورہ کا اس انقلاب کی پیدائش اوراس کی بقاء میں کیا کردار ھے؟

جواب: بہت سے دانش منداور مفکر جنہوں نے اسلامی انقلاب کے اسباب وعوامل کے بارے میں گفتگو کی ہے یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی عنصر وہ اہم اور قوی عامل ہے جس نے انقلاب اسلامی کی پیدائش اور کامیابی میں بڑا موثر کردار ادا کیا.(۱)

فرانس کے مشہور فلسفی اور جدید ماڈرن پوسٹ کا نظریہ دینے والے میشل فوکو اسلامی انقلاب کے عوامل کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہوئے ''سیاسی معنویت گرائی'' کا نام لیتے ہیں ان کی نظر میں اسلامی انقلاب کی روح اس حقیقت میں نظر آتی ہے کہ ایرانی اپنے انقلاب کے دوران اپنے اندر ایک تحول وتغیر کی جستجو میں تھے. اپنے انفرادی، اجتماعی وجود اور اپنی اجتماعی وسیاسی زندگی ایک بنیادی تحول اپنے فکر ونظر میں ایجاد کرنا ان کا اصلی مقصد وہدف تھا. انہوں نے اصلاح کو اسلام میں پایا اور اسلام ان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل، مشکلات اور نقائص کا واحد حل تھا.(۲)

---

(۱) نمونہ کے طور پر دیکھیں: عمید زنجانی انقلاب اسلامی ایران و ریشه آن سید حمید روحانی، نهضت امام خمینی منوچهر محمدی، تحلیل بر انقلاب اسلامی، علی دوانی، نهضت روحانیون ایران، جمیله رویا وبی انقلاب اسلامی ایران وا مریکه.

(۲) میشل فوکو، ایرانی هاچه رویا یدر سر دارند؟ ترجمہ حسین معصومی ہمدانی

آصف حسین اپنی کتاب ''ایران اسلامی انقلاب وضد آن'' میں اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کا مطالعہ کرتے وقت آئیڈیالوجی، اسلامی پوزیشن، مشروعیت (شرعی جواز) تعلیمات اور خصوصاً رہبریت کے عناصر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔(۱)

حامد الگار بھی اپنی کتاب ''ریشہ ھائے انقلاب اسلامی'' میں انقلاب اسلامی کی جڑیں تشیع، امام خمینیؒ کی رہبریت اور اسلام کو آئیڈیالوجی کے طور پر پیش کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف انقلاب اسلام کے وقوع میں رائج سیاسی ادب پر نظر کرنے اور شعار، تقریریں، انقلابیوں اور اس نہضت کے رہبروں کے بیانات سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ مذہبی عناصر میں نہضت امام حسینؑ اور فرہنگ عاشورہ نے اس حوالے سے بڑا موثر کردار ادا کیا ہے۔ عاشورائی تعلیمات درج ذیل امور پر مشتمل ہیں:

۱) فرہنگ عاشورہ

۲) حق وباطل کی دائمی جنگ کی فرہنگ

۳) طاغوت وباطل سے نفرت وجہاد کی فرہنگ

۴) رضائے خدا اور مسلمانوں کے مصالح ومنافع کی پیروی کا اصول

۵) عمومی نظارت یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی فرہنگ میں جرم وفساد کے واقع ہونے سے پہلے اسے روکنے کی فرہنگ

ان عناوین کا انقلاب کی پیدائش اور کامیابی میں بڑا موثر کردار تھا اور انقلاب اسلامی کی بقاء بھی انہی محوروں پر حرکت کے مرھون منت ہے۔ مزید معلومات کے لئے ہم ان چند محوروں پر ذرا تفصیلی گفتگو کرتے ہیں:

پہلا: انقلاب اسلامی کی پیدائش میں عاشورائی فرہنگ کے اثرات

---

(۱) منقول از ضیافت ھای نظری پر انقلاب اسلامی، مجموعہ مقالات عبدالوھاب فراتی، ص ۲۹۷

۱) انقلابیوں کے اھداف و مقاصد پر اثرات

ایرانیوں کا انقلاب سے ہدف ومقصد یہ تھا کہ ظلم واستبداد کو نابود کر کے عدل الٰہی کی حکومت کو برپا کریں اور معروف کے عنوان سے اسلام کے احکام کا قیام ہو اور منکر کے عنوان سے غیروں سے وابستگی کو روکیں اور یہ وہی ہدف ومقصد ہے جو امام حسینؑ نے اپنے قیام میں ذکر فرمایا تھا کہ:

انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ارید ان امر بالمعروف و نهی عن المنكر وسير بسيرة جدی وابی علی ابن طالب.

اگر یزید بن معاویہ علی الاعلان فسق وفجور کا مرتکب ہوتا تھا تو ایران کا شاہی پہلوی خاندان بھی اسی طرح کا کردار رکھتا تھا، مثال کے طور پر وہ اسلام کے قلع قمع میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ انہوں نے ہجرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ کو شہنشاہی تاریخ میں تبدیل کر دیا، امام خمینیؒ انقلاب اسلامی کے اہداف ومقاصد پر عاشورہ کے اثرات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے سب کو سکھلا دیا کہ ظلم وستم اور ظلم وجابر حکومت کے مقابل کیا کرنا چاہیے؟(۱)

بعض علماء اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے قیام کا اہم مقصد اسلامی حکومت کا قائم کرنا تھا، اس بارے میں امام خمینی فرماتے ہیں ''امام حسین علیہ السلام، صاحب الامرؑ اور سب انبیاء کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ ظلم وجور کے مقابل حکومت عدل قائم کرنے کی کوشش کریں.(۲) یہی وجہ ہے کہ انقلاب اسلامی کے نعروں میں سے یہ نعرہ بہت مشہور رہا:

"نهضت ما حسيني اے رهبر ما خميني اے"

---

(۱) قیام عاشورہ، کلام و بیان امام خمینی،ص۵۵

(۲) حوالہ سابق،ص۳۸

"تحریک ہماری حسینی ہے، رہبر ہمارے خمینی ہیں"

۲) رہبر انقلاب پر اثرات

امام حسین علیہ السلام کی سنت و روش کے حامل رہبر انقلاب امام خمینیؒ کا وجود نہضت عاشورہ کے اہم ترین اثرات میں سے ایک اہم اثر تھا، انقلاب اسلامی کی پیدائش میں ایرانی امام حسین علیہ السلام کی شجاعت، دلیری، استقامت، لہجے کی پختگی اور باطل کے سامنے سر نہ جھکانے جیسی صفات کو امام خمینیؒ میں جلوہ گر دیکھ رہے تھے اور جو شرائط اسلامی رہبر کے لئے امام حسینؑ نے بیان فرمائی تھیں وہ سب انہیں امام خمینیؒ کی ذات میں نظر آ رہی تھیں اور انقلابیوں کا یہ شعار خمینی، خمینی تو وارث حسین ای، اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

۳) مبارزے کے انداز پر اثرات

دنیاوی میدان جنگ میں خالی ہاتھ کو ڈنڈے والے کی جنگ میں نہیں جانا چاہیے لیکن ایرانی ملت نہضت عاشورہ کی تاثیر کی وجہ سے امام حسینؑ اور اصحاب امام حسینؑ کے مجاہدانہ جذبات سے سرشار تھی، جوان، اللہ اکبر، توپ، ٹینک اور مشین گنیں ہمیں نہیں ڈرا سکتی جیسے نعرے لگاتے ہوئے شہنشاہی حکومت کے ٹینکوں، توپوں اور مشین گنوں کے مقابل سینہ تان کر جاتے، تو امام خمینیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں "ایک ظالم و جابر اور طاقتور حکومت کے سامنے گنے چنے افراد کا خالی ہاتھ مبارزہ کیسے ہونا چاہیے یہ ہماری ملت کو سید الشہداء نے سکھایا ہے۔(۱) لوگوں نے افراد سے جنگ کے بجائے اسلامی انس و محبت اپناتے ہوئے امام کی سیرت کو جو انہوں نے حر کے ساتھ اپنائی تھی اختیار کر لیا تھا لوگ:

گل در مقابلہ گلولہ (گولی کے بدلے پھول) اور

ارتش ایران حسینی شدہ رہبر ما خمینی شدہ

جیسے نعرے لگاتے تھے۔(۲)

---

(۱) صحیفہ امام، ج ۱۷، ص ۵۶

(۲) مصطفی گوا کیان قطرہ از جاری زلال اندیشہ امام خمینی، ص ۲۲۹

۴) عزاداری کے مقامات وایام کے اثرات

عزاداری کے ایام اور مقامات جیسے امام بارگاہیں، خیمہ وہ اہم ترین مکان و زمان تھے جن میں انقلابی جوان فاسد پہلوی حکومت کے بارے لوگوں کے ضمیروں کو بیدار کرتے اور اس کے خلاف جلسے جلوسوں کو منظم کرتے تھے. بنیادی طور پر عزادای کے دو مہینوں یعنی محرم وصفر میں انقلاب اسلامی کے عروج کے سال میں اس کا نقطہ عروج ۹ محرم اور عاشورہ کے دن ہی تھے جس میں پہلوی حکومت کے ستون مکمل طور پر ڈگمگا گیے.

ساواک کے آفیسرز نے اپنی خفیہ رپورٹس میں کہا تھا کہ اگر ہم نے ماہ محرم کو خیریت سے گزار لیا تو شاہ کی حکومت کو کچھ نہیں ہوگا، لیکن سب نے دیکھ لیا کہ ۱۳۹۹ ہجری قمری کے چہلم سید الشہداء کے فوراً بعد ہی ایک ماہ کے اندر اندر اڑھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کی عمارت گر گئی.(۱)

دوسرا: انقلاب اسلامی کی کامیابی میں عاشورائی فرہنگ کے اثرات

انقلاب اسلامی کی کامیابی کے اہم ادوار پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتداء بھی نہضت عاشورہ کی تعلیمات کے زیر سایہ ایام عزاداری ہی تھے:

۱) ۱۵ خرد کے قیام کی ابتداء امام خمینیؒ کی اس شدید تقریر کے بعد ہوئی جو آپ نے عاشورہ کے دن عصر کے وقت ارشاد فرمائی .... آپ ۱۵ خرداد کے قیام کے بارے میں فرماتے ہیں:

> "اس عظیم الشان ملت نے ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ش، کو عاشورہ سے سبق سیکھ کر یہ قیام کیا اگر عاشورہ اور اس کی عظیم کامیابی کا احساس تمہارے اندر نہ ہوتا تو بے سروسامانی کی حالت میں ایسا

---

(۱) ایرانی ملت کی عظیم ریلی جو چہلم سید الشہداء کے دن ۲۹/۱۰/۱۳۵۷ کو انجام پائی اس کے ۲۳ دن بعد ۲۲/۱۱/۱۳۵۷، انقلاب کامیاب ہوگیا.

عظیم قیام کیسے کیا جا سکتا تھا'' (۱)

۲) ۱۷ شہریور بھی انقلاب اسلامی کے اہم ترین ایام میں سے ہے، یہ بھی فرہنگ عاشورہ کے اثرات کا نتیجہ تھا، ۱۷ شہریور عاشورہ کا تکرار، میدان شہداء کربلا کا تکرار تھا اور ہمارے شہداء، شہدائے کربلا کی یاد دلاتے ہیں اور ہمارے مخالف بھی یزید و یزیدیوں کی یاد دلاتے ہیں. (۲)

۳) امام خمینیؒ کا وہ تاریخی اعلامیہ ۲۱ بہمن ۱۳۵۷ کے دن جس میں آپ نے کرفیو کی مخالفت کا حکم دیا، دشمن تو انقلاب کے صف اول کے لیڈروں کو گرفتار کر کے اپنے گمان میں اس انقلاب کی لہر کو ہمیشہ کے لئے دبا دینا چاہتا تھا لیکن یہ بھی عاشورائی حماسہ آفرینی کی یاد دلاتا ہے. لوگ اس اعلامیہ اور اپنے زمانے کے حسین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے اور شاہ کی سازشوں کو نابود کر دیا.

امام خمینیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

> ''اگر سید الشہداء کا قیام نہ ہوتا تو آج ہم بھی کامیاب نہ ہو پاتے، یہ ہماری وحدت و انسجام جو ہماری کامیابی کا سبب بنی ہے. انھی مجالس و عزاداری کی وجہ سے ہے. (۳)

تیسرا. انقلاب اسلامی کی بقاء میں فرہنگ عاشورہ کی تاثیر

نہ صرف انقلاب کی اصل پیدائش و کامیابی اپنے مختلف مراحل میں فرہنگ عاشورہ کی مرھون منت تھی بلکہ اس انقلاب کی بقاء کی ضامن بھی یہی فرہنگ ہے. اگر انقلاب اسلامی اسی فرہنگ کی بنیاد پر باقی رہنا چاہے جس پر اس کی تشکیل ہوئی ہے تو اسے اسی فرہنگ پر مسلسل اپنی توجہ مرکوز رکھنا ہوگی. شوق شہادت، آزادی، عز و شرف، ظلم و ستم کے

---

(۱) صحیفہ امام خمینی، ج ۱۶، ص ۲۹۰

(۲) حوالہ سابق، ص ۳۳۶

(۳) صحیفہ امام، ج ۱۶، ص ۳۳۶

ساتھ مبارزہ، احکام اسلام کی مخالفت کو روکنا، مختلف سیاسی میدانوں، دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات داخلی و خارجی سیاسی پالیسی، مختلف اقتصادی، سیاسی ثقافتی میدانوں میں پالیسیوں کی تشکیل، ان سب میں اسے نہضت امام حسین علیہ السلام کی تعلیمات اور فرہنگ عاشورہ کو سامنے رکھنا ہوگا، اگر انقلاب سازشوں کے مقابل کامیاب رہا ہے. اگر آٹھ سالہ جنگ جس میں تمام بڑی بڑی طاقتیں اس کے خلاف سرگرم ہو گئی تھیں اور اسے شکست نہیں دے سکیں، اگر اسلام کے دشمنوں کی دھمکیاں، امپریل ازم کی تبلیغات اور اقتصادی پابندیاں، اور فوجی کو انقلاب مل کر بھی اس انقلاب کو ذرا برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکے اور نہ اس کے عزم وارادہ میں ذرا برابر تزلزل ایجاد کر سکے ہیں، تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ملت ایران کے سامنے عاشورہا کی تعلیمات مشعل راہ بنی ہوئی تھیں.(۱)

امام خمینیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

''اس محرم کو ہمیشہ زندہ رکھنا، ہم جو کچھ رکھتے ہیں وہ سب اسی محرم کی وجہ سے ہے، یہ محرم اور سید الشہداء کی شہادت اس کا باعث ہیں ہمیں اس شہادت کی گہرائی کو پانا ہوگا اور کائنات پر اس کی تاثیر کو سمجھنا ہوگا اور متوجہ رہنا ہوگا کہ آج بھی اس کی تاثیر ہے. اگر یہ مجالس، خطبے، تقریریں، عزاداری، جلوس اور ماتم نہ ہوتے تو ہمارا ملک کبھی کامیاب نہ ہوتا، یہ سید الشہداء و عباس علمدار کے عَلَم کے زیر سایہ قیام ہی تھا جس نے عظیم کامیابی عطا کی، آج بھی محاذ جنگ پر آپ دیکھیں سب امام حسینؑ سے عشق ہی ہے جس نے وہاں کی روحانی فضا کو زندہ رکھا ہوا ہے''(۲)

آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

---

(۱) ہفت قطرہ، ص ۲۳۵

(۲) صحیفہ امام، ج ۱۷، ص ۵۸

”یہ امام حسین علیہ السلام کی قربانی ہی تھی جس نے ہمارے لئے اسلام کو زندہ رکھا، آپ بھی جان لیں کہ اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی یہ تحریک ہمیشہ باقی رہے تو اس نہضت عاشورہ کی حفاظت کرو“ (۱)

---

(۱) صحیفہ امام، ج۱۵ص۳۳۰،انقلاب اسلامی پر فرہنگ عاشورہ کی تاثیر کے حوالے سے مزید مطالعہ کے لئے رجوع کریں؛الف:۔عبدالوہاب فراتی ضافتی نظری بر انقلاب اسلامی فصل نامہ حکومت اسلامی سال ۸،شمارہ اول بہار ۸۲،ص۳۹۶

چوتھا حصّہ

عزاداری کا فلسفہ

محمد رضا کاشفی

فلسفہ عزاداری

سوال ۳۰: کیا فلسفہ عزاداری کے بارے میں سوال معقول ہے یا نہیں؟

جواب : مسائل واعتقادات کے تحلیل وتجزیہ کے بارے جو تغیر وتحول ایجاد ہوا ہے اس کی وجہ سے آج کا انسان ان حقائق ومفاہیم کے بارے میں تحقیق تفتیش کرنا چاہتا ہے، جن کے بارے وہ اعتقاد رکھتا تھا اور وہ انہیں اپنائے ہوئے تھا، درحقیقت غیر جانبدار ہو کر تحقیق کرنا آج کے انسان کی خصوصیات میں سے ہے، اسی بناء پر انسان مسئلہ عزاداری کے بارے بھی غیر جانبدارانہ تحقیق کرنا چاہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس کی عقل کو عزاداری کے بارے میں کوئی قابل قبول توجیہ نہ مل جائے یا کم از کم وہ توجیہ خلاف عقل نہ ہو اگرچہ عقل اسے قبول نہ کرے اس وقت تک وہ عزاداری کا قائل نہیں ہوگا. مسائل کو اس نظریہ سے دیکھنا بہت اچھی بات ہے، یہ چیز انسان کے مذہبی اعتقادات اور شیعی فرہنگ اعتقادات کی تقویت کا باعث بنتی ہے اور متوجہ رہنا چاہیے کہ اس نظری پشت پناہی کی

سے انسان کے ایمان میں بھی عظمت پیدا ہوتی ہے کیونکہ ایمان کی تشکیل معرفت کی بنیادوں پر ہوتی ہے، لہٰذا عزاداری کے بارے بھی اگر کوئی قابل قبول اور معقول توجیہ پیش کی جائے تو آج کی نسل کے اعتقاد کو اس بارے میں تقویت و مضبوطی حاصل ہوگی.

سوال ۳۱: اهل بیتؑ کی عزا داری کا فلسفه کیا هے اور اس کا فائده کیا هے؟

جواب : عزاداری کے فلسفہ وحکمت کو درج ذیل امور میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

الف) :محبت و دوستی

قرآن کریم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت علیہ السلام کی محبت و دوستی کو مسلمانوں پر واجب کیا ہے(۱) اور محبت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، سچا محبّ وہ ہے جو دوستی ومحبت کی تمام شرائط پر پورا اترے اور محبت کی شرائط ولوازم میں سے ایک یہ ہے کہ مورد محبت افراد کے دکھ درد میں غمگین ہو اور ان کی خوشی میں اظہار خوشی کرے.(۲) یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ اہل بیت علیہ السلام کی خوشی کے موقع پر آپ بھی جشن سرور کی محفلیں برپا کریں اور ان کے غم اور سوگ میں آپ بھی حزن وغم کا اظہار کریں. حضرت علی علیہ السلام ایک روایت میں ارشاد فرماتے ہیں:

''ہمارے شیعہ ہماری خوشی میں خوش ہوتے ہیں اور ہمارے غم میں غمگین ہوتے ہیں''

یفرحون لفرحناء و یحزنون لحزننا (۳)

امام صادق علیہ السلام نے بھی فرمایا:

شیتنا جزء منا خلقوا من فضل طینا سیوءهم مالیسوء نا ویسرهم ما یسرنا.(۴)

---

(۱) سورہ شوریٰ /۲۳، سورہ ھود/۲۹، میزان الحکمۃ، ج۲،ص۲۳۶

(۲) المحبۃ فی الکتاب والسنۃ، ص۱۶۹۔۱۷۰اور ص۱۸۱۔۱۸۲

(۳) بحارالانوار، ج۴۴ص۲۸۷

(۴) امالی،ص۳۰۵

''ہمارے شیعہ ہمارے ہی جزو ہیں، ہمارے ساتھ نسبت رکھنے
والی طینت سے خلق ہوئے ہیں، انہیں بھی وہی چیز بری لگتی ہے
جو ہمیں بری لگتی ہے اور انہیں بھی وہی چیز خوش کرتی ہے جو ہمیں
خوش کرتی ہے''

اس کے علاوہ عقلی وشرعی وظیفہ بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ اہل بیت علیہ السلام کی عزاداری کے ایام میں ہم اپنے غم واندوہ کو زبان حال یعنی آہ ونالہ اور گریہ وزاری کے ذریعے اظہار کریں، کھانے کے لحاظ سے یوں اظہار کریں کہ غم زدہ اشخاص کی طرح کھانا پینا کم کردیں۔(۱) لباس کے لحاظ سے یوں اظہار کریں کہ ایسا لباس پہنیں جو عرف عام میں غمزدہ افراد پہنتے ہیں۔

ب) انسان سازی

شیعی طرز تفکر میں عزاداری معرفت وشناخت کی بناء پر ہونی چاہیے، ان کے غم میں غمگین ہونا درحقیقت ان کے فضائل ومناقب اور ان کے ارمانوں کی یاد ہے، لہذا عزاداری انسان کو نمونہ واسوۂ انسانی کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ انسان ان کی ذات کو اپنے لئے اسوہ وقدوہ بنائے۔

جو شخص مجالس عزاداری میں معرفت کے ساتھ شرکت کرتا ہے تو اس میں شعور وشوق کے ساتھ ساتھ شناخت وعطوفت بھی موجود ہوگی جس کے زیر سایہ اس کے اندر ایک قوی وعجیب جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جب وہ مجلس سے نکلے گا تو وہ ایسا محب ہوگا جو محبوب کے اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے مکمل آمادہ وتیار ہے۔

---

(۱) امام صادق علیہ السلام معاویہ بن وہب کو فرمایا ''سید الشہداء کے عزادار یوم عاشورہ کھانے پینے سے پرہیز کریں اور عصر کے وقت ضرورت کے مطابق غمزدہ افراد کی طرح کھانے پینے میں مشغول ہوں''۔

تاریخ النیاحۃ علی الامام الشہید حسین بن علی، ج۱،ص ۱۵۷۔۱۵۹

ج) معاشرہ کی تعمیر

جب عزاداری انسان کو اندرونی طور پر بدلتی ہے تو انسان کی یہ اندرونی تبدیلی معاشرہ کی تبدیلی کا باعث بنے گی اور انسان اہل بیتؑ کے ارمانوں کو معاشرہ میں بھی حاکم کرنا چاہے گا. دوسرے لفظوں میں عزاداری درحقیقت بالواسطہ اہل بیتؑ کے ارمانوں اور مقاصد کی حفاظت اور انہیں عملی کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے، اسی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ عزاداری کی حکمتوں میں سے ایک حکمت و فلسفہ یہ ہے کہ معاشرہ کی اس طرح تعمیر ہو جیسے اسلام چاہتا ہے.

د) شیعہ فرہنگ و ثقافت کو اگلی نسل تک منتقل کرنا

اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ نئی نسل انہی مجالس وعزاداری کے ذریعے اہل بیتؑ کی تعلیمات وثقافت سے شناسائی حاصل کرتی ہے یہ حقیقت ہے کہ یہ مجالس و مراسم عزاداری ان عوامل واسباب میں سے ایک سبب و عامل ہیں جو ائمہ معصومین علیہ السلام کی نظری وعملی تعلیمات کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرتی ہے، ہماری مجالس وعزاداری اپنے مطالب ومضامین کے لحاظ سے نئی نسل کی تعلیم وتربیت اور انہیں اہل بیتؑ کے کردار و گفتار سے واقف کرنے کا بہترین ذریعہ ہے.

سوال ۳۲: عزاداری کا فلسفه وحکمت کیا ھے؟

جواب: انسان کی تعمیر، معاشرہ کی تعمیر اور شیعہ ثقافت کا اگلی نسل تک منتقل کرنا عزاداری و مجالس سید الشہداء کا بہت قوی پہلو ہے کیوں نہ امام حسین علیہ السلام کا قیام اور عاشورہ کی تربیتی، سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی تعلیمات انسان اور معاشرہ کی تربیت ونشو ونما میں بہت مؤثر ہیں اور یہ واقعہ کربلا کے عناصر ہیں جنہوں نے شیعہ فرہنگ وثقافت کی تشکیل کے اصلی و بنیادی نظریات کو تشکیل دیا ہے اور یہی چیز مجالس وعزاداری کے ذریعے اگلی نسل تک منتقل ہوتی ہے، محرم کے بیانات، تقاریر اور شعار کو دیکھ کر فرہنگ عاشورہ میں انسان ومعاشرہ کی

تعمیر اور ثقافت کی تشکیل والے عناصر کا ملاحظہ کیا جا سکتا ہے.

عبادت، ایثار، شجاعت، توکل، صبر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یزید کی امارت کی بقاء کی صورت میں اسلام کی نابودی، یزید جیسے کی بیعت کی حرمت ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کی ترجیح، امتحان کے میدان میں سچے انسانوں کی کمی، حاکمیت باطل کے دور میں شہادت پر آمادگی کی ضرورت، انسان کے لئے شہادت کی زینت ہونا، ظلم و جور کی حکمرانی میں مبارزہ و جہاد کا ضروری ہونا، رہبر حق کی صفات، خدا کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، حق و حقیقت کی راہ میں شہادت کے خواہاں افراد کا ساتھ دینا، مومن حریت پسندوں پر ذلت کو قبول کی حرمت، موت کا جنت الخلد کے لئے پل ہونا، آزادی و جوانمردی اور راہ حق قبول کرنے و احقاق حق میں ہمیشہ سب سے مدد مانگنا.(۱)

درس آزادی بہ دنیا داد رفتار حسین   بذر رحمت در جہان افشاند افکار حسین
گر نداری دین بہ عالم الاقل آزادی باش   این کلام نغز می باشد ز گفتار حسین
مرگ با عزت ز عیش در مزلہ بہتر است   نغمہ ای می باشد از لعل دربار حسین

مذکورہ بالا موارد کے علاوہ ذیل کے موارد بھی امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کی حکمت کو بیان کرتے ہیں:

۱) اپنے دور کے ظالموں کے خلاف آواز بلند کرنا اور دنیا کے مظلوموں کی حمایت کرنا،

۲) حق عدالت خواہی کی تقویت اور ظالموں سے انتقام جوئی،

۳) حق کی پیروی اور اس کے دفاع کے لئے شیعہ اجتماعات کا ذریعہ،

روایات میں عزاداری

سوال ۳۳ : کیا اهل بیت علیهم السلام کے لئے عزا داری برپا کرنے کے بارے کوئی روایت موجود هے ؟

---

(۱) اس بارے دیکھیں: فرہنگ عاشورہ، ص ۲۶۸۔۲۷۱، عناوین، حسین، عقل، سرخ، ص ۷۷، ۱۱۹، امام حسنؑ و حسینؑ، ص ۱۱۶، ۱۲۱ دیکھیں

جواب : اس بارے بہت زیادہ روایات موجود ہیں، ہم یہاں صرف آئمہ سے مروی تین روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱) امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

رحم اللّٰہ شیعتنا :شیعتنا واللّٰہ ھم المو منون فقد واللّٰہ شرکونا فی اعصیبة بطول الحزن والحسرة(۱)

''خداوند ہمارے شیعہ پر اپنی رحمت نازل کرے، ہمارے شیعہ ہی مومن ہیں، خدا کی قسم وہی ہماری مصیبتوں میں اپنے طویل حزن وغم کے ساتھ ہمارے ہمدرد وشریک ہیں''

۲) امام رضا علیہ السلام نے فرمایا :

من تذکرہ مصابنا وبکی لما ارتکب منا کان معنا فی درجتنا یوم القیامة ، ومن ذکر بمصابنا فبکی وابکی لم تبک عینہ یوم تبکی العیون ومن جلس مجلسا یحیی فیہ امرنا لم یمت قلبہ یوم تموت القلوب .(۲)

''جو شخص بھی ہمارے مصائب کو یاد کرے اور ہمارے اوپر ڈھائے جانے والی مصیبتوں کو یاد کر کے روئے وہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ ہمارے درجہ میں ہوگا اور جو شخص ہمارے مصائب کو بیان کر کے خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلائے تو جس دن سب آنکھیں رو رہی ہوں گی، اس کی آنکھ نہیں روئے گی اور جو شخص کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں ہمارا ذکر کیا جارہا ہو اور ہماری ولایت کا تذکرہ ہو تو جس دن دل مردہ

(۱) بحار الانوار، ج۴۴، ص۲۲۲

(۲) بحار الانوار، ج۴۴، ص۲۷۸

ہو جائیں گے اس کا دل مردہ نہیں ہوگا"

۴) امام صادق علیہ السلام نے فضیل سے فرمایا :

تجلسون وتحدثو ن؟ قا ل : نعم جعلت فداک ، قال: ان تلک المجا لس واحبها فا حیو ا امر نا فضیل، فرحم اللّٰہ من احیی امرنا یا فضیل من ذکر نا او ذکر نا عند ہ فخر ج من عینہ مثل جنا ح الذباب غفر اللّٰہ لہ ذنو بہ ولو کانت اکثر من زبد ا لبحر.(۱)

"کیا مجالس عزا برپا کرتے ہو؟ اور کیا جو کچھ اہل بیت پر گذرا ہے اس کے بارے گفتگو کرتے ہو؟ فضیل نے عرض کیا ہاں مولا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، امامؑ نے فرمایا ایسی مجالس کو پسند کرتا ہوں، پس ہمارے امر کو زندہ کرو، جو بھی ہمارے امر کو زندہ کرے وہ خداوند کی رحمت ولطف کا حقدار قرار پاتا ہے، اے فضیل جو بھی ہمارا ذکر کرے یا اس کے نزدیک ہمارا ذکر کیا جائے اور مکھی کے پر برابر اس کا آنسو نکل آئے تو خداوند اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اگرچہ دریا کی جھاگ سے زیادہ ہوں"

عزاداری کی تاریخ

سوال ۳۴ : کیا ائمہ معصومینؑ کے دور میں بھی امام حسینؑ کی عزاداری موجود تھی ؟

جواب : ہاں بالکل موجود تھی اور ہم نمونہ کے طور پر بعض واقعات کو یہاں نقل کرتے

---

(۱) بحار، ج۴۴،ص۲۸۲، ۲۸۹

ہیں:

۱) غم سید الشہداء میں بنی ہاشم کی عزاداری، امام صادق علیہ السلام سے روایت ہوئی ہے کہ:

''واقعہ عاشورہ کے بعد بنی ہاشم کی کسی عورت نے کبھی سرمہ نہیں لگایا نہ بالوں کو خضاب کیا اور نہ ہی بنی ہاشم کے کسی گھر سے دھواں بلند ہوا جو کہ کھانا پکنے کی علامت ہوتا ہے یہاں تک کہ ابن زیاد کی ہلاکت کی خبر ان تک پہنچ گئی، عاشورہ کے خونی واقعہ کے بعد ہمیشہ ہماری آنکھ میں آنسو رہے ہیں''(۱)

۲) امام سجاد علیہ السلام کی عزاداری

امام زین العابدینؑ کی کیفیت اپنے بابا کے غم میں ایسی تھی کہ ہمیشہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے خصوصاً اپنے بابا کے مصائب پر اور اپنے بھائیوں، چچاؤں، چچازادوں، پھوپھیوں اور بہنوں پر جو گذری، جب آپ کے پاس پانی لایا جاتا تو آپ کے آنسو جاری ہو جاتے اور فرماتے میں کیسے پانی پیوں جب کہ نواسہ رسول پیاسا قتل ہو گیا.(۲)

آپ فرماتے جب بھی مجھے آل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی یاد آتی ہے بے اختیار رونے لگتا ہوں(۳). امام صادق علیہ السلام نے زرارہ سے فرمایا:

''ہمارے جد علیؑ ابن الحسینؑ جب بھی اپنے بابا حسینؑ ابن علیؑ کو یاد کرتے تو اتنا روتے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور آپ کے گریہ کی وجہ سے حاضرین بھی رونے لگتے.(۴)

---

(۱) امام حسنؑ و امام حسینؑ، ص۱۲۵

(۲) بحار، ج۴۴، ص۱۲۵

(۳) خصال، ج۱، ص۱۳۱

(۴) بحار، ج۴۵، ص۲۰۷

۳) امام محمد باقر علیہ السلام کی عزاداری

امام محمد باقر علیہ السلام عاشورہ کے دن امام حسینؑ کے لئے مجلس برپا فرماتے اور آپ اپنے جد کے مصائب پر گریہ فرماتے، امام محمد باقر علیہ السلام کے حضور ایک مجلس عزا میں کمیت شاعر نے ایک شعر پڑھا جب اس نے یہ مصرعہ پڑھا۔ **قتیل بالطف** ......تو امام محمد باقر علیہ السلام نے بہت گریہ فرمایا اور فرمایا:

> ''اے کمیت اگر ہمارے پاس مال و دولت ہوتا تو تمہارے اس شعر کے بدلے میں تمہیں وہ سب دے دیتا لیکن تمہارا اجر وہی دعا ہے جو رسولؐ خدا نے حسان بن ثابت کے لئے فرمائی تھی کہ اے حسان ہم اہل بیتؑ کے دفاع میں تم ہمیشہ روح القدس کے مورد تائید قرار پاؤ گے'' (۱)

۴) امام صادق علیہ السلام کی عزاداری

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

> ''جب ماہ محرم آجاتا تو پھر میرے بابا کبھی تبسم نہ فرماتے بلکہ غم آپ کے چہرے سے ظاہر ہوتا اور آنسو آپ کے رخساروں پر جاری رہتے، یہاں تک کہ دسویں محرم کا دن آجاتا اس دن پھر آپ کی مصیبت اور غم انتہا کو پہنچ جاتا آپ مسلسل گریہ کرتے رہتے اور فرماتے آج کا دن وہ دن ہے جس دن میرے دادا حسینؑ بن علیؑ کو شہید کیا گیا۔ (۲)

۵) امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی عزاداری

---

(۱) مصباح المتہجد ص ۷۱۳

(۲) امام حسنؑ و امام حسینؑ، ص ۱۴۳

امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

''جب محرم کا مہینہ آجاتا تو ہمارے بابا کو کوئی ہنستے ہوئے نہ دیکھتا اور عاشورہ کے دن تک یہی صورت حال رہتی اور عاشورہ کے دن تو میرے بابا پر غم واندوہ چھا جاتا آپ بہت گریہ کرتے اور فرماتے اسی دن حسین علیہ السلام کو شہید کیا گیا'' (۱)

۲) امام رضا علیہ السلام کی عزاداری

امام رضا علیہ السلام کا اپنے جد پر گریہ اتنا زیادہ تھا کہ آپ فرماتے حسینؑ کی مصیبت کے دن نے ہماری پلکوں کو زخمی کردیا ہے اور ہماری آنکھوں کو رلا دیا ہے۔(۲) دعبل خزاعی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، امام علیہ السلام نے سید الشہداء کے بارے میں شعر اور گریہ کے بارے کچھ کلمات ارشاد فرمائے ان میں سے یہ جملہ بھی فرمایا کہ اے دعبل جو شخص میرے جد حسینؑ پر گریہ کرے خداوند اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے، اس کے بعد آپ نے خواتین کو پردے کے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا تاکہ سید الشہداء کے مصائب پر گریہ میں شریک ہوں، پھر دعبل سے فرمایا: امام حسینؑ کے لئے مرثیہ پڑھو، تم جب تک زندہ ہو ہماری مدح ونصرت کرنے والے ہو اور جب تک کرسکتے ہو ہماری نصرت میں کوتاہی نہ کرنا، دعبل نے روتے ہوئے مرثیہ شروع کیا:

افاطم لو خلت الحسین مجدلا　　وقد مات عطشانا بشط فرات

''اے فاطمہؑ تم حسینؑ کو اس حال میں دیکھتی ہو کہ ان کا لاشہ زمین پر پڑا ہے جب وہ شط فرات پر پیاسے مارے گئے''

مرثیہ سن کر امام پاک اور مخدرات کی آواز گریہ بلند ہوگئی (۳)

---

(۱) حسینؑ نفس مطمئنہ، ص ۵۶

(۲) بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۲۸۴　　(۳) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۲۵۷

امام زمان (عجل) کی عزاداری

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ امام، زمانہ غیبت میں بھی اور جب تشریف لائیں گے اس وقت بھی اپنے جد پر گریہ فرماتے ہیں اور آپ اپنے جد کو خطاب کرتے ہوئے فرمائیں گے:

فلئن اخرتنی الدھور و عاقنی نصرک المقدور ولم اکن لمن حاربک محاربا ولمن نصب لک العداوۃ مناصباً فلاء ندبت صباحاً ومساءً ولا یکین لک بدل الودع دما حسرۃ علیک وتاسفا علی ما دھاک .(۱)

''اگرچہ زمانے نے مجھے آپ سے متاخر کر دیا اور میں اس وقت نہیں تھا کہ آپ کے دشمنوں سے جنگ کر سکتا، اب میں صبح و شام آپ پر گریہ کرتا ہوں اور آنسوؤں کے بدلے دل خون کے آنسو روتا ہے، آپ کے غم واندوہ سے دل پُر ہے''

در سوگ تو با سوز درون می گریم　　از نیل و فرات و شط فزون می گریم
گر چشمه چشم من بخشکد تا حشر　　از دیده به جای اشک، خون می گریم

''میں آپ کے سوگ میں آتش دل کے ساتھ روتا ہوں، دریائے نیل وفرات سے زیادہ روتا ہوں اگر میری آنکھ کے سوتے خشک ہو جائیں حشر تک تو میں آنسوؤں کے بدلے خون روتا ہوں''

سوال ۳۵ : عزاداری کی رسم کیا صفوی دور میں رائج ہوئی؟

جواب : امام حسین علیہ السلام کی عزاداری تو آپ کی شہادت کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی

---

(۱) بحار الانوار، ج ۱۰۱، ص ۳۲۰

البتہ آل بویہ کی حکومت (۳۵۲ ہجری) تک خفیہ تھی، چوتھی صدی ہجری سے پہلے تک ایران میں عزاداری گھروں کے اندر ہوتی تھی لیکن چوتھی صدی کے دوسرے نصف میں عاشورہ کے جلوس سڑکوں پر نکلنے لگے، اکثر اسلامی مؤرخ خصوصا وہ مؤرخ جنہوں نے واقعات سال بہ سال ترتیب سے لکھے ہیں، جیسے ابن جوزی کتاب المنتظم میں ابن اثیر الکامل میں، ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں، یافعی مراۃ الجنان میں اور ذہبی وغیرہ جب ۳۵۲ ہجری اور اس کے بعد کے واقعات لکھتے ہیں تو انہوں نے روز عاشورہ شیعہ کی عزاداری کے بارے میں بھی لکھا ہے، جیسا کہ ابن جوزی لکھتے ہیں سال ۳۵۲ ہجری میں معزالدولہ دیلمی نے حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کے دن عزاداری کی مجالس برپا کریں، اس دن بازار بند ہو گئے، خرید وفروش بند ہو گئی، قصابوں نے جانور ذبح نہ کیے، حلیم پکانے والوں نے چولہے ٹھنڈے کر دیے، لوگوں نے پانی نہ پیا، بازاروں میں عزاداری کے خیمے لگا دیے، ان پر عزاداری کی علامت کے طور پر ٹاٹ لگا دیے گئے، عورتیں اپنے سر اور منہ کو پیٹ رہی تھیں اور حسینؑ پر گریہ کر رہی تھیں.(۱)

ھمدانی کے بقول اس دن عورتوں نے اپنے بال کھول لئے اور عزاداری کی رسم کے عنوان سے اپنے چہرے سیاہ کر کے سڑکوں پر نکل آئیں اور امام حسینؑ کے غم میں اپنے منہ پیٹ رہی تھیں.(۲) یافعی کے بقول:

''وہ پہلا دن تھا جس دن سید الشہداء کی عزاداری برپا کی جا رہی تھی'' (۳)

ابن کثیر نے بھی ۳۵۲ ہجری کے واقعات میں لکھا ہے کہ اہل سنت، شیعہ کو ان کاموں سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ شیعہ کی تعداد بھی زیادہ تھی اور حکومت

---

(۱) المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، ج۷ص۱۵

(۲) تاریخ الطبی، ص۱۸۳

(۳) مرآت الجنان، ج۳،ص۲۴۷،

کی طاقت بھی ان کے ساتھ تھی، ۳۵۲ ہجری سے لے کر پانچویں صدی کے وسط تک (کہ جب آل بویہ کا دور اختتام پذیر ہوا) عاشورہ کے مراسم اسی طریقے پر تقریباً جاری رہے اور اگر عاشورہ کے مراسم عید نوروز کے دن آجائیں تو عید نوروز کو موخر کر دیا جاتا تھا.(۱) انہی سالوں میں کہ جب مصر میں فاطمی (اسماعیلی) حکومت قائم ہوگئی اور انہوں نے قاہرہ کی بنیاد رکھی، عزاداری کی مجالس مصر میں بھی برپا ہوئیں، مقریزی کے مطابق ۳۶۳ ہجری عاشورہ کے دن شیعہ اپنی روایت کے مطابق مشہد کلثوم وسیدہ نفیسہ میں جمع ہوئے اور ان دو مقامات پر عزاداری وگریہ میں مشغول ہو گئے. (مصنف کا اسے روایت کے مطابق کہنا دلالت کرتا ہے کہ مصر میں عزاداری سالہا سال سے معمول بن چکی تھی)

عاشورہ کی عزاداری فاطمیوں کے دور میں ہر سال برپا ہوتی اور بازار بند ہو جاتے، لوگ دستوں کی صورت میں نوحے پڑھتے ہوئے قاہرہ میں اکٹھے ہوتے (۲)، اس کے بعد تشیع کو تنہا کر دیئے جانے کی وجہ سے عزاداری کے مراسم زیادہ علی الاعلان نہ رہے اگر چہ آل بویہ کے دور سے پہلے والی حالت سے بہتر تھے اور کتب تاریخ خصوصاً کاشفی کی روضۃ الشہداء سے ثابت ہوتا ہے کہ صفوی دور سے پہلے بھی عزاداری سید الشہداء کی مجالس برپا ہوتی تھیں (۳)، البتہ صفوی دور میں بہت زیادہ آزادی سے یہ مراسم انجام پانے لگیں.

سوال ۳۶ : زنجیرزنی ، سینہ زنی اور تعزیہ وغیرہ جیسی رسمیں کس ثقافت وملت سے ہیں؟

جواب : زنجیر زنی ہندوستان اور پاکستان سے ایران میں آئی ہے، چونکہ اس سے بعض

---

(۱) النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر و قاہرہ، ج ۴ ص ۲۱۸

(۲) الخطط، مقریزی ۲/۲۸۹، نیز النجوم الزاھرۃ، ج ۴، ص ۱۲۶ وقائع سال ۳۶۶، اتعاظ الحنفاء مقریزی، ج ۲، ص ۹۷، منقول از سیاھپوشی درسوگ ائمہ نور، ص ۱۶۱-۱۶۲

(۳) اس بارے دیکھیں: مقالات تاریخی، رسول جعفریان، ج ۱ ص ۱۸۳-۱۸۵، ۲۰۱-۲۰۶

دفعہ مذہب کے بارے میں غلط طرز تفکر کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اس وجہ سے بعض فقہاء نے اسے حرام قرار دیا ہے، لیکن اگر اس طرح انجام پائے کہ جس سے مذہب اور مراسم عزاداری سید الشہداء کی توہین اور حرف زنی کا اندیشہ نہ ہو تو زنجیر زنی میں کوئی ڈر نہیں ہے اور آج کل ایران میں جو عزاداری رائج ہے اس میں عزاداری کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھا جاتا ہے.(۱)

سینہ زنی کا طریقہ اصل میں عربوں میں رائج تھا، آہستہ آہستہ موجودہ شکل میں آ گئی کہ نوحہ کے ذریعہ سینے پر ہاتھ مارے جاتے ہیں، اس طرح کی سینہ زنی ابتداء میں انفرادی تھی بعد میں جو عزاداری کا حصہ بن گئی وہ بھی وسیع سطح پر خصوصاً صفوی دور میں تو پھر اس نے اجتماعی شکل اختیار کر لی.(۲)

تعزیہ کا مطلب واقعہ عاشورہ کو مجسم شکل میں پیش کرنا ہے اس طرح کی عزاداری کریم خان زند کے دور میں شروع ہوئی اور پھر صفوی دور میں اس نے رواج پکڑا، ناصر الدین شاہ قاجار کے دور میں اس میں وسعت پیدا ہوئی، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ شاہ ایران، یورپ میں واقعات پیش کرنے کے طریقے دیکھ کر آیا تو اس نے واقعہ عاشورہ کو اس طرح پیش کرنے کا کہا، البتہ اس طرح تعزیہ ونمائش کا طریقہ صرف ایران میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی رائج تھا، وہاں اس کے اپنے طریقوں کے مطابق انجام پاتا تھا خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں زیادہ رائج تھا وہاں تعزیہ داری کا اور طریقہ ہے کہ ضریح امام حسینؑ کی شبیہ بنا کر اسے عزاداری میں اٹھایا جاتا ہے.(۳)

سوال ۳۷ : عزاداری کے جو طریقے صدر اسلام میں موجود نہیں تھے کیا وہ دین میں بدعت شمار نہیں ہوں گے ؟

---

(۱) موسوعة العتبات المقدسہ، ج۸ص۳۷۸

(۲) موسیقی مذہبی ایران، ص۲۶

(۳) حوالہ سابق، ص۳۲،۳۵،در آمدی بر نمائش و بنائش ایران، ص۸۶

جواب: پہلا یہ کہ: توجہ رہنی چاہیے کہ عزاداری کے موجودہ طریقے عزاداری کی حقیقت و ماہیت سے فرق رکھتے ہیں، عزاداری کی حقیقت ایک ہی اصل ہے جو مختلف شکلوں اور اقسام میں انجام پاتی ہے، لہٰذا یہ صرف اظہار کا ذریعہ ہے۔

دوسرا یہ کہ: حقیقت کا اظہار بھی عزاداری کے پیغام کے مناسب ہونا چاہیے اس طرح کہ بہترین اور مؤثر و مفید انداز میں عزاداری کے درس اور تعلیمات کو دوسروں تک پہنچا سکے یعنی ایسا لباس ہو جو اس کے قد پر پورا اترے اگر چھوٹا ہو تو مکمل پیغام اپنے اندر نہیں لے سکے گا اور اگر لمبا ہو تو مخاطب کے ذہن کو اصل پیغام سے منحرف کر دے گا اور وہ حقیقت سمجھ نہیں سکے گا۔

تیسرا یہ کہ: پیغام پہنچانے کے لئے ان مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جو مختلف اقوام میں رائج ہیں، جیسا کہ اسلام نے ہندوستان میں اپنا پیغام پہنچانے کے لئے اردو زبان سے فائدہ اٹھایا، یا فلسفہ کو یونان سے لیا اور اسے اپنی تعلیمات پہنچانے کے لئے استعمال کیا۔

چوتھا یہ کہ: اسلام اقوام و ملل کے رسوم و آداب کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب تک وہ اسلام کی اصلی تعلیمات سے نہ ٹکراتے ہوں وہ ان سے روکتا بھی نہیں ہے مثلاً لوگوں کے رہن، سہن، غذا اور لباس کے بارے میں اسلام کوئی پابندی نہیں لگاتا مگر یہ کہ ان میں سے کوئی چیز اسلام کے اصولوں سے ٹکرا جائے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں عزاداری اہل بیت علیہم السلام بھی اسلام کی نظر میں مختلف اقوام میں رائج و مرسوم طریقوں اور شکلوں میں انجام دی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ طریقے، وہ شکلیں اور وہ انداز اس کے اصل پیغام اور روح کے منافی نہ ہوں، بلکہ بہترین طریقے سے پیغام کو ذہن مخاطب تک پہنچا سکیں، لہٰذا عزاداری کے جو طریقے صدر اسلام میں رائج نہیں تھے جیسے زنجیر زنی، سینہ زنی، اور تعزیہ وغیرہ وہ نہ صرف یہ کہ بدعت نہیں ہیں

بلکہ اسلام کے معاون و مددگار ہیں اور اپنی حد تک عاشورہ واہل بیتؑ کی تعلیمات اور شعاروں کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کے قلب وذہن کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں.

سوال ۳۸ : دوسرے آئمہؑ کی عزاداری سید الشہداء کی عزاداری کی طرح کیوں نہیں منائی جاتی؟

جواب: اس کی وجہ واقعہ عاشورہ کی حالات وواقعات کے لحاظ سے وسعت ہے، ایک طرف اسلامی دنیا اور مسلمانوں کی مخصوص صورتحال، مسلمان حکمرانوں کے حالات اور ان کے اَن گنت مظالم، انسانیت اور آزادی کی قید وبند، امت مسلمہ کی تحقیر، امنیت کا نہ ہونا، شیعہ پر ظلم وستم کی زیادتی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسی اسلامی تعلیمات کا بھلا دیا جانا، بدعتوں کی کثرت اور ان کا دین میں وارد ہو جانا، وحدت واتحاد مسلمین کا ختم ہو جانا اور اسلام کی انسانی وامن وامان اخلاقی قدروں کا بھلا دیا جانا اور دوسری طرف سے سید الشہداء کی مظلومیت اور تنہائی کے لحاظ سے خاص صورتحال، بظاہر دوست مسلمانوں کا حضرت سے وہ سلوک، جنگ کی نوعیت اور آپ اور آپ کے اصحاب اور اہل وعیال کے ساتھ دشمن کا برتاؤ، تربیتی، اجتماعی، سیاسی، ثقافتی اور دینی تعلیمات ودروس خصوصاً امام حسینؑ کی ذات اقدس (۱)، ان سب نے مل کر اس واقعہ کو ایک خاص شکل بخش دی، جس کے مختلف اور عمیق پہلوؤں نے محققین کے سامنے تحقیق کے لئے بہت سے موضوعات ومسائل رکھ دیئے ہیں اور اس بارے ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں.

رسولؐ خدا، حضرت علیؑ، سیدہ فاطمہ زہراءؑ، امام حسن مجتبیٰؑ اور امام حسینؑ کے بعد والے معصومینؑ واقعہ کربلا کی انہی بے نظیر خصوصیات کی وجہ سے اس کے عزاداری کی صورت میں احیاء اور زندہ رکھنے پر سخت تاکید فرماتے رہے ہیں، بہر حال خود عاشورہ کے حوادث نے اور اس کے مختلف پہلوؤں نے اس واقعہ کو تاریخ میں بے مثل وبے نظیر بنا دیا

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۴ ص ۲۲۴، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۳

ہے جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لا یوم کیومک یا ابا عبدا للّٰہ (۱)

''اے حسینؑ آپ کے دن جیسا کوئی دن نہیں ہے''

اور واضح ہے کہ ہر واقعہ کی یاد اس واقعہ کی وسعت کے مطابق ہوتی ہے، چونکہ واقعہ عاشورہ بھی لامحدود وسعت کا حامل ہے، لہٰذا اس کی عزاداری بھی اپنی کمیت و کیفیت میں دوسرے واقعات کے ساتھ مقایسہ نہیں کی جاسکتی.

سیاہ لباس

سوال ۳۹ : ایام عزا میں سیاہ لباس کا کیا فلسفہ ہے؟

جواب: سیاہ رنگ مختلف جہات سے مختلف اثرات رکھتا ہے. مختلف موارد میں مختلف رنگ چھپانے کا رنگ ہے، یعنی اپنے آپ کو اس رنگ کے ساتھ ڈھانپا اور چھپایا جاتا ہے اور اس مقصد کے لئے اسے استعمال بھی کیا جاتا ہے (۲)، ایک اور لحاظ سے سیاہ رنگ ہیبت اور امتیاز کا رنگ ہے اسی وجہ سے بڑی شخصیات کا لباس عموماً سیاہ یا سرمئی ہوتا ہے اور تاریخ میں کثرت سے ایسے موارد موجود ہیں کہ جہاں افراد یا حکومتیں ہیبت و تشخص کے اظہار کے لئے اس رنگ سے استفادہ کرتے رہے ہیں. (۳)

سیاہ رنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ رنگ قدرتی طور پر غم آور ہے اور ماتم و عزا کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اکثر لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی وفات میں اظہار غم و حزن کے لئے یہی رنگ استعمال کرتے ہیں.

البتہ ایام سوگواری میں اس رنگ کے اختیار کرنے کی سابقہ وجہ کے علاوہ ایک منطقی

---

(۱) شیخ صدوق، امالی، ص۷۷

(۲) یا دشت ھای در زمینہ فرھنگ و تاریخ، ص۲۷۲۔۲۷۳

(۳) ابن اثیر لکھتا ہے ابو مسلم خراسانی نے کسی کو سیاہ لباس کے بارے میں جواب دیا کہ یہ ہیبت کا لباس ہے ترجمہ الکامل، ج۹، ص۱۱۴

وجذباتی وجہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اپنے کسی عزیز کے غم میں سیاہ لباس پہن لیتا ہے یا در و دیوار پر سیاہ کپڑے لٹکا دیتا ہے وہ اپنے اس عمل کے ساتھ یہ بتلا دینا چاہتا ہے کہ تم میری آنکھوں کی روشنی تھے، تمہارے بدن کو منوں مٹی تلے دفن کرنا ایسے ہی تھا کہ جیسے چاند اور سورج مغرب کی سمت میں غروب کر جاتے ہیں، تیرے دفن نے میرے لئے دنیا تاریک کر دی ہے، میری دنیا تیرے بعد سیاہ و تاریک ہو چکی ہے، جیسا کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا نے اپنے باباؐ کی وفات کے آٹھویں روز رسولؐ خدا کی قبر اقدس پر حاضری دی اور عرض کیا:

یا ابتاہ قد انقطعت بک الدنیا بانوارھا و زوت زھرتھا و کانت ببھجتک زھرۃ فقد اسود نھارھا،فصار یحکی حسنا دسھار طبھا و یابسھا ...... والائی لازمنا. (۱)

''بابا آپ چلے گئے اور آپ کے جانے سے دنیا نے اپنی روشنیاں ہم سے لے لیں، اپنی نعمت اور خوشی ہم سے روک لی، دنیا آپ کے حسن و جمال سے روشن تھی اب اس کا روشن دن سیاہ ہو چکا ہے اور اس کا خشک و تر اس کی تاریک راتوں کی حکایت کرتا ہے...... اور غم و اندوہ مسلسل ہمارے ساتھ ہے''

بی مہر رخت ، روز مرا نور نماندہ است   وز عمر مرا جز شب دیجور نماندہ است

پس سیاہ لباس اپنے اندر ایک رمز و راز کا حامل ہے، جس کی وجہ سے غم و اندوہ کے موقع پر ایک قدرتی و منطقی سنت بن چکا ہے، پیروکاران اہل بیتؑ ایام عزا میں سیاہ لباس پہنتے ہیں جس کے ذریعے معصومینؑ کی بارگاہ میں عشق و محبت کا اظہار کرتے ہیں، سید الشہداء

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۳ ص ۱۷۴۔۱۸۰

کی حمایت وطرف داری کا اظہار کرتے ہیں، حق و باطل کے محاذ پر اور معنوی طور پر حیات معنوی کے آفاق کی تاریکی کا اظہار کرتے ہیں۔(۱)

عزاداری اہل بیتؑ میں سیاہ لباس ظاہراً سیاہ ہے لیکن باطن روشن وسفید ہوتا ہے شیخ محمود شبستری نے کیا خوب کہا ہے۔

سیاهی گر بدانی نور ذات است — به تاریکی داون آب حیات است

چه می گویم که هست این نکته باریك — شب روشن میان روز تاریك

سوال ۴۰ : کیا دوسری اقوام میں بھی سیاہ لباس رائج ہے ؟ کیا اسلام کے بعد یہ لباس اعراب یا عباسیوں کے ذریعے ایران میں داخل ہوا، جبکہ ایرانی تمدن میں ایسی چیز موجود نہیں تھی؟

جواب : پہلا: سیاہ لباس پوری تاریخ میں بشر کی دیرینہ سنت رہی ہے، قدیم ایران ہو یا یونان یا دور جاہلیت کا عرب۔

دوسرا: سیاہ پوشی عباسیوں یا عربوں سے ایران منتقل نہیں ہوئی، بلکہ ملت ایران کی ثقافت میں اس کی جڑیں بہت قدیم ہیں، درج ذیل نکات اس مطلب کو کافی حد تک روشن کرتے ہیں۔

۱) سیاہ پوشی کی تاریخ

قدیم تاریخی اور ادبی شواہد کثرت سے اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ بہت سی قومیں عزاداری کی حالت میں سیاہ لباس پہنا کرتی تھیں، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف ایران، یونان اور عربوں کی قدیم تہذیب سے چند نمونے ذکر کیے جاتے ہیں:

الف) قدیم ایران

قدیم ایرانی کتابوں میں کثرت سے ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے

---

(۱) سیاہپوشی در سوگ ائمہ نور، ص۳۱_۵۳

ایران میں سیاہ لباس غم و ماتم کی علامت سمجھا جاتا تھا، شاہنامہ فردوسی جو کہ قدیم ایرانی تمدن وثقافت کا ترجمان ہے ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے جن میں سیاہ لباس غم و ماتم کی نشانی کے طور پر ذکر ہوا ہے. خصوصاً جب رستم اپنے بھائی شغار کے ہاتھوں انتہائی بزدلی سے قتل ہو جاتا ہے فردوسی کہتا ہے:

بہ یک سال در سیستان سوگ بود   ہمہ جامہ ہاشان، سیاہ و کبود

عصر ساسانی میں بھی جب بہرام گور کی وفات ہوئی تو اس کے ولی عہد یزدگرد نے کہا.

چہل روز سوگ پدر داشت راہ   بپوشید لشگر کبود و سیاہ

جب فریدون کی وفات ہوئی تو اس کے پوتے اور اس کے جانشین نے کہا

منو چہر یک ہفتہ با درد بود   دو چشمش پر از آب و رخ زردہ بود
سپاھش ہمہ کردہ جامہ سیاہ   تو ان گشتہ شاہ و غریوان سپاہ

یہ سیاہ لباس آج بھی ایران میں رائج ہے (۱)

ب) قدیم یونان

قدیم یونانی دیو مالائی داستانوں میں آیا ہے کہ جب ہیکٹر کے ہاتھوں پٹروکلوس قتل ہو گیا اور اس کی وجہ سے ٹیٹس سخت غمگین ہو گیا تو اس نے عزاوغم کی حالت کے اظہار کے لئے انتہائی سیاہ لباس زیب تن کر لیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یونان میں سیاہ پوشی کی رسم انتہائی پرانی ہے جو کہ ہومر کے دور تک جا پہنچتی ہے.

عبرانیوں (قدیم یہودیوں) میں بھی رسم یہی تھی کہ اپنے رشتہ داروں کے سوگ میں سر منڈوا کر اس پر راکھ مل لیتے اور لباس سیاہ یا اس جیسے رنگ کے پہنتے.(۲)

بستانی اپنے دائرۃ المعارف میں یورپی تمدن کی ان آخری صدیوں میں عزاوسوگ کے لئے سیاہ رنگ کو مناسب ترین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) معجم البلدان حموی، ج ۳ ص ۳۵۲، اور تاریخ گیلان و دیلمستان ص ۲۲۳

(۲) دائرۃ المعارف ج ۶ ص ۱۷۰۔۱۷۲

''عزاداری وسوگ کی مدت مرنے والے کے ساتھ رشتہ کے لحاظ سے ایک ہفتہ سے ایک سال تک رہتی ہے، بیوہ تقریبا ایک سال تک غم مناتی ہے اور اس مدت میں اس کا لباس سیاہ ہوتا ہے بغیر کسی نقش ونگار اور زیورات کے.(۱)

ج) اعراب، تاریخ، شعر، لغت اور سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ عرب مصر وشام کے ہوں یا عراق وحجاز کے سب کے نزدیک سیاہ رنگ سوگ کی علامت سمجھا جاتا ہے. زمخشری (چھٹی صدی ہجری کے مفسر وادیب) لکھتے ہیں کہ ایک ادیب بیان کرتا ہے میں نے ایک راہب کو سیاہ لباس میں دیکھا اس سے پوچھا کہ تم نے سیاہ لباس کیوں پہنا ہوا ہے؟ تو اس نے کہا تم یہ بتاؤ جب عربوں کا کوئی عزیز فوت ہوتا ہے تو وہ کیا پہنتے ہیں؟ میں نے کہ سیاہ لباس تو اس نے کہا میں بھی اپنے گناہوں کے غم میں سیاہ لباس پہنے ہوئے ہوں.(۲)

تاریخی کتابوں میں آیا ہے کہ عرب مصیبت میں اپنے لباس سیاہ کر لیتے تھے. (۳) جنگ بدر میں جب مشرکین وقریش کے ستر افراد مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تو انہوں نے اپنے مقتولوں کے سوگ میں سیاہ لباس پہن لئے (۴). ان تاریخی اور ادبی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانوں سے سیاہ رنگ مختلف قوموں میں غم وماتم کی نشانی رہا ہے اور یہ چیز ایران کے اسلامی دور کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے عرب، ایرانی اور یونانی قومیں سوگ میں سیاہ لباس پہنا کرتی تھیں.(۵)

۲) اھل بیت علیھم السلام کا سیاہ لباس پھننا

معتبر حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ طاہرینؑ نے بھی اس قدیم

---

(۱) دائرۃ المعارف، ج۶، ص۱۰۷-۲۲۷

(۲) ربیع الابرار نصوص الاخبار، ج۳، ص۲۷۷

(۳) اخبار الدولۃ العباسیۃ، ص۲۴۷

(۴) السیرۃ النبویہ، ج۳، ص۱۰-۱۱

(۵) تمدن اسلام در قرن چهارم هجری، ج۲، ص۱۲۷

تاریخی سنت کی تائید فرمائی ہے اور اپنے عزیزوں کے سوگ میں سیاہ لباس زیب تن فرماتے رہے ہیں.

شرح نہج البلاغہ میں ابن ابی الحدید روایت کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے اپنے بابا علی علیہ السلام کے سوگ میں سیاہ لباس زیب تن فرمایا اور اسی سیاہ لباس میں آپ لوگوں میں تشریف لائے اور خطبہ ارشاد فرمایا(۱)

ایک حدیث کو اکثر محدثین نے نقل کیا ہے. امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: بنی ہاشم کی عورتوں نے امام حسینؑ کے سوگ میں سیاہ لباس پہنے.

لما قتل الحسینؑ بن علیؑ و کا ن علیؑ بن الحسینؑ یعمل لهن الطعا م الما تم (۲)

"جب حسینؑ بن علیؑ کی شہادت ہوگئی تو بنی ہاشم کی عورتوں نے سیاہ اور سخت بالوں کے لباس پہن لئے وہ گرمی و سردی کی پروانہ کرتیں اور ان کے مشغول ماتم ہونے کی وجہ سے ہمارے بابا علی بن الحسینؑ ان کے لئے کھانے کا بندوبست فرماتے"

عباسیوں کے سیاہ لباس کی وجہ

عباسی اپنے قیام کے دوران شہدائے اہل بیتؑ کے انتقام کا نعرہ لگاتے رہے اور جب انہوں نے حکومت حاصل کرلی تو اپنی حکومت کو حکومت آل محمد کا نام دیا اور اسے علی ابن ابی طالبؑ کی خلافت کا تسلسل کہتے رہے اپنے وزیر اعظم ابو سلمہ خلال کو وزیر آل محمد اور اپنے مشہور داعی ابو مسلم خراسانی کو امیر آل محمد یا امین آل محمد کہتے تھے. انہوں نے عزت

---

(۱) شرح نهج البلاغه، ابن ابی الحدید، ج ۱۳، ص ۲۲

(۲) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۸۸

رسولؐ کی ہتک حرمت اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈھائے جانے والے مصائب پر سوگ وعزا کی خاطر اپنے لئے سیاہ لباس کا انتخاب کیا، کیونکہ اپنے عزیزوں کی وفات پر سیاہ پوشی ایک رائج سنت تھی خصوصاً شہداء اہل بیت کے غم میں.(۱)

بنی عباس نے کربلا کے مظلوم شہیدوں، زید اور یحییٰ کے انتقام کے نام پر اپنے سیاہ پرچم اور سیاہ لباس کو اہل بیتؑ کے شہیدوں کے سوگ کے طور پر اختیار کیا اور اس حربے کے ساتھ اہل بیتؑ کے چاہنے والوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس ظاہری تبلیغ کو لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رکھنے کے لئے حکومت حاصل کرنے کے بعد بھی انہوں نے سیاہ پرچم اور سیاہ لباس کو اپنائے رکھا اور اسے اپنا ہمیشہ شعار بنا لیا.(۲)

ان کے اسی ظاہری دھوکے کی وجہ سے امام صادق علیہ السلام اور دوسرے آئمہ طاہرین نے سیاہ لباس پر بعض دفعہ تنقید بھی کی، ان موارد میں آئمہ نے سیاہ لباس کی مخالفت بطور مطلق نہیں فرمائی بلکہ اس خاص سیاہ لباس پر تنقید کی ہے جو عباسی حکومت کی طرف سے لازم کر دیا گیا اس حکومت کے ساتھ تعلق کی علامت کی طور پر اور ظالم حکومت کی اطاعت کے عنوان سے، نہ کہ اہل بیت کے شہیدوں کے غم میں سیاہ پوشی کی مذمت کی ہو ایسا قطعاً نہیں تھا.(۳)

عزاداری کی روش و طریقہ

سوال ۴۱ : امام حسینؑ پر عزاداری کس حد تک جائز ہے؟

جواب : اہل بیتؑ پر عزاداری کی حکمت کو سامنے رکھتے ہوئے خصوصاً امام حسینؑ پر عزاداری کی حکمت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی شرعی وعقلی حدود کی تعیین کی جاتی ہیں. اگر

---

(۱) شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۷، ص ۱۷۲

(۲) اخبار الدولة العباسیة، ص ۲۳۰_۲۳۲، ۲۳۲

(۳) سیاهپوشی در سوگ ائمہ نور، ص ۱۹۵_۲۰۰، ۱۲۹، ۱۵۵_۷۶، ۷۷

عزاداری اس طریقے سے کی جائے کہ جس سے جوش ہوش پر غالب ہو اور فلسفہ وحکمت عزاداری سے انحراف پیدا ہو جائے تو یہ عزاداری جائز، معقول اور مقبول عزاداری کی حدود سے خارج ہوگی، اگر عزاداری کے طریقے ایسے ہوں کہ معاشرہ کے عقلاء اس کی تحسین نہ کریں اور اسے مذہب اور عاشورہ کی تعلیمات کو کمزور کرنے کا موجب قرار دیں تو یقیناً یہ ناجائز عزاداری شمار ہوگی.

ضروری ہے کہ عزاداری کی شکل وصورت ایسی ہو جو عاشورہ کے اصلی پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکے اور عاشورہ والوں کے بارے میں لوگوں کے اعتقادات کو مضبوط بنائے، لیکن اگر مضبوط کرنے کے بجائے اصل مسئلہ کو قابل اشکال بنا دے تو اسے مناسب طریقہ نہیں کہہ سکیں گے اور نہ ہی اس عظیم مقصد پر پورا اترے گی.

سوال ۴۲ : امام حسینؑ کے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کے مقابلے میں بعض مجالس میں انھیں انتہائی مظلوم و بے بس ظاہر کیا جاتا ہے اس کی کیا توجیہ ہو گی؟

جواب : عزت وشرف بہت پسندیدہ صفت ہے جس کی قرآنی آیات میں بڑی تحسین ہوئی اور اسے خدا، رسول اور مومنین کی صفات میں سے قرار دیا گیا ہے.(۱)

امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب اسی قرآنی تعلیم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی گفتار و کردار میں ہمیشہ اس پر کار بند رہے اور کسی مرحلے پر بھی کسی قسم کی ذلت وخواری کو قبول نہ کیا. یہاں تک کہ "**ھیھات منا الذلۃ**" جیسے شعار نہضت عاشورہ کے اصلی ترین شعاروں میں سے شمار ہوتے ہیں، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض کتابوں میں جو کہ بعض مجالس اور خطباء کے لئے دلیل بھی بنتی ہیں عزت وعظمت کا یہ عنصر سیرت سید الشہداء میں ناپید نظر آتا ہے.

---

(۱) نساء /۱۳۹، منافقون /۸، روایات میں بھی اس بارے بڑی تاکید ہوئی ہے دیکھیں، نہج البلاغہ حکمت ۳۷۱ـ۱۱۳، منتخب میزان الحکمۃ، ص ۳۳۶

اس طریقہ کی ایک نفسیاتی وجہ موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ خطباء وذاکرین لوگوں کو اس عظیم واقعہ کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں واقف کرنے کے بجائے انہیں زیادہ سے زیادہ رلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کی خاطر ہر غیر موثق وغیر معتبر کتاب سے جو مطلب بھی ملتا ہے اسے پڑھنے سے دریغ نہیں کرتے اور لوگوں کے سامنے امام حسینؑ کو کمزور وبے بس اور لاچار بنا کر پیش کرتے ہیں جب کہ ایسے مطالب نہ صرف امام حسینؑ و اصحاب امام حسین علیہ السلام کی عزت وشرف سے بہت بعید ہیں بلکہ دینِ اسلام کی غیرت مندی اور رسولؐ خدا، علی مرتضیٰ اور اہل بیت کرام علیہم السلام کی سیرت سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ البتہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کی تحلیل سے آپ کی مظلومیت بیان کرنا نہ صرف آپ کی عزت وشرف کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا بلکہ آپ کی اور آپ کے اصحاب کی عزت وعظمت کو مزید اجاگر کرتا ہے، کیونکہ آپ پر دشمنوں کی طرف سے ظلم وستم کے ڈھائے جانے اور آپ کی طرف سے اس کے مقابلے اور ظلم سے نفرت کو بیان کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ عزت وعظمت کی حامل روح کس کس طرح سے ظلم کے مقابل قیام کرسکتی ہے۔

سوال ۴۳ : عاشورہ کی یاد و مجالس کو مباحثہ و گفتگو کی صورت میں کیوں منعقد نہیں کیا جاتا؟ کیا واقعہ عاشورہ کو زندہ رکھنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ انسان سینہ زنی، ماتم اور گریہ کرے اور گھربار کو سیاہ پوش کرلے، لوگ آدھی رات تک عزاداری میں مصروف رہیں اور دن میں اپنے کام کاج سے بھی رہ جائیں اور اس سے کتنا مالی نقصان ہوتا ہے، کیا ممکن نہیں ہے کہ اس واقعہ کی یاد اس طرح منائی جائے کہ اس سے مالی و اجتماعی نقصان کم سے کم ہو مثلاً بحث و مباحثہ ہو، گول میز کانفرنس ہو، سیمینار ہو، جہاں اس واقعہ کے بارے میں گفتگو ہو

اور اس کی یاد تازہ ہو؟

جواب : شخصیت سید الشہداء کے بارے میں گول میز کانفرنس کرنا، تقریریں کرنا، مقالات لکھنا اور سیمینار کرنا یا اس طرح کے دوسرے علمی و تحقیقی کام کرنا بہت مفید اور ضروری ہیں اور اس بارے میں کافی حد تک کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اور لوگ معارف سے روشناس ہو رہے ہیں. یہ سب کام ضروری ہیں لیکن کیا واقعہ عاشورہ سے مکمل فائدہ اٹھانے کے لئے یہی کام کافی ہیں یا اس کے لئے عزاداری اس طرح بھی منائی چاہیے جیسے آج کل منائی جارہی ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ ہم خود انسان پر (سایکالوجیکلی) نفسیات شناسی کے حوالے سے نظر ڈالیں کہ آیا کون سے عوامل سے اس کے آگاہانہ کردار و سلوک میں موثر ہیں کیا صرف معرفت وہ واحد عامل ہے جو انسان کے اجتماعی کردار و سلوک کی تشکیل میں موثر ہے یا اس کے علاوہ بھی کچھ عوامل ہیں؟

جب ہم اپنے سلوک و طرز عمل پر نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سلوک و طرز عمل میں کم از کم دو عوامل بنیادی تاثیر رکھتے ہیں. ایک قسم معرفتی عوامل ہیں جو انسان کے کسی مطلب کے سمجھنے اور قبول کرنے کا باعث بنتے ہیں اور واضح ہے کہ وہ مطلب جس باب سے متعلق ہو اس کے مناسب عقلی یا تجرباتی دلیلوں یا دوسرے طریقوں سے اسے استفادہ کیا جائے گا، معرفت یقینی طور پر ہمارے طرز عمل میں بہت زیادہ دخالت رکھتی ہے، لیکن صرف معرفت کو موثر عامل قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اور عوامل بھی ہیں جن کی تاثیر ہمارے طرز عمل میں معرفت سے زیادہ ہے، ان عوامل کو کلی طور پر احساسات، جذبات اور میلانات قرار دیا جا سکتا ہے، یہ کچھ اندرونی و نفسیاتی عوامل ہیں جو ہمارے طرز عمل میں موثر ہوتے ہیں.

آپ اپنے طرز عمل کا تجزیہ کریں چاہے آپ کی فردی و خاندانی زندگی کے حوالے

سے ہو یا اجتماعی وسیاسی حوالوں سے ہو، آپ دیکھیں گے کہ وہ اصلی عامل جس نے آپ کو یہ طرز عمل اپنانے پر برانگیختہ کیا ہے، ہوسکتا ہے آپ کے اندرونی ابھارنے والے عوامل ہی ہوں.

اس بارے میں شہید مطہریؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے اندر ایک عامل کا ہونا ضروری ہے جو ہمیں کسی عمل پر ابھارے، کسی کام کو انجام دینے کے لئے ہمارے اندر اس کام کے بارے میلان ہونا چاہیے اس کام کے بارے ہمارے اندر شوق واشتیاق ہونا ضروری ہے، اس کام کے بارے تعلق خاطر ہونا چاہیے تا کہ اسے انجام دیں، صرف اس کے بارے میں معرفت وشناخت کافی نہیں ہے جو ہمیں اس کام کی طرف متحرک کرے، ہمارے اندر ایک اور روحانی عادل کی ضرورت ہے جو ہمیں اس کام پر ابھارے اور اس کے انجام کی طرف حرکت دے، ان جیسے عوامل کو نفسیاتی محرک، احساسات وجذبات کہتے ہیں، یہ عوامل بطور کلی انسان کے اندر انجام دینے کے میلان کو ایجاد کرتے ہیں اس کے انجام دہی کے شوق وجذبے کو بیدار کرتے ہیں. جب تک یہ عوامل نہ ہوں کام انجام نہیں پاسکتا، حتیٰ کہ اگر انسان کو یقین ہو جائے کہ فلاں قسم کی غذا یا خوراک اس کے بدن کے لئے فائدہ مند ہے لیکن جب تک اس کے اندر کھانے کی خواہش نہ ہو یا اس کی کھانے کی خواہش بیدار نہ کی جائے وہ اس غذا کو کھانے کے لئے متحرک نہیں ہوگا، مثلاً کسی میں کھانے کی خواہش ہی مر جائے یا ایسی کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے، جس کی وجہ سے اس کے اندر کھانے کی خواہش پیدا نہ ہو اسے لاکھ کہتے رہیں یہ غذا تمہارے جسم کے لئے بہت فائدہ مند ہے وہ اسے کھانے میں کوئی دلچسپی نہیں لے گا. پس معرفت اور جاننے کے علاوہ انسان کے اندر اس میلان ومحرک کا ہونا بھی ضروری ہے.

اجتماعی اور سیاسی مسائل بھی اسی طرح کا حکم رکھتے ہیں، انسان جتنا بھی علم حاصل کرلے کہ فلاں اجتماعی یا سیاسی طرز عمل بہت مفید ہے جب تک اس کے انجام دینے کے لئے اس کے

اندر محرک موجود نہ ہوگا وہ اسے انجام دینے کے حوالے سے کوئی اقدام نہیں کرے گا''

اب جب کہ اس بات کا پتہ چل گیا کہ ہمارے انسانی اور عالمانہ عمل وسلوک کے لئے دو قسم کے عوامل چاہئیں معرفتی وشناختی عوامل اور تحریکی وجذباتی عوامل اور یہ بات بھی ہم جانتے ہیں کہ سید الشہداء کی تحریک انسانوں کی سعادت میں کس حد تک موثر ہے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ صرف یہ معرفت ہمارے طرز عمل میں موثر نہیں ہوگی، اس واقعہ کی یاد اور اس کا جاننا تب ہمیں اسی طرح کے کردار کو اپنانے کا باعث بنیں گے کہ خود ہمارے اندر ایسا محرک پیدا ہو جائے جو ہمیں ایسا ہی طرز عمل اپنانے پر برانگیختہ کرے۔

اس واقعہ کی معرفت وشناخت ایسا جذبہ پیدا نہیں کرتی بلکہ ضروری ہے کہ ہمارے جذبات واحساسات کو ابھارا جائے تاکہ ہم اس کے مشابہ کام انجام دیں، گفتگو، تقاریر، سیمینار وغیرہ پہلے عامل کے لئے مفید ہوسکتی ہیں یعنی ہمیں اس واقعہ کے بارے میں معرفت وشناخت دے سکتے ہیں. لیکن ایک عامل کو تحریک دینے کی بھی ضرورت ہے ہمارے اندر احساسات وجذبات کو ابھارنا، اب ان کو ابھارنے کے لئے معرفت کسی حد تک فائدہ مند تو ہوسکتی ہے لیکن اصل موثر وہ چیزیں ہیں جو براہ راست ہمارے احساسات وجذبات پر اثر انداز ہوتی ہوں، جب ایک واقعہ کو عملاً کرکے دکھایا جاتا ہے اس کی تاثیر اس سے کہیں بڑھ کر ہوگی کہ انسان صرف سن لے کہ ایسا واقعہ پیش آیا ہے، آپ نے بھی اس کا تجربہ بارہا کیا ہوگا، آپ نے بارہا سنا ہوگا اور یہ بات آپ کے ذہن میں موجود ہوگی کہ امام حسینؑ عاشورہ کے دن شہید ہو گئے لیکن صرف یہ جان لینے سے آپ کے آنسو تو جاری نہیں ہوئے ہوں گے، ہاں جب آپ اس خاص ماحول میں جاتے ہیں مجلس ہو رہی ہو، مرثیہ پڑھا جا رہا ہو، نوحہ پڑھا جا رہا ہو خصوصاً اگر اس میں سُر بھی اچھی استعمال ہو رہی ہو اب آپ دیکھیں گے کہ کیسے بے اختیار آپ کے آنسو نکلتے ہیں، یہ انداز آپ کے جذبات و احساسات کو ابھارنے میں وہ اثر کرے گا، جو صرف پڑھنے مطالعہ کرنے اور جان لینے سے

پیدا نہیں ہو سکتا. اسی طرح جب ایک منظر دیکھ لیا جاتا ہے تو اس کی تاثیر صرف جان لینے سے کہیں بڑھ کر ہے.

اس مذکورہ بالا وضاحت و تفصیل کا مقصد یہ تھا کہ جہاں ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا وہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آپ کیوں مظلومی کے ساتھ شہید کر دیے گئے اور یہ مطلب ہمارے لئے اس انداز میں پیش کیا جائے کہ جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو سکے جتنا زیادہ یہ ہمارے جذبات کو ابھارے گا اتنا ہی زیادہ واقعہ عاشورہ ہماری زندگی پر اثر انداز ہوگا.

بس واقعہ عاشورہ کی عالمانہ تحقیق و تجزیہ عزاداری والا کام نہیں کر سکتا بلکہ ان مناظر کا معاشرے میں دکھایا جانا ضروری ہے جو لوگوں کے جذبات ابھار سکیں، جب لوگ صبح گھروں سے نکلیں دیکھیں کہ شہر کے درودیوار سیاہ پوش ہیں اور سیاہ علم لہرا رہے ہیں، حالت کی یہی تبدیلی دل پر اثر انداز ہو جاتی ہے، اگرچہ لوگ جانتے ہیں کہ کل محرم کی پہلی تاریخ ہے لیکن سیاہ علم دیکھ کر ان کے دل پر جو اثر ہوگا وہ صرف یہ جاننے سے نہیں ہوگا کہ کل پہلی محرم ہے اور جب ماتمیوں کے دستے نوحہ خوانی اور سینہ زنی کرتے ہوئے گلیوں بازاروں میں نکل آتے ہیں تو اس کا جو اثر دلوں پر ہوتا ہے وہ کسی اور چیز سے ممکن نہیں ہے.

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ امام خمینیؒ بار بار یہ کیوں فرماتے تھے کہ ہم جو کچھ بھی رکھتے ہیں وہ محرم وصفر سے ہے، وہ کیوں اصرار کرتے تھے کہ عزاداری کو اسی پرانے رسم ورواج کے مطابق باقی و زندہ رکھیں؟ کیونکہ ان چودہ صدیوں میں تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ چیزیں انسان کے جذبات ابھارنے میں بہت مؤثر ہیں اور اس حوالے سے معجزنما ہیں اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ انقلاب اسلامی کے دوران یا اس کے بعد محاذ جنگ پر زیادہ تر کامیابیوں کا تعلق اس جوش و جذبے سے تھا جو ایام محرم و عاشورہ کے دوران عزاداری

سے حاصل ہوتا تھا. اس کے علاوہ ایسی کونسی چیز ہے جو لوگوں میں اس حد تک موثر ہو اور ان کے لئے محرک بن سکے اور ایسا مقدس عشق و محبت ان کے اندر پیدا کرے کہ جس کے نتیجے میں لوگ شہادت کے لئے تیار ہو جائیں. اگر ہم یہ کہیں کہ کسی اور مکتب و مذہب میں ایسا عامل موجود نہیں ہے تو یہ بات قطعاً غلط بھی نہیں ہوگی.

زمانۂ عزاداری

سوال ۴۴ : شہادت امام حسینؑ یا اس طرح کے مواقع پرھم ایام عزا سے پہلے کیوں عزاداری شروع کر لیتے ھیں؟

جواب : عاشورہ کے دن سے پہلے جو عزاداری ہوتی ہے یہ درحقیقت روز عاشورہ کی عزاداری کا مقدمہ ہے، امام حسینؑ کی اصل عزاداری شریعت میں بہت تاکیدی مستحبات و احکام میں سے ہے. لیکن اس کی کیفیت اور انجام دہی کا وقت یہ لوگوں اور علاقوں کے رسم و رواج کے مطابق ہو سکتے ہیں. مثلاً بعض علاقوں میں عزاداری سات محرم کو شروع ہوتی ہے اور ۱۲ محرم تک جاری رہتی ہے اور بعض علاقوں میں اول محرم سے دسویں محرم تک عزاداری ہوتی ہے اور بعض جگہوں پر پورا محرم و صفر عزاداری ہوتی ہے یہ سب صورتیں ٹھیک ہیں اور ان میں کوئی اشکال نہیں ہے، پس عزاداری سید الشہداء ہو یا لوگوں کے عزیزوں کا سوگ یہ لوگوں کے علاقائی رسم و رواج کے مطابق انجام پاتے ہیں سید الشہداء کی شہادت تو ۶۱ ہجری میں ہو چکی اب عزاداری اول محرم کو ہو یا کسی اور تاریخ کو شہادت سید الشہداء کے بعد ہی ہوگی.

ثواب عزاداری

سوال ۴۵ : جن روایات میں امام حسینؑ کی عزاداری کا ثواب بے حد و حساب ذکر کیا گیا ھے کیا وہ صحیح ھیں؟

جواب : سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی عزاداری قربت خدا کے سب سے بڑے

اسباب میں سے ہے اور بہت زیادہ اجر وثواب رکھتی ہے اور اس بارے میں معتبر کتابوں میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں اور کافی معتبر روایات ہیں.

اس بارے کچھ نکات پر توجہ ضروری ہے:

۱) اس طرح کی روایات میں بھی صحیح وضعیف پائی جاتی ہیں.

۲) اگر روایات میں کسی عمل پر ایک خاص اثر کو مرتب کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عمل اس اثر کے لئے علت تامہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس عمل میں اس اثر کا تقاضا (اقتضاء) موجود ہے وہ عمل علت تامہ تب بنے گا کہ تمام موانع دور ہو جائیں ایسی صورت میں وہ علت اس پر یقینی اثر کرے گی، لیکن اگر مقتضی کے سامنے مانع پیش آجائے تو وہ مقتضی اثر انداز نہیں ہو سکے گا، مادی دنیا اور اسباب ومسببات کی دنیا میں بھی اسی طرح ہے مثلاً جب کہتے ہیں کہ آگ لکڑی کو جلانے کا سبب ہے تو یہ مقتضی کے عنوان سے ہے یعنی جب تک دوسری شرائط جیسے آکسیجن کا ہونا پوری نہ ہو جائیں اور جلانے سے جو چیزیں مانع ہو سکتی ہے جیسے لکڑی کا گیلا ہونا، یہ دور نہ ہو جائیں تو لکڑی کو آگ جلا نہیں سکے گی. پس اگر گیلی لکڑی آگ میں ڈالی جائے اور اسے آگ نہ جلائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ یہ بات غلط تھی کہ آگ لکڑی کو جلاتی ہے، بلکہ یہ بات سچ تھی لیکن اس کی کچھ شرائط تھیں ان کا پورا ضروری ہے. جیسے آکسیجن موجود ہو، لکڑی میں جلنے سے موانع جیسے گیلا ہونا موجود نہ ہو اگر یہ سب شرائط پوری ہو جائیں تو علت تامہ وجود پذیر ہو جائے گی اب یقیناً وحتماً آگ لکڑی کو جلائے گی، یہ اعمال جو ہم انجام دیتے ہیں ان کی تاثیر بھی اس اثر کے حوالے سے اسی طرح ہے (جز العلۃ ہے) اس کے لئے اور شرائط بھی چاہئیں لیکن وہ شرائط کیا ہیں ان میں ہر ایک کی دخالت کس حد تک ہے کیا سب کی تاثیر برابر ہے یا فرق کرتی ہے ایک مورد میں ایک عمل اثر اصلی عامل ہو دوسرے مورد میں دوسرا عمل تاثیر کا سسٹم کیا ہے. دوسری چیزیں ان کے اثر کو مضبوط کرتی ہیں یا خود براہ راست اثر انداز ہیں، یہ دسیوں سوالات

ہیں کہ انسانی عقل اس حد تک نہیں ہے کہ ان کے بطور کامل صحیح جوابات دے سکے اور انبیاء الٰہی نے جو انسانیت کو عظیم فائدے پہنچائے ہیں ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اسے ایسے عوامل کے بارے میں بتلایا ہے جنہیں بشر کی عقل خود جان نہیں سکتی تھی ۔

دینی فرمائشات میں فلسفی دقت و تحقیق سے جو بات پتہ چلتی ہے وہ یہ ہے کہ علت کا دائرہ مادی علتوں اور اسباب میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہ مادی اسباب وعوامل تو ماورائے طبیعت کے تابع ہیں۔

۳) سید الشہداء کی عزاداری، گریہ، اور زیارت پر جو وسیع ثواب (کمیت و کیفیت کے لحاظ سے) ذکر ہوا ہے اس پر زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حضرت نے جس شجاعت، دلیری، ایثار، توکل، حریت کا مظاہرہ کیا اور جو مصائب برداشت کئے ان کے مقابل یہ ثواب زیادہ نہیں ہے، ذیل کے واقعہ پر توجہ کریں تا کہ اس مطلب کی مزید وضاحت ہو سکے۔

تشیع کی معروف شخصیت علامہ بحر العلوم سامراء جا رہے تھے اور راستے میں گریہ امام حسینؑ پر ثواب (تمام گناہوں کی بخشش) کے بارے میں سوچتے جا رہے تھے اسی اثناء میں ایک عرب جو ایک سواری پر سوار تھا آپ کے پاس پہنچا اور اس نے آپ پر سلام کیا اور پوچھا اے سید میں آپ کو فکر مند دیکھ رہا ہوں اگر کوئی علمی مسئلہ ہے تو مجھے بیان کریں شاید میں کچھ کہہ سکوں، سید بحر العلوم نے کہا:

> ”میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیسے خداوند امام حسینؑ کے زائرین اور گریہ کرنے والوں کو اتنا زیادہ ثواب دیتا ہے جیسے یہ کہ زائر کو ہر قدم کے بدلے ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب ملے گا، ایک آنسو کے قطرے کے بدلے اس کے تمام صغیرہ وکبیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے؟ تو اس عرب سوار نے کہا تعجب نہ

کرو میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں جس سے تمہاری مشکل حل ہو جائے گی. ایک بادشاہ شکار کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گیا، بیابان میں سے ایک خیمہ نظر آیا وہ وہاں خیمہ کے اندر داخل ہوا اس نے ایک بڑھیا اپنے بیٹے کے ہمراہ خیمے کے اندر بیٹھی ہے، ان کے پاس صرف ایک ہی بکری تھی جس سے ان کی روزی چلتی تھی اس کے علاوہ کچھ نہ تھا، اس بڑھیا نے وہی بکری ذبح کر دی اور بادشاہ کو کھانا کھلایا وہ بڑھیا اس بادشاہ کو جانتی نہیں تھی صرف مہمان کے احترام میں اس نے یہ کیا، بادشاہ رات وہیں رہا، واپس آ کر عمومی دربار میں اس نے یہ واقعہ ذکر کیا کہ کیسے میں اپنے لشکر سے جدا ہو گیا اور بھوکا پیاسا اس خیمے تک پہنچا وہ بڑھیا مجھے پہچانتی نہیں تھی، اس نے اپنا پورا سرمایہ یعنی بکری میرے لئے خرچ کر دیا اب آپ لوگ بتائیں اس بڑھیا اور اس کے بیٹے کی اس محبت و ایثار کے بدلے میں اسے کیا دوں کہ اس عمل کی تلافی ہو سکے؟ کسی نے کہا کہ سو بکریاں دے دیں، کسی نے کہا کہ سو بکریاں اور سو اشرفیاں دے دیں. کسی نے کہا فلاں زمین دے دیں، تو بادشاہ نے کہا یہ صحیح نہیں ہاں میں اگر اسے پوری سلطنت دے دوں تو یہ تلافی ہو گی کیونکہ ان کے پاس جو کچھ تھا انہوں نے وہ مجھ پر نثار کر دیا اب میرا فرض بنتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے میں وہ سب انہیں دے دوں، سید الشہداء کے پاس بھی جو کچھ تھا مال، اہل و عیال، بھائی، بیٹے، سر اور جسم مطہر وہ سب کے سب راہ خدا میں

نثار کر دیئے اب رضائے خدا یہ ہے کہ وہ اس کی زیارت کرنے
والوں اور اس پر گریہ کرنے والوں کو یہ سب اجر و ثواب دے،
وہ عرب یہ کہہ کر سید بحر العلوم کے سامنے غائب ہو گئے" (۱)

زیارت عاشورہ کی اهمیت

سوال ۴۲ : زیارت عاشورہ کی اتنی زیادہ اهمیت کی کیا وجہ هے اور اس کے فوائد کیا هیں ؟

جواب: سید الشہداء کی زیارت کے بارے کثرت سے روایات وارد ہیں .(۲) خصوصاً زیارت عاشورہ کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں (۳)

امام محمد باقر علیہ السلام نے یہ زیارت اپنے صحابی علقمہ بن محمد خضری کو تعلیم فرمائی. یہ زیارت چونکہ ایک نظریہ اختیار کرنے اور فکری خطوط پر مشتمل ہے لہذا عجیب اثرات رکھتی ہے، اگر اسے زیارتی متن کے طور پر پڑھا جائے تو اپنے مطالب اور فکری رہنمائی کی وجہ سے بڑی حساسیت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی طرف سے اپنے اصحاب کو زیارت کی اس طرح کی تعلیم نے اس عمل میں زیادہ تعمیری پہلو پیدا کر دیا، یہاں تک کہ معصومینؑ کی طرف سے بتلائے ہوئے زیارت نامے جیسے زیارت جامعہ کبیرہ، زیارت عاشورہ، زیارت آل یسین اور زیارت ناحیہ انتہائی اعلیٰ علمی خزانوں پر مشتمل ہیں، زیارت عاشورہ امام محمد باقر علیہ السلام نے تعلیم فرمائی زیارت عاشورہ انفرادی، اجتماعی، اور تعمیری اثرات، تشیع کے اعتقادی وفکری نظریات اور خط انحراف کی نشاندہی پر مشتمل

---

(۱) العبقری الحسان، ج۱ص۱۹۹

(۲) کامل الزیارات، ص۱۸۰

(۳) بحار، ج۱۰۱، ص۲۹۰، اقبال الاعمال ص۳۸، شیخ طوسی، مصباح المتهجد ص۵۳۸، ۵۴۲و

ہونے کی وجہ سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس زیارت کی بعض تعلیمات و خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱) اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ معنوی تعلق قائم کرنا اور ان کی محبت کو فروغ دینا، یہ محبت باعث بنتی ہے کہ زائر ان ہستیوں کو اپنا اسوہ و نمونہ عمل بنائے اور ان کے ساتھ فکری و عملی یک سوئی پیدا کرنے کی کوشش کرے، زیارت کے بعض جملوں میں اس طرح ہے کہ اس کی پوری زندگی اور اس کی موت ان جیسی ہو: اللھم اجعل محیای محیا محمد و آل محمد ومماتی مما ت محمد و آل محمد۔

چونکہ یہ محبت خداوند کی خاطر ہے اور اہل بیتؑ چونکہ الٰہی ہیں اور اس کی طرف منسوب ہیں خدا کے محبوب ہیں، لہٰذا یہ تقرب خدا کا ذریعہ قرار پاتے ہیں اس زیارت میں یوں آیا ہے: اللھم انی اتقرب الیک بالموالاۃ لنبیک وال نبیک خدا میں تیرا قرب چاہتا ہوں تیرے نبی اور آل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت ومحبت کے ذریعے۔

۲) زائر میں ظلم ستیزی کی روح کا پیدا ہونا

اس زیارت میں ظالموں سے نفرت اور ان پر لعنت کا تکرار ہے جس سے زائر کے اندر ظلم سے نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، زائر ظالموں سے نفرت و برائت کا اعلان کر کے اور حق و اہل بیتؑ کے پیروکاروں کی محبت و دوستی کا اظہار کر کے اپنے ایمان کے پائے مضبوط کرتا ہے، کیونکہ ایمان تو صرف راہ خدا میں محبت اور دشمنی ہی کا نام ہےھل ایمان الا الحب والبغض، حقیقی مومن ظلم کے مقابل غیر جانبدار نہیں رہ سکتا، ظالم سے نفرت و بغض کا اظہار کرتا ہے اور مظلوم کی حمایت وہمراہی کا اعلان کرتا ہے۔

یاابعداللہ انی سلم لم سالمکم وحرب لمن حاربکم۔

۳) انحرافی خط سے دوری

اس زیارت میں ظلم وفساد کی جڑوں کی نشاندہی کی گئی ہے:

فلعن اللّٰہ امۃ اسست اساس الظلم والجور علیکم
اھل البیت والعن اللّٰہ امۃ دفعتکم عن مقامکم و
ازالتکم عن مراتبکم التی رتبکم اللّٰہ فیھا۔

عاشورہ کے دن جو ظلم ستم ہوا اس کی جڑیں تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ ظلم بھی اس ظلم کی کڑی ہے جس کی ابتداء خط خلافت کے انحراف سے ہوئی تھی۔

۴) راہ ھدایت کو اپنے لئے اسوہ ونمونہ عمل قرار دینا

اس زیارت میں ہے:

فاسئل اللّٰہ الذی اکرمنی بمعرفتکم و
معرفۃ اولیائکم ورزقنی البرائۃ من اعدائکم
ان یجعلنی معکم فی الدنیا والآخرۃ وان یثبت لی
عندکم قدم صدق فی الدنیا والآخرۃ۔

زائر نے جب حق کو پہچان لیا ظلم اور ظالم کی معرفت حاصل کر لی اور ان سے دوری اختیار کر لی تو اب اپنے آپ کو دنیا و آخرت کی سعادت کے راستے میں قرار دیتا ہے یعنی یہ ہدایت کے چراغ جو خدا نے روشن فرمائے ہیں انہیں اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیتا ہے اور ان کے ساتھ کو طلب کرتا ہے۔

۵) راہ خدا میں شہادت وایثار کا طلب کرنا

۶) اہل بیتؑ کے مکتب، ہدف اور طریقے کا احیاء

سوال ۴۷ : امام حسینؑ کے دشمنوں پر آپ کیوں لعنت بھیجتے ھیں، اس کا کیا فائدہ ھے۔ کیا یہ ایک منفی احساس نہیں جو عصر جدید کے انسان کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتا؟ آج کا دور تو ایسا ھے کہ ھر کسی کے ساتھ ھنس کر ملیں، آج صلح و آشتی کا دور ھے یہ لعنتیں کرنا اور دوسروں کو ناپسند کرنا وہ سخت رویہ ھے کہ جو ۱۴۰۰ سال پہلے جب امام حسینؑ کو شہید کیا گیا سے مربوط ھے، آج کل کا معاشرہ اور لوگ اس چیز کو پسند نہیں کرتے، پھر آپ کیوں صد بار لعنت کرتے ھیں؟

جواب : جیسے انسان کی فطرت وسرشت صرف اس کی معرفت سے تشکیل نہیں پائی، اُسی طرح نہ تنہا اس کے مثبت جذبات واحساسات سے تشکیل پائی ہے، انسان وہ موجود ہے جس کی ذات میں مثبت ومنفی دونوں قسم کے احساسات و جذبات پائے جاتے ہیں، ہمارے وجود میں جس طرح خوشی پائی جاتی ہے اسی طرح غم بھی پایا جاتا ہے، خدانے ہمیں اس طرح خلق کیا ہے کہ کوئی انسان بھی بغیر خوشی یا بغیر غم کے زندہ نہیں رہ سکتا جیسے خداوند نے ہمیں ہنسنے کی صلاحیت دی ہے اسی طرح رونے کی صلاحیت بھی اس نے ہمیں بخشی ہے، ہنسنے کی جگہ پر ہنسنا چاہیے اسی طرح رونے کی جگہ پر رونا چاہیے. اگر اپنے ایک حصے کو چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خدا کے خلق کیے ہوئے ایک حصے کو استعمال نہیں کر رہے.

اس کی دلیل کہ خدانے ہمارے اندر رونا رکھا ہے یہ ہے کہ کچھ موقع پر گریہ کرنا ہوتا ہے خدانے ہمارے اندر یہ استعداد کیوں رکھی ہے جس کی وجہ سے انسان غم واندوہ پیدا کرتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رونا بھی انسان کی زندگی میں اپنی خاص جگہ رکھتا ہے.

خدا کی خاطر گریہ کرنا یعنی اس کے عذاب کے خوف کی وجہ سے، یا اس کی ملاقات

کے شوق کی وجہ سے رونا، انسان کے کمال میں موثر ہے، انسان اپنے مصیبت زدہ محبوب کے ساتھ دل سوزی کرتے ہوئے رقت پیدا کرتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے کہ انسان اس جیسی جگہوں پر رقت پیدا کرے اور اس کی وجہ سے گریہ کرے، خداوند نے ہمارے اندر محبت خلق کی ہے تاکہ جو ہماری خدمت کرتے یا جو لوگ کسی قسم کا عقلی، جسمانی، روحانی کمال رکھتے ہیں انسان کی نسبت ہم اظہار محبت کریں اور ان کو پسند کریں۔

جب انسان محسوس کرتا ہے کہ فلاں شخص صاحب کمال ہے یا فلاں جگہ کوئی کمال موجود ہے تو اس کی محبت انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابل انسان کے اندر بغض و دشمنی بھی رکھی گئی ہے، جیسے انسان کی فطرت یہ ہے کہ جس نے اس کا کوئی کام کیا ہو یا اس کے کام آیا ہو اس سے دوستی و محبت رکھے، اسی طرح انسان کی فطرت میں یہ بھی ہے کہ جس نے اسے تکلیف یا نقصان پہنچایا ہو اسے دشمن سمجھے اور اس سے نفرت کرے، البتہ مادی و دنیاوی ضرر مومن کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ خود دنیا اس کے لئے کوئی قدر و قیمت اور حیثیت نہیں رکھتی، لیکن جو دشمنی انسان سے ابدی سعادت اور دین چھین لے کیا اس سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟

قرآن فرماتا ہے:

ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا (۱)

''شیطان تمہارا دشمن ہے اور تم بھی اس سے دشمنی کرو''

شیطان کے ساتھ تو ہنسنا یا دوستی کرنا قابل قبول نہیں ہے ورنہ انسان بھی شیطان ہو جائے گا، اگر اولیائے خدا سے دوستی و محبت ضروری ہے تو دشمنان خدا سے دشمنی بھی ضروری ہے یہ انسانی فطرت ہے اور انسان کی سعادت و کمال کا عامل ہے، اگر خدا کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی نہ ہو تو رفتہ رفتہ انسان ان کا دوست بن جائے گا اور ان کے ساتھ کی وجہ سے

---

(۱) فاطر/ ٦

ان کا سلوک وطرز عمل اپنا لے گا، ان کی باتیں ماننے لگے گا آہستہ آہستہ انہی جیسا شیطان بن جائے گا۔

دوسرے لفظوں میں دشمنوں سے دشمنی کرنے سے انسان کے اندر خطرات اور نقصانات کے مقابل ایک دفاعی سسٹم پیدا ہو جاتا ہے، انسان کے بدن میں جیسے ایک جاذبہ کا نظام موجود ہے جو مفید چیزوں کو جذب کرتا ہے اسی طرح ایک دفاعی سسٹم بھی موجود ہے جو زہریلے مادوں اور میکروبوں کو دور کرتا ہے، یہ سسٹم میکروب کے ساتھ مبارزہ کرتا ہے اور انہیں مار دیتا ہے. خون کے سفید خلیوں کا یہی کام ہے، اگر بدن کا دفاعی نظام کمزور ہو تو میکروب بڑھنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے انسان پر بیماریوں کا حملہ شروع ہو جاتا ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اس سے کیا ہو جاتا ہے کہ ایک میکروب ہمارے بدن میں داخل ہو جائے، اسے نکالنے کے بجائے خوش آمدید کہیں وہ مہمان ہے اس کا احترام کریں، اس صورت میں آپ کا بدن تو صحیح وسالم نہیں رہ سکے گا، میکروب کا مارنا ضروری ہے یہی سنت الٰہی ہے یہ حکمت الٰہی ہے کہ خداوند نے ہر زندہ موجود کے لئے دو سسٹم قرار دیئے ہیں ایک سسٹم جذب کے لئے اور دوسرا سسٹم دفع کے لئے، جیسے موجودہ زندہ کے لئے مفید مواد کا جذب ضروری ہے اسی طرح بدن سے زہریلے مادوں اور میکروبوں کا دفع کرنا بھی ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکے گا۔

زندہ موجودات میں ایک قوت ہے جو قوہ دافعہ کہلاتی ہے، خصوصاً حیوانات اور انسان میں اس کا کام بہت اہم ہے۔

اسی طرح روح انسان میں ضروری ہے کہ ایسی استعداد موجود ہو، ایک روحانی جاذبہ کا عامل ہو تا کہ جو ہمارے لئے مفید ہیں ان سے ہم خوش ہوں اور وہ ہمیں اچھے لگیں ان کے نزدیک ہو کر ان سے علم، کمال، ادب اور معرفت حاصل کریں، انسان کیوں بعض لوگوں اور کاموں کو پسند کرتا ہے؟ اس لئے کہ جب ان کے نزدیک ہوتا ہے تو ان سے

فائدہ اٹھاتا ہے، جو اچھے لوگ منشاء کمال ہیں اور معاشرے کے لئے مفید ہیں ان سے محبت کا اظہار کرنا چاہیے.

اس کے مقابل جو لوگ معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہیں ان سے اظہار دشمنی کرنا چاہیے، قرآن فرماتا ہے:

قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابرا هیم والذین معه
اذ قالو لقومهم انا برناء منکم ومما تعبد و ن من
دون الله کفرنا بکم وبدا بیننا و بینکم العداوة والبغضاء
ابدا حتیٰ تو منو با لله وحده .(۱)

”تم ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی پیروی کرو اس بات میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کہی کہ ہم تم سے اور تمہارے غیر از خدا معبودوں سے اظہار برأت کرتے ہیں، ہم تمہیں نہیں مانتے، ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی و بغض برقرار ہے یہاں تک کہ تم خداوند وحدہ، پر ایمان لے آؤ“

حضرت ابراہیمؑ کو اسلام میں بہت عظیم مرتبہ ملا ہے، رسولؐ خدا نے فرمایا کہ میں بھی ابراہیمؑ کی اتباع کرنے والا ہوں. اسلام کا نام بھی حضرت ابراہیم نے ہماری شریعت کو دیا

”ھو سما کم المسلمین من قبل“(۲)

صرف خدا کے دوستوں کی دوستی کافی نہیں ہے، اگر اس کے دشمنوں کی دشمنی نہ ہو تو پھر اس کے دوستوں کی دوستی بھی ختم ہو جائے گی، اگر بدن کا دفاعی نظام نہ ہو تو جذب والا نظام بھی فیل ہو جائے گا، ہمارے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جذب اور دفع کی الگ الگ جگہ کی پہچان کرلیں.

(۱) سورہ ممتحنة / ۴

(۲) حج / ۷۸

بعض جگہ الٹ ہو جاتا ہے جسے جذب کرنا تھا اسے دور کر دیتے ہیں، ایک شخص سے کوئی غلطی ہو جائے جس پر وہ پشیمان بھی ہو تو اس سے دشمنی نہیں کرنا چاہیے جو گناہ کا ارتکاب کرلے اسے معاشرہ سے نہیں نکال دینا چاہیے بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کریں وہ بیمار ہے اسے علاج معالجے کی ضرورت ہے دیکھ بھال کی ضرورت ہے. یہ اظہار دشمنی کا موقع نہیں ہے، ہاں اگر کوئی جان بوجھ کر اور علی الاعلان گناہ کرے اور اسے معاشرہ میں پھیلانا چاہے تو یہ بڑا جرم ہے ایسے شخص سے دشمنی کرنی چاہیے. ہم امام حسینؑ کی برکتوں سے تب تک استفادہ نہیں کرسکتے جب تک ان کے دشمنوں پر لعنت نہ کرلیں اس کے بعد ان پر سلام کریں، قرآن نے بھی پہلے "اشداء علی الکفار "(۱) کہا اس کے بعد" رحماء بینھم" کہا(۲)

پس معلوم ہو گیا کہ سلام کے ساتھ لعنت ضروری ہے، ولایت کے ساتھ دشمنوں سے اظہار دشمنی ضروری ہے.

گریہ وعزاداری

سوال ۴۸ : شیعی ثقافت میں گریہ کا کیا مقام ھے کہ اتنا زیادہ اس پر زور دیا گیا ھے ؟

جواب : یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس کائنات کی بہت سی باتیں راز ہیں اور انسان ان سے واقف نہیں ہے، بعض کی توجہ صرف واقعات کے ظاہر پر ہوتی ہے اور ان کا فہم اسی ظاہر تک ہی محدود رہتا ہے انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس ظاہر کے پیچھے کوئی بہت بڑی حقیقت بھی پوشیدہ ہو سکتی ہے.

گریہ بھی انہی امور میں سے ہے، بہت سے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ رونا صرف ایک

---

(۱) فتح/۲۹

(۲) حوالہ سابق

ایسی کیفیت ہے جو انسان کے اندرونی درد کی ترجمانی کرتا ہے، بعض تو بچپنا اختیار کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے غیر ترقی یافتہ عمل قرار دیتے ہیں، بعض قائل ہیں کہ رونے کا سوائے سستی و کاہلی کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے، جب کہ آج کی دنیا تو خرم و متحرک دنیا ہے آج کا انسان تو خوشیوں کا طالب ہے نہ کہ آنسوؤں کا، ہم کوشش کریں گے کہ اس حقیقت کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیں تا کہ شیعہ کی نظر اس کے مقام کے بارے میں واضح ہو سکے.

الف) گریہ کی اقسام

گریہ کی مختلف اقسام ہیں جن میں سے چند اہم اقسام درج ذیل ہیں.(۱)

۱) خوف و ہراس کا گریہ

یہ قسم عموماً بچوں میں پائی جاتی ہے اور بچہ اس کے ذریعے اپنے ڈر کا اظہار کرتا ہے.

۲) جذبہ ترحم کو ابھارنے کے لئے گریہ

اس کی دو اقسام ہیں ایک قدرتی ہے جو کہ بہت موثر ہے جیسے اس بچے کا گریہ جس کے والدین دنیا سے اٹھ جائیں. دوسرا بناوٹی گریہ ہے یہ رونے کا اظہار کرتا ہے تا کہ دوسرے پر اپنے غمگین ہونے کا اظہار کر سکے.

۳) غم واندوہ کا گریہ

یہ اندر کے درد و ظلمت کو منعکس کرتا ہے، اس قسم کے گریہ کا مثبت پہلو صرف یہی ہے کہ اس سے اندر کا غبار نکل جاتا ہے اس وجہ سے انسان رونے کے بعد سکون محسوس کرتا ہے.

۴) تقویٰ و شوق کا گریہ

یہ رونا، بزرگ ہستیوں کا ہے جو سوز دروں، اپنے عجز و پشیمانی، پریشانی، توبہ اور

---

(۱) تفسیر و نقد و تحلیل مثنوی، ج۲ دفتر ۲ ص ۲۶۳_۲۷۲

معبود کے ساتھ عشق کے اظہار کے لئے ہوتا ہے یہ بہت پسندیدہ گریہ ہے اس سے روح کی صفائی ہوتی ہے اور قرب خدا کا سبب اور بنیاد بنتا ہے، اسی گریہ کی وجہ سے خداوند اپنے بندے پر توجہ فرماتا ہے اور اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

تا نگرید ابر، کی خندد چمن　　تا نگرید طفل، کی جوشد لبن

طفل یک روزه همی داند طریق　　که بگریم تا رسد دایهٔ شفیق

تو نمی دانی که دایهٔ دایگان　　کم دهد بی گریه شیر او رایگان

گفت: فلیبکوا کثیراً گوش دار　　تا بریزد شیر فضل کردگار. (۱)

"جب تک بادل گریہ نہ کرے شگوفے نہیں کھلتے، جب تک بچہ نہ روئے دودھ نہیں چھوٹتا، ایک دن کا بچہ بھی یہ طریقہ جانتا ہے کہ روؤں تا کہ پرورش کرنے والے شفیق ہستی آجائے، تم نہیں جانتے کہ پرورش کرنے والوں کا پرورش کنندہ بغیر گریہ کے دودھ کم دیتا ہے، اس نے فرمایا غور سے سنو زیادہ گریہ کرو، تا کہ فضل و رحمت خدا خوب برسے"

گریہ کے لئے کچھ عوامل و اسباب ذکر کیے گئے ہیں:

۵۔ا: گناہوں پر پشیمانی

بعض دفعہ الٰہی افراد اپنے گناہوں پر پشیمانی کی وجہ سے گریہ کرتے ہیں یہ عمل اپنے برے اعمال پر پشیمانی کا اظہار ہے اور اس سے انہیں چھوڑ دینے کے عزم میں پختگی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا:

"خوش قسمت ہے وہ شخص جو اپنے پروردگار کی اطاعت شروع کردے اور اپنے گناہوں پر گریہ کرے" (۲)

---

(۱)　مثنوی، ج ۳، دفتر ۵

(۲)　نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۷۶، ص ۱۸۵

ورنمی تانی بہ کعبۂ لطف پر — عرضہ کن بیچارگی بر چارہ گر
زاری و گریہ قوی سرمایہ ای است — رحمت کلی قوی تر دایہ ای است
دایہ و ما در بہانہ جو بود — تا کہ کی آن طفل او گریان شود
طفل حاجات شمارا آفرید — تا بنالید و شود شیرش پدید
گفت: ادعو اللہ بی زاری مباش — تا بجوشد شیرھای مہرھاش. (۱)

۲۔۵: خدا کی طرف لوٹ کرجانے کے بارے ابہام کا احساس

راہ خدا کے راہی ہمیشہ خطرہ محسوس کرتے رہتے ہیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں، کس طرح وہ منزل مقصود تک پہنچیں گے، کس حالت میں اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوں گے، کیا وہاں تک پہنچتے پہنچتے، شیطان اور نفس کی دھوکہ دہی اور گمراہی و چالبازی سے محفوظ رہ پائیں گے؟ خدا کی طرف لوٹنے کی اس حالت کے ابہام کی وجہ سے وہ گریہ کرتے ہیں، امام زین العابدینؑ کی مناجات کے کچھ حصے اس عامل کو بیان کرتے ہیں:

وما لی لا ابکی ولا ادری الی ما یکون مصیری
واری نفسی تخادعنی وایامی تخاتلنی وقدخفقت عند
رأسی اجنحۃ الموت فما لا ابکی، ابکی لخروج
نفسی، ابکی لظلمۃ قبری ابکی لضیق لحدی. (۲)

۳۔۵: شوق وعشق

خداوند کے حقیقی دوست ومحبّ چونکہ صرف خدا ہی کو محبوب سمجھتے ہیں کبھی تو اسکی ملاقات کے شوق میں گریہ کرتے ہیں اور کبھی اس کے ہجر وفراق سے گریہ کرتے ہیں ایسا گریہ فراق محبوب کا بھی ہے اور شوق دیدار کا بھی ہے۔

---

(۱) مثنوی، ج۱، دفتر۲

(۲) مفاتیح الجنان، دعائے ابوحمزہ ثمالی

زدو دیده خون فشا تم زغمت شب جدایی   چه کنم که هست اینها گل خیر آشنایی. (۱)

۵۔۴: خوف وخشیت

یہ خوف فہم ومعرفت پر مبنی ہے، جب الٰہی مرد وزن عظمت خدا کا احساس کر لیتے ہیں تو ان کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس خوف کی وجہ سے گریہ کرتے ہیں، امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

> ''ہر آنکھ قیامت کے دن روئے گی مگر وہ آنکھ جو خدا کے محرمات سے اجتناب کرتی رہی ہو یا وہ آنکھ جو اطاعت خدا میں رات کو بیدار رہی ہو یا وہ آنکھ جو آدھی راتوں کو خوف خدا سے گریہ کناں رہی ہو'' (۲)

۵۔۵ :حقیقی دوستوں کی موت

آیات وروایات کی رو سے محبوب الٰہی ہستیاں حقیقی محبوب شمار ہوتی ہیں، ان کی محبت خدا کی محبت شمار ہوتی ہے.(۳)

ایسے محبوب افراد جب اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تو ان کی خاطر اولیائے الٰہی گریہ کرتے ہیں، یہ گریہ اس ہجر کی وجہ سے ہے جو ان محبوب افراد کی وفات سے پیدا ہوا ہے.

این محبت از محبت ها جداست   حب محبوب خدا حب خدا است

ائمہ علیہم السلام کا ایک دوسرے پر گریہ، رسولؐ خدا کا حضرت حمزہ جیسی ہستی کے جدا ہونے پر گریہ، حضرت خدیجہ کی وفات پر گریہ، سب اسی عنوان سے تھا.(۴)

---

(۱) حافظ   (۲) اصول کافی، ج۲، کتاب الدعاء

(۳) دوست شناسی و دشمن شناسی در قرآن، فصل۳

(۴) السیرۃ الحلبیہ، ج۲، ص۲۲۷، بحار الانوار، ج۳۶، ص۳۴۹، ج۴۳، ص۲۳۸، ج۲۸، ص۳۷، ج۲۲، ص۲۸۴، ج۸۲، ص۱۰۴، ج۴۲، ص۲۸۳

۵۔۶: صفات کمال کے نہ ہونے پر گریہ

کبھی مردان الٰہی اس لئے گریہ کرتے ہیں کہ ان میں وہ صفات وکمالات نہیں ہیں جو ہونے چاہیے تھے، جب اپنے سے برتر انسانوں کو دیکھتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ ہم ان کمالات سے ابھی محروم ہیں، لہٰذا اس پر گریہ کرتے ہیں اور پھر ان کمالات کو پانے کے کرہمت باندھ لیتے ہیں۔

بہ کنج میکدہ گریان و سر فکندہ شدم   چرا کہ شرم ھمی آیدم ز حاصل خویش (۱)

امام زین العابدین علیہ السلام ایک مناجات میں اسی کو بیان فرماتے ہیں:

واعنی بالبکاء علی نفسی فقد افنیت بالتسویف والا مال عمری (۲)

ب) باارزش گریہ

اگرچہ گریہ کی دوسری اقسام سے روکا نہیں گیا لیکن وہ جس پر قرآن اور روایات میں زور دیا گیا ہے وہ تقویٰ وروحانی گریہ ہے، یہی گریہ اس طرف سے سوز دل ہے اور اس طرف سے سکون، راحت، لذت وخوشی ہے (۳) اس طرف سے غم دل ہے اور اُس طرف سے خوشی وشراب طہور اور لذات شہود ہے (۴)۔

شاد از غم شو کہ غم دام لقاست   اندر این رہ سوی پستی ارتقاست

غم بکی گنجست ورنج تو ھو کان   لیک کی در گیرد این در کودکان (۵)

"غم سے خوش ہو جاؤ کہ غم ملاقات کا دام ہے، اس راہ میں پستی ہے بلندی بھی، غم ایک دفینہ ہے اور رنج ایک کان کی مانند، لیکن بچوں میں یہ کیسے ہو سکتا ہے"

روحانی گریہ اس طرف سے تو صرف گریہ ہے لیکن دوسری طرف حضرت حق سے

---

(۱) حافظ شیرازی

(۲) دعائے ابوحمزہ ثمالی

(۳) اصول کافی، ج۲، کتاب الدعاء

(۴) بحار الانوار، ج۷۳، ص۱۵۷   (۵) مثنوی، ج۲، دفتر۳

نزدیکی ہے۔(۱)

حافظ شاید اگر در طلب گوہر وصل

دیدہ دریا کنم از اشک و در او غوطہ خورم

''حافظ اگر وصال کا گوہر ڈھونڈنے میں اپنی آنکھوں سے

اشکوں کے دریا بہا کر اس میں غوطے لگاؤں''

قرآن کریم اور روایات کی روشنی میں اس گریہ کی درج ذیل خصوصیات ہیں:

پہلا : اس گریہ کا منشاء فہم وشعور ہے، یہ گریہ اپنے تمام عوامل کے ساتھ فہم وشعور سے پھوٹتا ہے نہ کہ تقلید وگمان کی بناء پر جاری ہوتا ہے۔

گریہ بر جہل و بر تقلید و ظن نیست ہمچون گریہ آن مؤتمن

تو قیاس گریہ بر گریہ مساز ہست زین گریہ بدان راہ دراز.(۲)

قرآن فرماتا ہے:

''اے رسول! امت سے کہہ دو کہ اس کتاب پر ایمان لے آؤ یا نہ لاؤ تحقیق جو لوگ اس سے پہلے علم ودانش کے مقام کو پاچکے ہیں جب ان پر آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ کمال خضوع و فروتنی کے ساتھ ان کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا خداوند پاک ومنزہ ہے، یقیناً ہمارے خدا کا وعدہ پورا ہوگا وہ گریہ کرتے ہیں خاک پر گر جاتے ہیں اور ان کے دل میں خوف خدا کا مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے''(۳)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی اعلیٰ معرفت، علم اور فہم رکھتا ہو وہ آیات

---

(۱) اصول کافی

(۲) مثنوی، ج۳، دفتر۵

(۳) سورہ اسراء/۱۰۷،۱۰۹

خدا سے کر حقیقت کو پالیتا ہے اور پھر حضور خدا میں چہرہ خاک پر رکھ دیتا ہے اور سوز دل سے اشک شوق جاری کرتا ہے اس امید کے ساتھ کہ اس کے آنسوؤں پر نظر کرم ہو اور ان پر نظر عنایت ہو، لہٰذا جو نہیں سمجھتا نہ اس کے دل میں سوز ہوتا ہے اور نہ آنکھ میں آنسو.

آب در جو زان نمی گیرد قرار   زانکہ آن جو نیست تشنہ و آب خوار. (۱)

''پانی ندی میں اس لئے نہیں ٹھہرتا چونکہ ندی پیاسی نہیں ہے اور پانی خوار''

مثلاً ایک آدمی حقیقت گناہ کو نہیں سمجھتا ہے، اسے نہیں معلوم کہ گناہ انسان کی روح پر کیا اثر بد ڈالتا ہے، وہ شخص آرام سے گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے یہی گناہ قساوت قلبی کا موجب بن جاتے ہیں وہ شخص سوز دل رکھتا ہی نہیں کہ وہ گریہ کرے اور آنسو جاری کرے، اسی وجہ سے روایت میں آیا ہے کہ آنکھوں کی خشکی قساوت قلبی کی علامت ہے (۲) اور قساوت قلبی صرف گناہوں کی کثرت سے پیدا ہوتی ہے (۳) اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس بدبختی کی جڑیں بھی جہالت وکم علمی میں پائی جاتی ہیں.

تا ندانند خویش را مجرم عنید   آب از چشمش کجا داند دوید، (۴)

گریہ جہاد اکبر کا اسلحہ ہے، اندرونی دشمن کے ساتھ جنگ کے لئے اسلحہ یہی گریہ اور آہ وفغاں ہے. جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے دعا کمیل میں فرمایا ہے "وسلاحہ البکاء" خداوند نے یہ موثر ہتھیار سب کو دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم اس کی قدر ومنزلت نہیں جانتے.

تیسرا: گریہ خدا کا انعام و فضل ہے

خداوند فرماتا ہے کہ:

---

(۱) مثنوی، ج۱، دفتر ۲

(۲) میزان الحکمۃ، ج۱، ص ۴۵۵، روایت ۱۸۲۵

(۳) حوالہ سابق، حدیث ۱۸۲۶

(۴) مثنوی، ج۳، دفتر ۵

''جو انبیاء میں سے تھے خدا نے ان پر انعام کیا یعنی آدم تھے اور ان
میں سے جنھیں ہم نے کشتی نوح پر سوار کیا، اولاد ابراہیم واسرائیل
میں سے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت کی اور انہیں منتخب کیا
جب بھی رحمان کی آیات ان پر تلاوت کی جاتی تھیں وہ گریہ کرتے
ہوئے سجدہ میں گر جاتے.(۱)

خداوند نے اس آیت میں گریہ کو انبیاء الٰہی کی مشخص خصوصیات میں سے قرار دیا ہے:

سوز دل اشک روان، آه سحر ، این همه از نظر لطف شما فی بینم (۲)

چوتھا: گریہ عبد کے الٰہی ہونے کی علامت ہے

خداوند فرماتا ہے: ''جب وہ رسول پر نازل کی جانے والی آیات سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس کی حقیقت کو پہچان لیا ہے جو کچھ رسول پر نازل ہوا ہے، خدایا ہم تیرے رسول (محمدؐ) پر اور قرآن پر ایمان لے آئے ہیں اور ہمیں اس کے صدق کے گواہوں میں سے قرار دے'' (۳)

پانچواں: اس کا باطن خوشی و سرور ہے

با ارزش گریہ اسرار الٰہی میں سے ہے کہ جس کے اس طرف تو سوز و آتش ہے لیکن اُس طرف خوشی ولذت اور ملاقات محبوب ہے.(۴)

آتشی را شکل آبی داده اند ، و اندر آتش چشمه ای بگشاده اند (۵)

''اس طرف غم ہے، دل کی پریشانی ہے، آنکھوں سے آنسو ہیں

---

(۱) مریم/۵۸

(۲) حافظ شیرازی

(۳) مائدہ /۸۳

(۴) مقالات، ج۳،ص۳۷۹

(۵) مثنوی، ج۳، دفتر۵

اور اُس طرف دل کی خوشی‘‘

غبار غم برود حال به شود حافظ   تو آب دیده ازین رہگذر دریغ مدار

ج) با ارزش گریہ روایات میں

خوف خدا میں روح کی گہرائیوں کے ساتھ ہونے والا گریہ ہی قدر و قیمت اور اہمیت رکھتا ہے اس کا مقام روایات میں یوں بیان ہوا۔

۱) امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’بندے کی خدا کے نزدیک ترین حالت اس کی سجدہ میں گریہ کی حالت ہے‘‘(۱)

۲) امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

’’کوئی قطرہ خدا کو اس قطرۂ اشک سے زیادہ پسند نہیں ہے جو رات کی تاریکی میں خوف خدا سے گرایا جاتا ہے‘‘(۲)

۳) واعوذبک من قلب الایخشع ومن عین لا تدمع

’’میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور
اس آنکھ سے جس میں آنسو نہ ہو‘‘(۳)

۴) واعنی بالبکاء علی نفسی ’’خدایا مجھے میرے حال پر گریہ کی مدد فرما‘‘(۴)

۵) امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: ’’اگر رونے کے لئے آنکھ سے آنسو نہ نکلیں تو غم و حزن کی شکل بناؤ‘‘(۵)

چونالان آیدت روان پیش   مدد بخشش زآب دیدهٔ خویش

---

(۱) اصول کافی

(۲) حوالہ سابق

(۳) مفاتیح الجنان، دعائے بعد از زیارت امیر المومنینؑ

(۴) دعائے ابوحمزہ ثمالی

(۵) مرآۃ العقول، ج۱۲، ص۵۶

سوال ۴۹: بالخصوص امام حسینؑ پر گریہ کے بارے میں روایات بیان کریں اور امام حسینؑ پر گریہ کا فلسفہ بھی بیان کریں؟

جواب : امام حسین علیہ السلام پر گریہ کے بارے بعض روایات درج ذیل ہیں.

۱) معصومؑ نے فرمایا:

''ہر آنکھ قیامت کے دن روئے گی مگر وہ آنکھ جو امام حسینؑ پر روئی ہو یہ آنکھ خوش و شاد ہو گی'' (۱)

۲) امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

''امام حسین علیہ السلام پر گریہ کبیرہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے'' (۲)

۳) امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

''جو شخص امام حسین علیہ السلام کی یاد میں مکھی کے پر برابر آنکھوں سے آنسو نکالتا ہے اس کا ثواب خداوند پر ہے اور خداوند جنت سے کم تر ثواب پر راضی نہیں ہوگا'' (۳)

۴) امام معصومؑ نے فرمایا:

''جو شخص امام حسینؑ کے مصائب پر روئے یا رلائے یا غم و حزن کی حالت بنالے، خداوند اس پر جنت واجب کر دیتا ہے'' (۴)

۵) امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

''اے شبیب کے بیٹے! اگر رونا چاہتے ہو تو حسینؑ بن علیؑ پر روؤ کہ انہیں اس طرح ذبح کیا گیا جیسے گوسفند کو ذبح کیا جاتا ہے، اے شبیب کے بیٹے اگر حسینؑ بن علیؑ پر اس طرح گریہ کرو گے

---

(۱) الخصائص الحسینیہ، ص۱۳۰

(۲) مسند امام رضاؑ، ج۲، ص۲۷

(۳) بحار الانوار، ج۴۴، ص۲۹۱،

(۴) الخصائص الحسینیہ، ص۱۳۲

کہ تمہارے آنسو تمہارے رخساروں پر جاری ہو جائیں تو خداوند تمہارے چھوٹے بڑے سب گناہ بخش دے گا خواہ تھوڑے ہوں یا زیادہ"(۱)

امام حسین علیہ السلام پر گریہ کے فلسفہ کے طور پر کچھ مطالب ذکر کیے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حرف آخر نہیں ہیں جیسے:

الف) گریہ خود اچھی چیز ہے اور روح کو دھوڈالتا ہے، کہ یہ روح کی صفائی مجالس عزا میں زیادہ مفید ہوتی ہے۔

ب) امام حسینؑ پر گریہ ان کے شکریئے کے عنوان سے ہے، لیکن یہ مطلب صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر ہمارے اوپر امام حسین علیہ السلام کا شکریہ ضروری ہوتا کیا شکریہ کا رونے دھونے کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں تھا، جب کہ اصولاً سوال یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کو شکریئے کی کیا ضرورت ہے؟

ج) امام حسین علیہ السلام کو ہمارے گریہ سے فائدہ ہوتا ہے، ہم گریہ کے ساتھ معنوی فیض کو پاتے ہیں نہ کہ ہم اس گریہ سے امام حسینؑ کے مقام میں اضافہ کرتے ہیں۔

د) ثواب و شفاعت کو پانا

ان حکمتوں میں سے بعض کو اگرچہ روایات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان سے بڑھ کر حکمتیں بھی گریہ کے لئے مدنظر قرار دی جاسکتی ہیں، لہٰذا ان چند چیزوں میں حکمت گریہ کو منحصر کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام حسینؑ کے گریہ کی حکمت دو بہت بنیادی چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنا خاص طبعی اثر رکھتی ہے۔

پہلا) اخلاقی پہلو

پہلا یہ کہ: جیسا کہ بیان ہو چکا شیعہ ثقافت میں وہ گریہ با ارزش ہے جو روح کی

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۴،ص۲۸۵

ترقی وعظمت کا باعث ہو.

اور دوسرا یہ کہ: اس گریہ کا سرچشمہ معرفت ہے، امام حسینؑ پر گریہ یا اس خاطر ہے کہ خداوند کے اس حقیقی عاشق کے شہید ہو جانے کا غم وحزن یاد آتا ہے، وہ جو اوصاف الٰہی کا مرکز تجلی تھا اور مومن پھول کی خوشبو اس گلاب سے سونگھتے تھے.

چون کہ گل رفت و گلستان شد خراب   بوی گل را از کہ بویم، از گلاب

یا اس لئے گریہ کرتے ہیں کہ ہم ان فضائل وکمالات سے محروم ہیں جو آپ میں اور آپ کے اصحاب باوفا میں پائے جاتے تھے، حبیب پر گریہ، اس بات پر گریہ ہے کہ وہ کیا مقام رکھتے تھے اور ہم کیسے ہیں، علی اکبرؑ پر گریہ اس بات پر ہے کہ وہ جوان رعنا کیا فضائل رکھتا تھا اور میں ان میں سے کون سی صفت رکھتا ہوں.

اگر ہمارا گریہ اس جہت میں نہ ہو تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے گریہ کو اس جہت میں قرار دیں تا کہ اس کے ذریعے سے ہماری روح میں بھی ترقی ہو، یہ گریہ درحقیقت ایک درد کا اظہار ہے جو انسان کو اس درجے پر پہنچنے کے لئے متحرک کرتا ہے، ایسا آنسو انسان ساز ہے.

دوسرا) اجتماعی پہلو

اگر امام حسینؑ پر گریہ معرفت سے ہو اور اس کا منشاء بھی اس نہضت کا اخلاقی پہلو ہو تو یہ غم واندوہ انسان کے اندر تبدیلی کا باعث بننے کے بعد اجتماعی تبدیلیوں کا ماحول فراہم کرتا ہے.

جب امام حسینؑ پر گریہ باعث بنے گا کہ انسان اپنے فردی واجتماعی فضائل میں غور وفکر کرے تو لازما یہ اندرونی تبدیلی باعث بنے گی کہ ایسا معاشرہ تشکیل پائے جس میں اسلام کے بلند اہداف ومقاصد پورے ہو سکیں.

جب انسان متوجہ ہو جائے کہ امام حسین علیہ السلام نے کس لئے اور کیسے قیام کیا اور

آپؑ نے خون کے قلم کے ساتھ صفحہ تاریخ پر وہ جاودانی اثرات چھوڑے اور اس معرفت کے گریہ سے اس کے اندر تبدیلی واقع ہوجائے تو یہ تبدیلی معاشرہ کے اندر تک بھی آپہنچے گی وہ کوشش کرے گا کہ دین میں فساد وانحراف کو روکے اور جوانمردی ودینداری کو نہ صرف اپنے اندر زندہ کرے بلکہ معاشرے میں ان کو لاگو بھی کرے۔

دوسرے لفظوں میں درحقیقت امام حسینؑ پر گریہ بالواسطہ آپ کے ارمانوں کی حفاظت اور انہیں معاشرہ پر حاکم کرنے کا مقدمہ فراہم کرتا ہے اسی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ امام حسینؑ پر گریہ کی ایک حکمت معاشرہ کو انہی خطوط پر تعمیر کرنا ہے جو آپ نے خود تعین فرمائے تھے، شاید اس جملہ ﴿ان الاسلام بدوہ محمدی وبقائہ حسینی﴾ . (اسلام کی ابتداء محمدی ہے اور بقاء حسینی ہے) سے مراد یہی ہو کہ مکتب اسلام کی بقاء خصوصاً تشیع کی بقاء امام حسینؑ پر گریہ کی مرہون منت ہے۔

سوال ۵۰ : کیا کروں کہ مجلس میں دل شکستہ ہو جاؤں اور آنسو نکل آئیں؟

جواب: ایک تو یہ کہ مجلس عزا میں غم واندوہ کی شکل بنالینا بھی کم اہم نہیں ہے، جیسا کہ روایات میں اس بارے صراحت بیان ہوئی ہے۔(۱)

دوسرا یہ کہ: با ارزش گریہ کا منشاء معرفت ہے، لہٰذا اگر محسوس کریں کہ مجلس عزا میں گریہ طاری نہیں ہورہا اور آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہورہے حتیٰ کہ دل غمگین بھی نہیں ہورہا تو اس صورت میں اہل بیتؑ کے بارے اپنی معرفت کو وسیع کریں اور معرفت کے حصول میں جو کوتاہیاں ہیں انہیں دور کریں۔

معرفت اہل بیتؑ کو وسعت دینے کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱) ان کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں،

۲) ان کے فرمودات وارشادات کا مطالعہ اور ان میں غور وفکر،

---

(۱) خصائص الحسینیہ، ص۱۳۲، وسائل الشیعہ، ج۳، ص۱۱۳۱، ۱۱۳۲

۳) خداوند متعال کی معرفت وشناخت کہ وہ ہستیاں اوصاف خدا کی تجلی ومظہر ہیں، خداوند کے اوصاف کو پہچان کران کے فضائل ومناقب کاادراک کیا جاسکتا ہے.(۱)

معرفت میں رکاوٹیں

یہ زیادہ تر ہمارے اعمال سے مربوط ہیں جو کہ قساوت قلب کا باعث بنتے ہیں.(۲) جس کی وجہ سے ہمارے جذبات واحساسات ہماری عقل کے کنٹرول میں نہیں رہتے، یہ رکاوٹیں درج ذیل ہیں:

۱ ذکر خدا کے علاوہ زیادہ باتیں کرنا،(۳)
۲ زیادہ گناہ،(۴)
۳ لمبی چوڑی آرزوئیں،(۵)
۴ لہوولعب کو سننا،(۶)
۵ مال دنیا جمع کرنا،(۷)
۶ عبادات کو چھوڑنا،(۸)
۷ ظالم وگمراہ لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا،(۹)
۸ پست وذلیل افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا،(۱۰)
۹ زیادہ ہنسنا،(۱۱)

روایات میں قساوت قلب کو ختم کرنے کے کچھ اسباب ذکر ہوئے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

---

(۱) آئین مہرورزی،محبت اہل بیتؑ
(۲) میزان الحکمۃ،ج۱،ص۳۵۵،حدیث۱۷۳۵
(۳) بحار الانوار،ج۷۱،ص۲۸۱
(۴) حوالہ سابق،ج۷۰،ص۵۵
(۵) حوالہ سابق،ج۷۸،ص۸۳
(۶) حوالہ سابق،ج۷۵،ص۳۷۰
(۷) مستدرک الوسائل،ج۲،ص۳۳۱
(۸) تنبیہ الخواطر،ص۳۶۰
(۹) بحار الانوار،ج۱،ص۲۰۳
(۱۰-۱۱) حوالہ سابق،ج۷۷،ص۴۵

۱ موت کی یاد،(۱) ۲ وعظ و نصیحت،(۲)

۳ آیات الٰہی، قیامت اور اپنی حالت کے بارے میں غور و فکر کرنا،(۳)

۴ علماء کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا،(۴)

۵ علمی گفتگو،(۵) ۶ تنگ دستوں کو کھانا کھلانا،(۶)

۷ یتیموں پر رحم،(۷) ۸ ذکر خدا،(۸)

۹ ذکر فضائل اہل بیتؑ،(۹) ۱۰ قرأت قرآن،(۱۰)

۱۱ استغفار،(۱۱)

ان سب چیزوں سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ خداوند کے حضور گڑگڑا کر دعا کریں کہ ہمیں رونے والی آنکھ عطا کرے اور اہل بیتؑ کا واسطہ دیں اور ان ہستیوں سے بھی مدد مانگیں۔

چو زتنهائی تو نومیدی شوی زیر سایه یار خورشیدی شوی

روز بجو یار خدائی را تو زور چون چنان کردی خدا یار تو بود

---

(۱) بحار الانوار، ج۱۴، ص۳۰۹

(۲) حوالہ سابق، ج۷۷، ص۱۹۹

(۳) حوالہ سابق، ج۷۸، ۱۱۵

(۴) حوالہ سابق، ص۳۰۸

(۵) معجم الفاظ، غرر الحکم، ص۸۶۳

(۶) بحار الانوار، ج۱، ص۲۰۳

(۷) مشکاۃ الانوار، ص۱۰۷

(۸) حوالہ سابق

(۹) نہج البلاغہ، خ۲۲۲

(۱۰) حوالہ سابق

(۱۱) نہج البلاغہ، خ۱۷۶

سوال ۵۱: جو لوگ گناہ گار ہیں، کیاان کے لئے صرف سیدالشہداء پر گریہ کر لینا مفید ہو سکتا ہے؟

جواب: شفاعت کی حقیقت کو سامنے رکھنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوگا بعض روایات میں ایسے موارد ذکر ہوئے ہیں جو انسان کو گناہوں سے پاک کر دیتے ہیں. روایات کی بنیاد پر اس شفاعت کہ جس کا ایک مصداق اہل بیت بالخصوص امام حسینؑ پر گریہ بھی ہے جو کہ گناہ گار و غیر گناہ گار سب کے شامل حال ہو جاتی ہے کا راز یہ بھی کہ انسان اور اہل بیتؑ کے درمیان ایک خاص ربط کا برقرار ہونا ہے، یعنی جو شخص کسی شخص کے ساتھ دنیا میں روحانی رابطہ رکھتا تھا، دونوں ہمراہ، ہم فکر، ہم عقیدہ و ہم سلیقہ تھے، ایک دوسرے کی معرفت و پہچان رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مودت رکھتے تھے، تکوینی طور پر ان دونوں کے درمیان ایک رابطہ برقرار ہوتا ہے۔

بنابریں جو شخص بھی معصومینؑ کا معتقد ہو، ان کا مطیع و فرمانبردار ہو، حتی الوسع ان کے فرامین پر عمل کرے، اس کی سوچ ان جیسی ہو اور اعتقاد ان جیسا ہو اور اس بنیاد پر ان کی محبت و معرفت رکھتا ہو، ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے اور معصومینؑ کے درمیان ایک باطنی و اندرونی رابطہ عالم ارواح میں برقرار تھا، اس کی مشابہت معصومینؑ کے ساتھ جتنی زیادہ ہوگی اس کا یہ رابطہ بھی اتنا ہی قوی ہوگا، انسان جتنا ناقص ہوگا رابطہ اتنا ہی کمزور ہو گا، جب یہ تکوینی و واقعی رابطہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اور معصومینؑ کے درمیان ایک قسم کی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، اس وحدت کا نتیجہ قیامت کے دن اس طرح سامنے آئے گا کہ یہ شخص جو گناہ گار ہے یا غیر خدا کے ساتھ وابستگی رکھتا ہے معصومینؑ اسے اس تکوینی وحدت وارتباط کی وجہ سے اپنے خاص جاذبہ کے ساتھ اوپر کھینچ لیں گے اور اسے جنت تک پہنچنے اور عذاب و تکالیف سے چھٹکارا پانے میں مدد کریں گے.

راز و سر شفاعت کو جان لینے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے، کہ آدمی کے اندر

لیاقت، آمادگی اور خدا کی طرف جانے کی کشش ہونی چاہیے تاکہ شفاعت کے ساتھ مل جانے سے اس گناہ اور تعلق سے چھٹکارا پاسکے اور یہ آمادگی صرف اس سے حاصل ہوتی ہے کہ ارواح معصومینؑ کے ساتھ انسان کو شباہت و سنخیت ہو، یعنی یہ شفاعت صرف ان افراد کو حاصل ہوگی جو مومن ہوں اور عمل صالح کرتے ہوں، وہ کسی حد تک خدا و معصومینؑ کے مطیع ہوں اور زیادہ گناہ گار و سرکش نہ ہو۔(۱)

پس معلوم ہوگیا کہ ہر کسی کو یہ شفاعت نصیب نہیں ہوگی اور نہ ہر کوئی صرف امام حسینؑ پر گریہ کرنے سے جنت چلا جائے گا اور اس کے سب گناہ بخش دیئے جائیں گے، یعنی یوں نہیں ہے کہ وہ ہر گناہ کرتا ہے اور وہ صرف گریہ کرنے سے ہر گناہ کے اثر بد سے آزاد ہو جائے گا، اسے نہ کوئی ڈر ہوگا، نہ عذاب، جب کہ حقیقت محبت انسان کو گناہ اور دلبستگی غیر سے کسی حد تک روک دیتی ہے، پس اس شفاعت کے لئے کچھ شرائط ہیں اور وہ حضرت حق عزوجل کا انسان سے راضی ہونا ہے اور انسان کا ایمان و عمل صالح ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو جو خط لکھا اس میں یہی نکتہ ارشاد فرمایا:

> ''جان لو! حقیقت یہ ہے کہ خدا کی کوئی مخلوق کسی کو خداوند سے بے نیاز نہیں کرسکتی، نہ ملک مقرب، نہ نبی مرسل، نہ کوئی اور، پس جو بھی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت پر خوش ہے کہ اسے یہ شفاعت فائدہ دے گی، اسے خدا سے دعا کرنا ہوگی کہ خدا اس سے راضی ہو جائے'' (۲)

پس گناہ و تعلقات اس حد تک ہوں کہ خدا اس سے ناراض نہ ہو جائے کیونکہ اگر خدا انسان سے خوش نہ ہو تو پھر یہ شفاعت بھی اس کے شامل حال نہیں ہوگی، اگر انسان پوری تسلی کے ساتھ گناہ کرے اس پر پشیمان بھی نہ ہو، نہ آہ و نالہ کرے، حتیٰ کہ یہ سوچ بھی اس

(۱) تجسم عمل و شفاعت، ص۱۰۶۔۱۱۶

(۲) بحار، ج۸، ص۵۳

میں پیدا نہ ہو کہ کیوں میں گناہوں سے چھٹکارا نہیں پا رہا، صرف امام حسین علیہ السلام کی مجالس میں آنسو بہا لے تو یہ وہ مورد ہے کہ خداوند اس سے خوش نہیں ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا، کہ امام حسین علیہ السلام کی شفاعت بھی اس کے شامل حال نہیں ہوگی. اگر کوئی گناہ کر لیتا ہے لیکن نادم و پشیمان ہو، آہ و نالہ کرتا ہے، گناہ سے چھٹکارا کے بارے فکر مند ہے، کوشش کرتا ہے، عقیدہ عمل میں ان جیسا بننا چاہتا ہے، ایسا شخص چونکہ دل میں گناہ سے نفرت رکھتا ہے اور امام حسینؑ کے ساتھ ایک قسم کی وحدت رکھتا ہے، اس شخص کے گناہوں کے دھونے میں اس کے آنسو مفید واقع ہو سکتے ہیں.

بہر حال اگر امام حسینؑ کی شفاعت چاہتے ہیں تو ان کی محبت کے ساتھ ساتھ عقائد، افکار، اعمال، صفات اور اخلاق میں ان کی موافقت کرنا ہوگی اور سب سے بڑھ کر خداوند جو کہ اصلی و حقیقی شفیع ہے، اس سے راضی ہونے کی دعا کریں، اس کی خوشنودی سے شفاعت امام حسین علیہ السلام بھی مل جائے گی.

ای خدا! آن کن کہ از تو می سزد — کہ زہر سوراخ مارم می گزد
جان سنگین دارم و دل آہنین — ورنہ خون گشتی در این رنج و حنین
وقت تنگ آمد مرا و یک نفس — پادشاہی کن مرا فریاد رس
گر مرا این بار ستاری کنی — توبہ کردم من ز ہر نا کردنی
توبہ ام بپذیر این دگر — تا ببندم بہر توبہ صد کمر
من اگر این بار تقصیری کنم — پس دگر مشنو دعا و گفتنم. (۱)

"اے خدا تو وہ کر جو تیرے شایان شان ہے، کہ ہر سوراخ سے مجھے سانپ ڈس رہا ہے، جان سنگین کر رہی ہے اور دل لوہے کی طرح سخت، ورنہ اس رنج و محن میں خون ہو جاتا، اب وقت کم ہے چند ہی سانسیں ہیں، تو ہی مہربانی کر میری فریادرسی فرما، اس بار میری

---

(۱) مثنوی، دفتر ۵، ابیات، ۲۲۶۷_۲۲۶۲

تقصیریں چھپالے، میں ہر نا کردہ گناہ سے بھی توبہ کرتا ہوں، ایک بار
پھر میری توبہ قبول کرلے، تاکہ میں سو بار توبہ کی کمر ہمت باندھ
لوں، اگر میں پھر گناہ کروں تو پھر میری دعا و فریاد نہ سننا"

سوال ۵۲ : شیعہ مذھب میں ھمیشہ غم و اندوہ اور گریہ کی فضا کیوں غالب رھتی ھے؟

جواب : پھلا: شیعہ مذہب میں بڑی بڑی عیدیں بھی موجود ہیں، جیسے چودہ معصومینؑ کے ایام ولادت، عید غدیر خم، عید قربان، عید الفطر اور عید مبعث وغیرہ شیعہ ان دنوں میں مکمل خوشی مناتے ہیں.

دوسرا : اگر شیعہ عزاداری کی طرح اپنی خوشی و عید علی الاعلان نہیں مناتے تو اس میں مذہب کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ان افراد کی کوتاہی ہے.

تیسرا : اسلام میں جیسے معصومین علیہم السلام کی عزاداری پر زور دیا گیا ہے، اسی طرح خوشی و سرور کا حکم بھی دیا ہے، حتیٰ کہ دوسروں کی خوشی کرنے کا حکم ہوا ہے، جیسا کہ رسولؐ خدا نے یتیموں، بچوں اور مومنین کو خوش کرنے کا حکم دیا ہے. حضور اکرمؐ نے ایک خوبصورت حدیث میں ارشاد فرمایا:

"جو شخص ایک مومن کو خوش کرتا ہے اس نے مجھے خوش کیا اور جو مجھے خوش کرے اس نے اللہ کو خوش کیا" (۱)

چوتھا : شیعہ مذہب میں خوشی پر غم و عزا کے غالب ہونے کی ایک وجہ یہ ہے اہل بیت پر جو ظلم ہوئے ہیں تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی، لہذا جو عظیم ظلم معصومینؑ پر ہوا اس کے پیش نظر دل خون کے آنسو روتا ہے خوشی ان غموں کے مقابل کیسے غالب آسکتی ہے اور خصوصاً سید الشہداء پر جو ظلم ہوئے ان کی یاد تو کسی وقت دلوں سے نکلتی ہی نہیں.

---

(۱) منتخب میزان الحکمۃ، ص ۲۲۹

سوال ۵۳ : خوشی و خرمی کی دین کے ساتھ کیا نسبت ہے، کیا دین خوشی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے یا دین میں جمود کا باعث ہے؟

جواب : قرآن اور سیرت معصومین علیہم السلام کی رو سے اسلام خوشی و سرور کو قبول کرتا ہے، خوشی انسان کو سستی و کاہلی سے نکال کر اسے مکمل چست اور تر و تازہ کر دیتی ہے، لیکن اس میں افراط و حد سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے بلکہ حد اعتدال میں رہنی چاہیے۔

۱) اسلام اور انسان کی بنیادی ضروریات

بہترین مذہب وہ ہے جو انسان کی طبیعت اور اس کے نظام خلقت سے ہم آہنگی رکھتا ہو، اس کی طبعی اور فطری ضروریات کو پورا کرے ورنہ وہ مذہب نا قابل عمل ہے اور نہ ہی انسان کی سعادت و خوش بختی کی ضمانت دے سکتا ہے، اسلام کی تعلیمات انسان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لحاظ سے اس کی فطرت سے مکمل ہم آہنگ ہیں۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر دنیا کے آخری کونے تک پھیل گیا

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

> "اسلام نہ انسان کو اس کی خواہشات اور فطری ضروریات سے محروم کرتا ہے اور نہ ہی اپنی کلی توجہ مادی پہلوؤں کی سیرابی پر مبذول کرتا ہے، نہ انسان کو اس دنیا سے جدا کرتا ہے جس میں انسان رہ رہا ہے اور نہ اسے دین و شریعت سے بے نیاز شمار کرتا ہے، ان تین پہلوؤں سے ایک ایسا مثلث تشکیل دیتا ہے کہ انسان ان کی حدود میں رہتے ہوئے مطلوبہ کمال کو حاصل کرے اور ابدی سعادت کو پالے، اگر ان پہلوؤں میں سے کسی ایک کو

---

(۱) فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا

بھی بھلا دیا جائے تو انسان انسانیت کے اوج سے گر جائے گا''(۱)

۲) خوشی و سرور ایک ضرورت

ا:۔ خوشی وسرور کی مختلف تعریفیں بیان ہوئی ہیں جیسے:

۲:۔ وہ مثبت احساس جو کامیابی کی حس کے پورا ہونے پر حاصل ہو،(۲)

۳:۔ وہ لذات جن میں کوئی رنج وغم نہ ہو''.(۳)

۴:۔ وہ حالت جو خواہشات کے پورا ہونے پر انسان میں پیدا ہوتی ہے''(۴)

اس حقیقت کی اگر چہ مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے تشریح کی گئی ہے لیکن تمام مفکرین اور دانش مندوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ انسان کی بنیادی ضرورت شمار ہوتی ہے، آپ کو ایسا شخص کہاں ملے گا جو کہے کہ مجھے خوشی کی ضرورت نہیں ہے در حقیقت اس کائنات اور اس کی موجودات کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوئی ہے کہ یہ انسان کے اندر سرور و خوشی کی لہر ایجاد کر دیتا ہے، پر طراوت بہار، بالطافت صبح، خوبصورت قدرتی مناظر، یہ بہتے جھرنے، رنگ برنگ پھول، دوستوں سے میل ملاقات، انسان کی شادی وغیرہ سب سرور و مسرت آور ہیں چونکہ خوشی، خوف، ناکامی، ناامیدی اور پریشانی کو ختم کرتی ہے اس لئے نفسیات کے ماہر انسان میں خوشی کے احساس کو بیدار کرنے اور مضبوط کرنے کا حکم دیتے ہیں اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ چیز انسان کی بہت ہی بنیادی ضرورت ہے.(۵)

---

(۱) علامہ طباطبائی، تفسیر المیزان، ج۱۶،ص۲۰۳

(۲) انگیزش و هیجان،ص۳۶۷

(۳) روانشناسی شادی،ص۳۲اور۱۷

(۴) روانشناسی شادی، روان شناسی کمال

(۵) جلوه های شادی در فرهنگ و شریعت، ص۴۷

همان بهتر که دائم شاد باشیم ز هر درد و غمی آزاد باشیم
به خوش رویی و خوش خویی در ایام همی رو تا شوی خوش دل در انجام
اگر خوش دل شوی در شادمانی بماند شادمانی ، جاودانی (۱)

۲) خوشی کے اسباب و عوامل

دانش مندوں کے نظریات واقوال اور معتبر کتب میں تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ درج ذیل امور کو خوشی وسرور کے عوامل شمار کیا جاسکتا ہے۔

۱	ایمان	۲	برداشت	۳	گناہ سے پرہیز
۴	پریشانی سے مقابلہ	۵	ہنسی	۶	مزاح
۷	خوشبو لگانا	۸	بننا سنورنا	۹	روشن رنگ پہننا
۱۰	خوشی کی محافل میں شرکت	۱۱	ورزش	۱۲	پرامید زندگی
۱۳	کام وکوشش	۱۴	سیروتفریح	۱۵	تلاوت قرآن
۱۶	خداوند کی مخلوقات میں غوروفکر	۱۷	صدقہ دینا	۱۸	سبزہ دیکھنا(۲)

چهار چیز هر آزاده راز غم بخرد تن درست و خوی نیك و نام نیك و خرد
هر آن که ایزدش این چهار روزی کرد سزد که شاد زید شادمان وغم نخورد ۔ (۳)

"چار چیزیں ہر آزاد شخص کو غم سے چھٹکارا دلاتی ہیں، صحت مند جسم ، اچھی عادت ، نیک نامی اور عقل ، جسے خداوند نے یہ چار چیزیں دے رکھی ہوں اسے خوش وخرم رہنے کا حق ہے"

۳) اسلام اور خوشی

انسان کی بنیادی ضروریات کے پیش نظر اسلام نے خوشی وسرور کو اچھا شمار کرتے

---

(۱) ناصر خسرو

(۲) شیخ حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج ۵، باب بلابس، شیخ طوسی، امالی، ج ۳۵، بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۹۵،

(۳) رودکی

ہوئے اس کی تائید کی، قرآن نے جو کہ اسلام کے مضبوط ترین منابع میں سے ایک ہے. خوشحال وخرم زندگی کو خداوند کی نعمت ورحمت شمار کیا ہے، جس زندگی میں مسلسل گریہ وزاری ہو اسے نعمت ورحمت سے دور قرار دیا ہے، چونکہ قرآن میں ہے.

فلیضحکو قلیلا ولیبکوا کثیراً (۱)

''انہیں کم ہنسا اور زیادہ رونا چاہیے''

اس آیت کا شان نزول یہ تھا کہ رسولؐ خدا نے حکم صادر کردیا تھا کہ جو مسلمان بھی کفار کے مقابلے میں جنگ کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جنگ کے لئے تیار ہو جائے، بعض نے مختلف بہانوں کے ساتھ اس لشکر میں شرکت سے پہلو تہی کی اور خدا اور رسولؐ خدا کے حکم کے خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ جنگ پر نہ گئے، خداوند انہیں عذاب کی دھمکی دیتے ہوئے فرماتا ہے: ''اس کے بعد تم ہنسا کم اور رونا زیادہ.''

واضح ہے کہ یہ لعنت سزا کے طور پر ہے جو کہ آدمی کی فطرت وطبیعت کے برخلاف اسے مسلسل غم ورنج سے دوچار رکھتی ہے، یہ خداوند نے نافرمانوں کو کم ہنسنے اور زیادہ رونے کا کہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی وتازگی ایک فطری امر ہے اور خداوند چاہتا ہے کہ نافرمانوں کو سزا کے طور پر اس فطری نعمت سے محروم کردے. (۲)

قرآن نے جنت کی جو صفات ذکر کی ہیں ان سے بھی اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام خوشی ونشاط کی تائید کرتا ہے کیونکہ خوبصورت باغات، آب زلال سے بھرے چشمے، خوبصورت بستر، نرم ونازک اعلیٰ قسم کے لباس اور اسی طرح کی نعمتیں (۳) یہ سب خوشی و دلچسپی کے عوامل ہی تو ہیں، خداوند نے انسانوں کو خوش وخرم رکھنے کے لئے جنت اسی طرح خلق کی ہے.

---

(۱) توبہ/ ۸۲

(۲) گفتارھا، ج۲ص ۲۲۵_۲۲۶

(۳) سورہ رحمٰن، واقعہ و یٰسین

قرآن کریم بعض دوسری آیات میں خوشی کے بعض اسباب کو مومنین کے ساتھ مخصوص قرار دیتا ہے:

قل من حرم زینة اللّٰہ التی اخرج لعبا دہ والطیبا ت من الر زق قل ھی للذین امنو فی الحیا ۃ الدنیا خالصة یوم القیا مة .(۱)

''اے پیغمبرؐ (نعمت سے اپنے آپ کو محروم کرنے والوں کو کہہ دو) کہ کس نے زیب و زینت کو حرام کیا، جیسے خداوند اپنے بندوں کے لئے نکالا، کہہ دو یہ پاک و پاکیزہ نعمتیں مومنین کے لئے ہیں دنیا اور آخرت میں خالصتاً ان کے لئے ہیں''

یعنی دنیا میں یہ نعمتیں غیر نعمت کے ساتھ مخلوط ہیں، غم آلود ہیں، لیکن آخرت میں ہر درد و غم و مشقت سے خالص ہوں گی۔

اس آیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نعمات زندگی اور طیبات سے بہرہ مند ہونے کو خوشی کے عوامل کے طور پر بڑی اہمیت دیتا ہے اور انہیں مومنین ہی کے لائق قرار دیتا ہے، معصومینؑ جو کہ وحی کے مترجم حقیقی ہیں بھی اسے بیان فرماتے ہیں:

۱) رسولؐ خدا نے فرمایا:

''مومن مزاح کرنے والا خوش وخرم ہوتا ہے''(۲)

۲) حضرت علیؑ نے فرمایا:

''خوشی طبیعت کو کھول دیتی ہے''(۳)

---

(۱) اعراف /۳۲

(۲) بحرانی، تحف العقول،ص۴۹

(۳) آمدی غرر الحکم، حدیث۲۰۲۳

''خوشی کے اوقات غنیمت ہیں'' (۱)

''جو شخص کم خوش رہتا ہے موت اس کے لئے آرام دہ ہوگی'' (۲)

۳) امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''کوئی مومن ایسا نہیں ہے جس کی طبیعت میں مزاح نہ ہو'' (۳)

''مزاح حسن خلق کا حصہ ہے'' (۴)

۴) امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

''کوشش کرو تمہارے اوقات چار حصوں پر مشتمل ہوں، ایک وقت خدا کی عبادت و مناجات کے لئے، ایک وقت روزی کے حصول کے لئے، ایک وقت اپنے با اعتماد مومن بھائیوں کے ساتھ نشست کے لئے جو تمہیں تمہارے عیبوں سے مطلع کریں اور باطن میں تمہارے ہمدرد ہوں اور ایک وقت اپنی تفریح و لذت کے لئے، تفریح کے اوقات میں خوشی و سرور سے تمہیں باقی اوقات میں کام وسعی کے لئے ضروری طاقت و حوصلہ ملتا ہے'' (۵)

سیرت معصومینؑ میں خوشی کے عنصر کو اس حد تک اہمیت حاصل ہے کہ اس پر زور دینے کے علاوہ اس کے ایجاد کے ماحول فراہم کرنے پر بھی بڑی تاکید کی گئی ہے۔(۶)

بعض احادیث میں خوشی و سرور کی اہمیت پر کلی احکام کے علاوہ خاص احکام ذکر کئے گئے

---

(۱) غرر الحکم، حدیث ۱۰۸۴

(۲) بحار، ج ۷۸، ص ۱۲

(۳) اصول کافی، ج ۲، ص ۶۶۳

(۴) حوالہ سابق

(۵) بحار، ج ۷۵، ص ۳۲۱

(۶) کافی، ج ۲، ص ۱۹۲

ہیں کہ کیسے اس حالت کو باقی رکھا جا سکتا ہے اور اس کی پرورش کی جا سکتی ہے جیسے پیدل چلنا، سواری، تیراکی، سبزہ کو دیکھنا، کھانا پینا، مسواک کرنا اور ہنسی مذاق کرنا وغیرہ(۱)

چو شادی بکاہد بکاہد روان   خرد گردد اندر میان ناتوان. (۲)

خوشی کے کم ہونے سے روح میں کمی ہو جاتی ہے،   اس کے اندر کمزور تو پس جاتا ہے،

۵) خوشی وسرور کی حدود

زندگی کے ہدف وانجام کی بنیاد پر اسلام کی نظر میں خوشی وسرور حدود وقیود رکھتے ہیں، خوشی وسرور کے مضامین، دین اسلام کی بیان کردہ اعلیٰ انسانی وتوحیدی فطرت کے منافی ومتضاد نہیں ہونے چاہئیں، کیونکہ جو چیز بھی انسان کو اس کے اصل مقصد وارمان سے دور کر دے اسلام اسے قبول نہیں کر سکتا، لہٰذا خوشی وسرور اور اس کے عوامل ایک حد تک اسلام کے لئے قابل قبول ہیں اور وہ یہ کہ نہ صرف انسان کو اس کے اصلی مقصد تک پہنچنے سے مانع نہ ہوں بلکہ اس تک پہنچنے میں اس کے معاون بھی ہوں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے غیر مسلم مفکرین قائل ہیں کہ چونکہ انسان اپنے اختیار طرز عمل میں کسی نہ کسی مقصد وہدف کے پیچھے ہوتا ہے(۳)، لہٰذا خوشی وسرور بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی ہدف ومقصد سامنے ہونا چاہیے، لہٰذا اگر اس کا مقصد حق ہو اور انسان کی زندگی کے اصل مقصد کے لئے مددومعاون ہو تو یہ بھی مفید وحق ہوگا اور اگر اس کے سامنے کوئی باطل مقصد ہو جو کہ زندگی کے اصلی مقصد کے مقابل ہو تو پھر خوشی باطل ومضر ہوگی، پس خوشی کی حدود اس کے ہدف ومقصد کو قرار دیا جا سکتا ہے، مذاق جو کہ خوشی کے اہم ترین عوامل میں سے ہے اگر بے حیائی وبدتمیزی پر مشتمل ہو تو اسے ہزل کہتے ہیں جس کی اسلام مذمت کرتا ہے اور اگر کسی کی بدگوئی ہجو پر مشتمل ہو تو اسے ہجو کہتے ہیں اس سے بھی اسلام

---

(۱) وسائل، ج۱۲، ص۱۱۲ بمستدرک الوسائل، ج۸، ص۴۱۸

(۲) فردوسی

(۳) اخلاق اسلامی، ص۹۸۔۹۹، اخلاق الٰہی، ج۵، ص۲۳۸

نے منع کیا ہے۔(۱)

اگر مذاق حد سے تجاوز کر جائے اور بیہودگی کے زمرے میں داخل ہو جائے، تو اس کی بھی اسلام میں مذمت بیان ہوئی ہے، حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

''جو شخص زیادہ مزاح کرے اس کی شخصیت و وقار میں کمی واقع ہو جاتی ہے'' (۲)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''زیادہ مزاح کرنا وجاہت کو ختم کر دیتا ہے'' (۳)

ہنسی اور تبسم بھی خوشی کے عوامل میں سے ہے جو کہ دل سے ہونا چاہیے اور انسان کی شخصیت کو عیب دار نہ بنا دے، ہنسی اسلام کی نظر میں اس حد تک مفید و مؤثر ہے جب تک دوسروں کی شخصیت پر چوٹ نہ پڑے، اگر ہنسی دوسروں کی تحقیر، توہین اور اذیت کی خاطر ہو تو پھر مومن کی اذیت کے حکم میں داخل ہے اور حرام و ناپسندیدہ ہے، جب مومن کا احترام کعبہ سے بڑھ کر ہے تو واضح ہو جائے گا کہ اس کی اہانت و اذیت کس حد تک ناپسندیدہ ہوگی۔(۴)

خوش و سرور کے وسائل و عوامل بھی انسان کے مقام و شان اور ارمانوں کی طرح بلند ہونے چاہئیں، کیونکہ ہو سکتا ہے مفید بات برے انداز میں پیش کرنے سے اس کا الٹا اثر حاصل ہو، اسی وجہ سے قہقہہ کو روایات میں شیطان کی طرف سے شمار کیا گیا ہے(۵) اور تبسم کو بہترین ہنسی شمار کیا گیا ہے۔(۶)

---

(۱) ایک صحابی نے رسولؐ خدا سے پوچھا آپس میں ہنسی مذاق میں کوئی اشکال ہے تو فرمایا: اگر کوئی نامناسب بات نہ ہو تو کوئی ڈر نہیں ہے (کافی، ج ۲، ص ۶۶۳، تحف العقول، ص ۳۲۳)

(۲) غرر الحکم، ص ۲۲۲

(۳) کافی، ج ۲، ص ۶۶۵

(۴) اخلاق الٰہی، ج ۵، ص ۲۵۶۔۲۵۷

(۵) کافی، ج ۲، ص ۶۶۴ (۶) غرر الحکم، ص ۲۲۲

خوشی وسرور کا زمان ومکان بھی اس کے مناسب ہونا چاہیے ورنہ بہت ناپسندیدہ و برا شمار ہوگا، سوگواری میں یا مقدس جگہوں پر مزاح وبذلہ گوئی سخت بری بات ہے۔(۱)

ہنسی کے مکان وزمان کے بارے میں رسولؐ خدا سے روایت وارد ہے کہ آپ نے فرمایا:

''جو شخص جنازے میں ہنسے خداوند قیامت کے دن سب کے سامنے اس کی توہین کرے گا، اس کی دعا قبول نہیں کی جائے گی اور جو شخص قبرستان میں ہنسے تو اس حال میں واپس آئے گا کہ بزرگی کا بوجھ اس پر کوہ احد کی طرح بھاری ہوگا'' (۲)

جو کچھ ہم نے یہاں ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جن بعض روایات میں خوشی یا اس کے عوامل کی بطور مطلق یا مقید مذمت کی گئی ہے ان سے مراد خوشی اور اس کے عوامل ہیں جو اسلام کی مقرر کردہ حدود سے خارج ہو جائیں اور افراط وتفریط کی حدود میں داخل ہو جائیں، اصل خوشی کی اسلام مذمت نہیں کرتا بلکہ اس کی تائید کرتا ہے۔

۶) چند نکات

الف) زندگی تعلقات بننے اور ٹوٹنے، خوشی وغم، امید وناامیدی، آسائش ومشقت سے پُر ہے، جس کائنات میں ہم رہ رہے ہیں اس میں خوشی اور غم اکٹھے ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ مسلسل زندگی میں خوشی رہے یا مسلسل غم رہے، زندگی کے میدان میں بہت سی نامناسب وناپسندیدہ باتوں اور حالات سے واسطہ پڑتا ہے شاعر رودکی کے بقول:

خدای عرش، جهان را چنین نهاد نهاد — که گاه مردم، شادن وگه بُود ناشاد

''عرش کے مالک خدا نے یہ کائنات بنائی ہی ایسی ہے کہ لوگ کبھی خوش اور کبھی غمگین ہوتے ہیں''

ب) جن بعض روایات میں مومن کو غمگین ومحزون ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد اس کی

---

(۱) اخلاق الہٰی، ج۵ص۲۵۸۔۲۵۹

(۲) اخلاق الہٰی، ج۵ص۲۵۸۔۲۵۹

اندرونی حالت ہے جو کہ اس کی اجتماعی و فردی تعلق سے آگاہی کی وجہ سے ہے نہ کہ مراد یہ ہے کہ مومن ظاہراً پریشان ہوگا جو کہ خوشی و سرور کے منافی ہو، اندرونی غم دوسروں کے حالات اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے ہوتا ہے.(۱)

جیسا کہ سعدی نے کہا ہے:

بنی آدم اعضای یک پیکرند | کہ در آفرینش زیک گوہرند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار | دگر عضوہا را نماند قرار

"انسان ایک جسم کے عضو ہیں، چونکہ خلقت میں ان کا اصلی جوہر ایک جیسا ہے، جب زمانے کی سختیاں ایک عضو کو مصیبت و درد میں مبتلا کردیں تو کسی عضو کو سکون نہیں رہتا"

ج) خوشی کے بعض عوامل جسمانی تازگی کا باعث بنتے ہیں جو کہ بالواسطہ انسان کی روح پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور بعض عوامل کا بلا واسطہ اثر روح پر پڑتا ہے. تلاوت قرآن، خدا کی مخلوقات میں غور وفکر، ایمان اور اس کی تقویت، صدقہ دینا اور گناہ سے بچنا ان عوامل میں سے ہیں جن سے روحانی خوشی ونشاط حاصل ہوتی ہے اور مناسب کھانا، ورزش، خوشبو، بننا سنورنا، خوش رنگ لباس پہننا، پیدل چلنا اور سبزے کو دیکھنا ان عوامل میں سے ہیں جو مادی وجسمانی نشاط وتازگی کا ماحول پیدا کرتے ہیں، اگرچہ جسمانی تازگی سے روح کو بھی بالیدگی حاصل ہوتی ہے.

د) بعض مسلمان عرفاء باطن پر نظر رکھتے ہیں وہ انسان کی روح کے اندر خوشی وتازگی کو تلاش کرتے ہیں اور محبوب کے ساتھ وصال کی خوشی کو جسمانی وظاہری خوشی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں، راہ عرفان کے سلوک کرنے والے غم واندوہ، کو عرفانی تجربوں میں ایک مقام و منزلت سمجھتے ہیں اسی وجہ سے وہ اپنی خوشی کو بھی اس غم پر قربان کردیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ غم کے ذریعے خوشی کو پایا جاسکتا ہے.

---

(۱) اصول کافی، ج ۲، ص ۱۶۳، وسائل الشیعہ، ج ۲۰، ص ۲۱۳

کہ را دیدی تو ان در جملہ عالم   کہ یك دم شادمانی یافت بی غم. (۱)

''ان کی نظر میں اس دنیا کی خوشیاں خود دنیا کی طرح کسی کام کی نہیں ہیں اور ہمیشہ غم کے ہمراہ ہوتی ہیں''

شادی بی غم درین بازار نیست   گنج بی مار و گل بی خار نیست

راہ لذت از درن است نز برون   ابلہی دان جستن از قصر و حصون (۲)

عارف چونکہ مکتب عشق کا پیروکار ہوتا ہے وہ معتقد ہے کہ وہ جو حقیقی زندگی وخوشی خلق کرتا ہے وہ پاک عشق ہے.

مردہ بدم ، زندہ شدم ، گریہ بدم ، خندہ شدم   دولت عشق آمد و من ، دولت پایندہ شدم

از تو ام ای شہر قمر ، در من و در خو دبنگر   کز اثر خندہ تو ، گلشن خندہ شدم (۳)

''میں مردہ تھا زندہ ہوا ، رو رہا تھا ، ہنسنے لگا ، عشق کی دولت آگئی
تو میں دولت مند ہوگیا ، اے شہر قمر میں تجھ سے ہوں مجھ میں اور
اپنے پر نظر کر کہ تیرے ہنسنے سے میں ہنسی وخوشی کا گلشن ہوگیا''

اہم بات یہ ہے کہ عارف بھی مطلق وکامل خوشی کی تلاش میں ہے ، وہ اپنے ظرف کے مطابق حقیقی خوشی پانے کے لئے غم کو خوش دلی سے قبول کرتا ہے لیکن کبھی بھی دوسروں کے لئے غم کی آرزو نہیں کرتا ، اس کے علاوہ غم کی حالت میں مکمل محتاط ہے کہ دوسرے ان کے اندرونی غم وحزن سے واقف نہ ہو جائیں. (۴)

سوال ۵۴ : جب یہ بات طے ہے کہ سیدالشہداء نے اپنی شہادت سے کمال کی آخری منزل "فناء فی اللہ" کو پا لیا تو ان پر آنسو بہانے کا کیا مطلب ہے؟

---

(۱)   شبستری

(۲-۳)   مولوی

(۴)   حضرت علیؑ عرفاء کے وصف میں فرماتے ہیں وہ دنیا میں اگر چہ ہنسیں لیکن ان کا دل روتا ہے اگر چہ خوش ہوں لیکن ان کا غم شدید ہے (نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۱۳ ، شرح مقامات اربعین ، ص ۲۶۰-۲۶۲)

جواب : یہ بات دو لحاظ سے غلط ہے، پہلا تو یہ کہ امام حسینؑ پر گریہ صرف ان کی قربانی، مظلومیت اور ان کے خاندان کی قید و بند کی وجہ سے نہیں کیا جاتا۔

دوسرا یہ کہ : امام حسین علیہ السلام کے بعد والے آئمہؑ جو کہ حق الیقین کی منزل پر فائز تھے اور کوئی غیب ان سے پوشیدہ و مخفی نہیں تھا، وہ نہ صرف دوسروں کو سید الشہداء پر گریہ کا حکم دیتے بلکہ خود بھی گریہ فرماتے تھے، مجالس عزا منعقد کرتے اور دوسروں کو بھی کہتے، کیا وہ واقعہ کربلا کی حکمتوں سے (نعوذ باللہ) ناواقف تھے؟ بلکہ سید الشہداء پر گریہ کی کچھ اور حکمتیں بھی ہیں جن کی خاطر آئمہؑ اپنے ماننے والوں پر اس کے بارے زور میں دیتے رہے، دوسرے بیان کے مطابق واقعہ عاشورہ دو پہلو رکھتا ہے، ایک لحاظ سے اسے دیکھیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ امام حسینؑ اور آپ کی اولاد و اقرباء شہید ہو گئے، آپ کے اہل و عیال اسیر ہو گئے اور یزید بن معاویہ کامیاب ہو گیا، اگر اس تحلیل کو سامنے رکھتے ہوئے گریہ کریں تو یہ گریہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہوگا، ایسی صورت میں یہ گریہ دوسرے حوادث کے مظلوموں پر گریہ سے الگ نہیں ہوگا، ظلم کی کمی و زیادتی کا فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر واقعہ عاشورہ کی تحلیل ایک دوسرے انداز سے کی جائے تو دیکھیں گے کہ امام حسینؑ کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور وہ جو ناکام ہوئے یزید اور اس کے کارندے تھے، اس نظر کے مطابق واقعہ عاشورہ میں صفات کامل وحسنہ کو جو کہ انتہائی اعلیٰ درجہ کی تھیں ان صفات رذیلہ پر فتح حاصل ہوئی جو انتہائی گھٹیا درجہ کی تھیں۔

اس تحلیل کی بنا پر گریہ صرف ہمدردی کی خاطر گریہ نہیں ہوگا، صرف مظلوموں کے ساتھ اظہار ہمدردی نہیں ہے نہ از روئے احساسات ہے کہ آپ کہیں فناء کی منزل پر جب امامؑ فائز ہو چکے تو گریہ کیا ضرورت ہے۔

سوال ۵۵ : امام حسین علیہ السلام کے مظلوم ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب : عدل کے مقابل ظلم کے معنی صاحب حق کو حق نہ دینے کے ہیں، امام حسینؑ اس

لحاظ سے مظلوم شمار ہوتے ہیں کہ آپ کا سب سے ظاہر ترین حق یعنی مسلمانوں پر حاکمیت و زعامت کا حق آپ سے چھین لیا گیا، اس کے علاوہ بھی آپ کا مسلمانوں پر ایک حق تھا جو کہ آپ کی معرفت و محبت کا حق تھا، جو کہ منفی پروپیگنڈے کی وجہ سے مسلمانوں نے ادا نہ کیا، لوگوں کی جہالت، خباثت اور خیانت جیسے تاریک حجابوں کی وجہ آپ کا ملکوتی چہرہ چھپا دیا گیا اور وہ الٰہی جلوہ ظاہر نہ ہوسکا، سید الشہداء کا قتل ہو جانا بڑا ظلم نہیں تھا بلکہ آپ کا نہ پہچانا جانا بڑا ظلم تھا، توجہ کریں کہ مظلوم کی اصطلاح ''منظلم'' اصطلاح سے فرق رکھتی ہے، ''منظلم'' وہ ہے جو ظلم کو قبول کر کے اس کے مقابل کوئی حرکت نہ کرے، لیکن مظلوم وہ ہے جو ظلم کے مقابل آرام سے نہ بیٹھے بلکہ اپنے تمام امکانات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے، دینی تعلیمات کی روشنی میں ظلم سہنا ناپسندیدہ ہے اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہو جانا پسندیدہ ہے۔

اهل سنت اورعزا داری

سوال ۵۶ : عزاداروں کے مقابلے میں اہل سنت کیوں سختی وناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اوراسکی وجہ بے وقوفی اور سنت کی مخالفت کو قرار دیتے ہیں؟

جواب : اہل سنت کی دلیل بعض روایات ہیں کہ جن میں مردوں پر گریہ و ماتم سے منع کیا گیا ہے، لیکن بعض اہل سنت محققین کی نظر میں یہ روایات سند و دلالت کے لحاظ سے اشکال رکھتی ہیں، امام نووی کہتے ہیں: ''یہ روایات ام المومنین عائشہ کی نظر میں ناقابل قبول ہیں، وہ ان روایات کے روایوں کے بارے میں اشتباہ و نسیان کی قائل تھیں، کیونکہ حضرت عمر اور ان کے بیٹے نے ان روایات کو رسولؐ خدا سے درست طور پر وصول نہیں کیا تھا۔ ابن عباس نے کہا: یہ خلیفہ کا اپنا قول ہے روایت نبی نہیں ہے۔(۱)

(۱) شرح نووی، ج۵، ص۳۰۸

اس کے علاوہ تاریخ میں اہل سنت کی بعض شخصیات کی وفات پر عزاداری کی برقراری ثابت ہے مثلاً جوینی (م ۴۷۸ ق) پر عزاداری کی گئی. امام ذہبی جوینی کی وفات اور اس پر عزاداری کے بارے لکھتے ہیں: ''پہلے انہیں ان کے گھر کے اندر دفن کیا گیا اس کے بعد ان کے جسم کو ''مقبرۃ الحسین'' میں منتقل کیا گیا، اس کے ماتم میں اس کے منبر کو توڑ دیا گیا بازار بند ہو گئے، اس کی مصیبت میں بہت مرثیے پڑھے گئے، اس کے چار سو شاگرد تھے جنہوں نے اپنے استاد کے سوگ میں اپنے قلم اور قلمدان توڑ دیئے اور ایک سال تک عزاداری کرتے رہے اور ایک سال تک اپنے سر پر انہوں نے عمامے نہ رکھے، یہاں تک کہ کسی نے بھی عمامہ سر پر رکھنے کی جرأت نہ کی وہ اس مدت میں پورے شہر میں نوحہ خوانی و مرثیہ خوانی کرتے رہے اور عجیب گریہ وزاری کرتے رہے'' (۱)

ابن جوزی (م ۵۹۷ ق) کی موت کے بارے بھی ذہبی لکھتے ہیں:

''ان کی وفات پر بازار بند ہو گئے اور آپ کے مراسم میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی، ماہ رمضان کے آخر تک لوگ آپ کی قبر پر ساری ساری رات بیٹھے رہتے. ان کی عزاداری ہم نے ہفتے کے دن برپا کی'' (۲)

عجیب بات ہے کہ اہل سنت کے نامی گرامی مؤرخ کتنی آسانی سے اپنے بزرگوں کی وفات و عزاداری کی رسموں کو ذکر کرتے ہیں اور اس پر کسی قسم کی کوئی تنقید نہیں کرتے بلکہ ان کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن اہل بیتؑ کی عزاداری پر اور امام حسین علیہ السلام کی عزاداری پر کیسے کیسے اعتراض انہیں یاد آجاتے ہیں، اس دورنگی کا راز کیا ہے. (۳)

سوال ۵۷ : روایت ﴿لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب ودعا بدعوۃ الجاھلیۃ﴾ "جس نے منہ پیٹا، اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کا

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج۱۸، ص۴۶۸

(۲) حوالہ سابق، ص۳۷۹

(۳) چرائی گریہ سوگواری، ص۱۹-۳۲

انداز اپنایا وہ ہم میں سے نہیں ہے "اس روایت کی بنا پر اہل سنت عزاداری نہیں کرتے ، کیا ایسا ہی ہے ؟

جواب : پہلا: اس حدیث کو مورد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی عزیز کی موت پر اپنے آپ کو پیٹے یا گریبان چاک کرے وہ بھی اس حالت میں کہ قضاء الٰہی پر شاکی ہو اور اس پر ایسے بین کرے یا ایسا نوحہ کرے جو خداوند کی ناراضگی کا باعث ہو. جب کہ سید الشہداء پر گریہ و عزاداری افضل ترین عبادات میں سے ہے، تعظیم شعائر الٰہی کا مصداق ہے اور دینی آئمہ و بزرگان کے ساتھ وفاداری کا اعلان ہے اور مزید متعدد حکمتیں اس میں ہیں جو کہ سابقہ جوابات سے روشن ہو چکی ہیں.

دوسرا یہ کہ : گریبان چاک بعض جگہوں پر استثناء ہوا ہے اور حرام نہیں ہے. جیسے باپ، ماں اور بھائی کی موت پر جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات پر کیا، امام حسن عسکریؑ نے اپنے والد گرامی امام ھادیؑ کی وفات پر کیا. (۱)

پس آئمہ کے سوگ میں گریبان چاک کرنا خصوصاً امام حسینؑ پر جو کہ امت اسلام کے معنوی باپ ہیں کوئی اشکال نہیں رکھتا بلکہ انسان کی سعادت اور قرب خدا کا موجب ہے.

روایات میں جس گریہ و نوحہ کی مذمت کی گئی ہے وہ گریہ و نوحہ ہے جس میں خدا کی رضا نہ ہو یہ وہی انداز ہے جو جاہلیت میں رائج تھا اور یہ روایت اس کا بیان کر رہی ہے، جب کہ سید الشہداء کی عزاداری اس زمرے میں داخل ہی نہیں ہے بلکہ اس پر روایات میں بڑا زور دیا گیا ہے کیونکہ اس عزاداری سے اسلام کی بقاء ہے اور ظالم و فاسد حکومتوں کے خلاف اعلان جنگ ہے اس عزاداری کے بڑے مثبت نتائج معاشرے پر مترتب ہوئے ہیں.

---

(۱) وسائل الشیعہ، ج ۲۲، ص ۴۰۲، ص ۲۷۴

پانچواں حِصّہ

اِخلاق اور عِرفان

کاظم مُصطفائی

خدا کا انتقام

سوال ۵۸ : "ثار اللہ" کے کیا معنی ہیں اور امام حسین علیہ السلام پر اس کے اطلاق کی کیا دلیل ہے؟

جواب : ثأر عربی میں انتقام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور خون کا معنی بھی دیتا ہے.
(۱) "ثار اللہ" کے مختلف معانی ذکر ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک کی خاص تفسیر کی ضرورت ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند امام حسینؑ کا ولی دم ہے یعنی امام حسین علیہ السلام کا دشمنوں سے انتقام خود خدا لے گا، کیونکہ سید الشہداء کا کربلا میں قتل کرنا حریم الہی پر تجاوز تھا اور خدا کے مقابل قرار پانا تھا، خلاصہ یہ کہ اہل بیتؑ آل اللہ ہیں لہذا ان کی شہادت بھی اس خون کا گرانا ہوگا جو خداوند سے منسوب ہے.(۲) اگر چہ یہ اصطلاح قرآن میں وارد نہیں ہوئی لیکن آیات قرآن کے ساتھ اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے خداوند فرماتا ہے:

ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطانا (۳)

---

(۱) الطریحی، مجمع البحرین، ج۱، ص۲۳۷، محمد فرہنگ فارسی ج۱ ص۱۱۸۵، مفردات راغب، ص۸۱

(۲) محدثی جواد، زیارات عاشورہ، ص۱۴، عزیزی تہرانی، اصغر شرح زیارت عاشورہ، ص۳۵

(۳) اسراء /۳۳

''جو شخص مظلوم مارا جائے ہم نے اس ولی کے لئے سلطنت (حق قصاص) قرار دی ہے''

پس جو بھی ظلم کے ساتھ قتل ہو جائے اس کے ورثہ کو حق قصاص ہے اور چونکہ اہل بیتؑ خصوصاً امام حسین علیہ السلام ظلم کے ساتھ راہ خدا وحق وحقیقت کی خاطر مارے گئے ہیں لہٰذا ان کا ولی دم اور خونخواہ خود خدا ہے، پس ثار اللہ کے معنی یہ ہوں گے کہ امام حسینؑ کے خون کا بدلہ خداوند سے متعلق ہے، خداوند ہی امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لے گا. یہ اصطلاح امام حسینؑ اور خداوند کے درمیان شدید تعلق وہم بستگی سے حکایت کرتی ہے جو خون خدا سے متعلق ہے اس کا خداوند خود انتقام لے گا.(۱)

۲) اگر ثار خون کے معنی میں ہو تو قطعی طور پر اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوں گے بلکہ ایک طرح کی تشبیہ، کنایہ اور مجاز ہوگا کیونکہ خداوند جسم تو رکھتا نہیں کہ اس کا خون ہو، لہٰذا یہ معقول کو محسوس سے تشبیہ دینے کے باب سے ہوگا یعنی جیسے خون بدن میں حیاتی فعالیت انجام دیتا ہے اسی طرح امام حسینؑ نے بھی دین خدا کے لئے یہی کام کیا اور نہضت عاشورہ سے اسلام کو زندگی ملی.

۳) اس بارے میں روایات سے استفادہ شدہ عرفانی نظر سے بھی بڑا نورانی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے، حضرت علی علیہ السلام کو ''اسد اللہ'' اور ''ید اللہ'' جیسے القاب دیئے گئے ہیں اور حدیث قرب نوافل میں رسولؐ خدا نے فرمایا کہ خداوند فرماتا ہے.

ماتجب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت علیه
وانه لیتجب الی بالنا فله حتی احبه فا ذا اجته کنت سمعه
الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به ولسا نه الذی ینطق
به و یده التی یبطش بها و رجله التی بها اذا دعا نی احبته
وا ذا سا لنی اعطیته.(۲)

---

(۱) فرهنگ عاشوره

(۲) محاسن برقی، ج۱، ص۲۹۱

"میرا بندہ واجبات سے پسندیدہ ترین چیز کے ساتھ میرے نزدیک اظہار محبت نہیں کرتا، وہ نوافل کے ذریعے میرے نزدیک اظہار محبت کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے چلنے، بولنے وغیرہ کا ذریعہ بن جاتا ہوں، وہ جب مجھے پکارے تو میں اسے جواب دیتا ہوں جب کچھ مانگے تو اسے عطا کرتا ہوں"

اس روایت سے یہ بات واضح وروشن ہے کہ اولیائے الٰہی زمین میں خلیفہ خدا اور مظہر افعال الٰہی ہیں، خداوند جسم نہیں ہے جو وہ انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے اولیاء کے ذریعے اس کا اظہار کرتا ہے، جب اپنے بندے تک مدد پہنچانا چاہتا ہے تو اپنے اولیاء کو پہنچاتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے کہ اس کی طرف سے دین کے احیاء کے لئے قربانی دی جائے خون بہایا جائے تو اسے بھی اپنے اولیاء کی شہادت کے ذریعے اظہار کرتا ہے، اسی وجہ سے جیسے حضرت علی دست قدرت خدا (ید اللہ) ہیں. اسی طرح امام حسین علیہ السلام بھی ثار اللہ اور خون خدا ہیں، لہٰذا زیارت عاشورہ میں ہے:

السلام علیک یا ثار اللہ وبن ثارہ والوتر الموتور

"سلام ہو آپ پر اے خون خدا اور خون خدا کے بیٹے اور سلام ہو آپ پر آپ یگانہ دہر"

مرحوم ابن قولویہ نے بھی زیارت صفحہ ۲۰۷ میں یہ جملہ نقل کیا ہے:

وانک ثار اللہ فی الارض والدم الذی لا یدرک ترتہ احد من اھل الارض وال یدرکہ الا اللہ وحدہ .(۱)

جیسے بدن میں خون کا کردار حیاتی کردار ہے اس کے ہونے سے زندگی ہے اور نہ ہونے سے زندگی نہیں ہے حضرت علی اور امام حسین علیہ السلام کا وجود مقدس بھی خدا کے نزدیک اور

---

(۱) کامل الزیارات ،ص۳۶۸،۲۰۶

دین میں اسی کردار کا حامل ہے اگر آپ نہ ہوتے تو نہ اسلام ہوتا نہ دین ہوتا۔

ہاں جب تک امام حسینؑ کا نام اور یاد زبانوں پر ہے، جب تک عشق حسینؑ دلوں میں جوش مار رہا ہے، جب تک آپ کی ولایت کی حرارت دلوں کو گرما رہی ہے اور جب تک یا حسینؑ کی آوازیں زمین و آسمان میں گونج رہی ہیں، تب تک نام خدا اور یاد خدا زندہ ہے کیونکہ آپ نے اپنی پوری ہستی و کائنات راہ خدا میں قربان کر دی، اس دور کے ریاکاروں اور تحریف گروں کے چہروں سے نقاب اتار دی اور نبوی و علوی خالص اسلام لوگوں پر آشکار کر دیا، لہٰذا آپ کا خون بھی اتنا عظیم ہو گا کہ ثار اللہ کہلایا۔

سیر وسلوک میں گریہ کا کردار

سوال ۸۹ : عرفانی نکتہ نظر سے امام حسینؑ پر گریہ کو عشق خدا اور سیر وسلوک کے ساتھ کیسے ربط دیا جا سکتا ہے؟

جواب : سالک کو مقام استغفار میں سوز دل اور با اخلاص گریہ کو بہت غنیمت شمار کرنا چاہیے اور اس کی تحصیل میں خوب کوشش کرے اگر وہ اسے حاصل نہ بھی ہو سکے تو کم از کم کیفیت گریہ (تباکی) تو اس پر طاری ہو جائے گی، بہر کیف عبادت و سیر وسلوک کی منزل میں ہر صورت میں مقام استغفار ہو یا مقام حال یا کوئی اور حالت سوز دل و گریہ کا اپنا ایک حساب ہے جس کی شرح و تفسیر نا قابل بیان ہے، گریہ و سوز دل شوق سے ہو یا خوف سے، مقام استغفار میں ہو یا مقام تلاوت قرآن میں یا ان کا استماع ہو، سجدہ کی حالت میں ہو یا اس کے علاوہ جہاں بھی ہو، انسان کے ادراک اور فہم و شعور سے سرچشمہ پاتا ہے، جو سمجھتا ہے وہ تپش محسوس کرتا ہے اور آنسو بہاتا ہے اور جو نہیں سمجھتا نہ جلتا ہے نہ آنسو بہاتا ہے۔

اگر سورہ اسراء کی آیت ۱۰۷ تا ۱۰۹ پر نظر کریں تو صاف پتہ چل جائے گا کہ جو سمجھتے ہیں ان کی روش آیات حق کے مقابل خضوع کرنا ہے اور وہ سوز، خشوع اور گریہ کرتے ہیں۔

قل آمنو به او لا تو منو ا ان الذین اوتو العلم من قبله اذا
یتلی علیهم یخرون للا ذقا ن سجدا ،(۱۰۷)
ویقولون سبحان ربنا ان کا ن وعد ربنا لمفعو لا ،(۱۰۸)
یخر و ن للا ذقان یبکو ن و یزید هم خشوعا،(۱۰۹)

جو سالک با اخلاص ہیں انھیں ان آیات میں خوب غور وفکر کرنا چاہیے اور متوجہ رہیں کہ یہ کلام حق اور حق کلام ہے، ان آیات سے وضاحت کے ساتھ استفادہ ہوتا ہے کہ جو بھی اعلیٰ سطح کی معرفت وفہم رکھتا ہو تو آیات قرآن کی تلاوت سنتے ہی وہ حقائق کا ادراک کرلیتا ہے ان کو باور کرتا ہے، خداوند کے وعدوں کو مسلّم شمار کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے اور جو سمجھتا ہے اس کے سبب اس کے یقین اور خضوع وخشوع میں اضافہ ہوجاتا ہے، خوف، خشیت، شوق اور اشتیاق اس کے وجود کو گھیر لیتے ہیں، اس کی سعی وکوشش میں اضافہ ہوجاتا ہے، راہ فقر اختیار کرلیتا ہے، حضور خدا میں چہرہ خاک پر رکھ دیتا ہے اور سوز دل کے ساتھ آنسو بہاتا ہے اس امید کے ساتھ کہ اس کے ان آنسوؤں پر نظر عنایت ہوجائے۔

اور جو شخص موجو حقیقتوں کا ادراک نہیں کرتا اس نے اپنی جہنم جو خود اس نے تیار کی ہے اور اس میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کو نہیں پہچانا اور وہ حجاب کو صحیح پہچان نہیں سکا، (جو تمام مصیبتوں کی جڑ ہے) یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان آیات میں جس علم ومعرفت کی بات کی گئی ہے اور اس علم ومعرفت والے کو اہل سوز وگریہ بتلایا گیا ہے اس سے مراد رسمی علم اور نظری معرفت نہیں ہے بلکہ یہ علم ومعرفت ان سے الگ ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی اہل علم میں سے ہو اور نظری عرفان کی اعلیٰ سطح کو رکھتا ہو بلکہ ایسے افراد ہیں لیکن یہ خصوصیات ان میں نہ ہوں اور نہیں ہیں. بہر حال سوز دل اور گریہ کے ساتھ چہرے کو خاک فقر پر رکھنا عارف باللہ افراد کی خصوصیات میں سے ہے، قرآن کریم ان خصوصیات کو انبیاء الٰہی جو کہ حقیقی عالم وعارف ہیں کی بڑی واضح خصوصیات کے طور پر شمار کرتا ہے، سورہ مریم میں

خداوند نے کچھ انبیاء کا ذکر کیا ہے اور ہر ایک ذکر اس کے اوصاف کے ساتھ کیا ہے.

ان کے بارے میں خداوند فرماتا ہے:

اولئک الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبین من ذریة آدم و ممن حملنا مع نوح و من ذریة ابراھیم و اسرائیل و ممن ھدینا و اجتبینا اذا تتلی علیھم آیات الرحمن خروا سجدا و بکیا .(۱)

"یہ وہ ہیں جن پر خداوند نے نبیوں میں سے انعام کیا آدم کی ذریت میں سے ان میں سے جنہیں نوح کے ساتھ ہم نے کشتی پر سوار کیا، ذریت ابراہیم و یعقوب میں سے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور انہیں چن لیا جب ان پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو گر پڑتے ہیں اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے اور گریہ کرنے والے ہوتے ہیں"

اس آیت کے آخری جملے میں بیان ہوا ہے کہ جب ان پر آیات رحمان کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ خضوع کے ساتھ گریہ کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، یہ گریہ خوف و خشیت ہے.

اس آیت میں اہل توحید کے لئے کچھ رموز و اشارے ہیں کہ بہت دقیق و لطیف ہیں، آیت کے ابتداء میں انبیاء اور برگزیدہ افراد کے اوپر انعام کا ذکر فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ سب وہ ہیں جن پر خدا کا انعام ہوا "اولئک الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبین" اور پھر آیت کے آخر میں فرمایا" واذا تتلی علیھم آیات الرحمن" ان کے خضوع، گریہ اور سجدہ کو ان کے لئے خدا کے سب سے بڑے انعام کے طور پر ذکر کیا ہے

---

(۱) مریم /۵۸

اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خضوع، سجدہ، سوزِ دل اور گریہ جسے بھی یہ سب حاصل ہوا یہ سب خداوند کا انعام و تفضل ہے۔

گریہ و خندہ غم و شادی دل ہر یکی از معدنی دان مستقل
ہر یکی را مخزن و مفتاح آن ای برادر در کف فتاح دان۔ (۱)

حافظ شیرازی بھی کہتے ہیں:

سوزِ دل اشکِ روان آہ سحر نالہ شب این ہمہ از نظر لطف شما می بینم

''سوزِ دل ہو یا جاری آنسو، سحر کی آہیں ہوں یا گریہ شب، یہ سب مجھے آپ کا لطف نظر آتا ہے''

قرآن مجید میں ہے:

ومن یو من باللّٰہ یھد قلبہ

''جو خدا پر ایمان لائے خداوند اس کے دل کو ہدایت کرتا ہے''

رسولؐ خدا نے فرمایا:

قلب المو من بین اصبعین من اصابع الرحما ن.(۲)

''مومن کا دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے''

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ان القلو ب بین الصبعین من اصا بع اللّٰہ یقلبھا کیف یشا ء سا عۃ کذا و سا عۃ کذا. (۳)

اس باب میں ان دو روایات سے ہر کوئی اپنے انداز میں استفادہ کر سکتا ہے، پہلی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص خداوند پر سچا ایمان لے آتا ہے وہ اسم مبارک رحمٰن کے تصرف و

(۱) دفتر پنجم، مثنوی

(۲) بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۳۹

(۳) حوالہ سابق، ص ۵۳

تدبیر کے ماتحت آجاتا ہے اور اسم کی تجلیات اس پر نازل ہوتی ہیں، صاحبان ایمان کے دل ان کے مراتب، صلاحیتوں اور مختلف حالات کے مطابق اس اسم مقدس کی ولایت کے مظاہر قرار پاتے ہیں.

دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب قلوب چاہے اہل ایمان کے ہوں یا دوسروں کے اسم اللہ کے تحت تصرف ہیں اور یہ اسم مقدس مظاہر اسماء میں جلوہ گر ہو کر ہر دل کو اس کے مطابق متاثر کرتا ہے، ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتا ہے، کبھی اس طرح اور کبھی اُس طرح.

سالک کو ہر حال میں، ہر جگہ پر سلوک عبادت میں گریہ کو بہت اہمیت دینی چاہیے، خصوصاً اس مقام (استغفار) میں جتنا بھی سوز دل کے ساتھ سوزش ہو اس کی قدر کرے اور جب بھی ایسی توفیق نصیب ہو جائے تو پھر تضرع ودعاء اور استغفار میں اصرار کو کسی اور چیز سے معاملہ کرے، دشمن کے فریب سے ہوشیار رہے، جو راستہ اس پر کھلا ہے کہیں وہ حیلوں بہانوں سے آپ پر بند نہ کردے، تضرع واستغفار کو قطع نہ کردے، حال کو ختم نہ کر دے. ایسے مواقع بار بار نہیں ملتے.

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

اذا امشعر جلدک و دمعت عیناک ،فدوک دونک، فقد قصد قصدک (۱) .

"جب تیرے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں تو اپنے آپ پر توجہ رکھو، شیطان تمہارا قصد کر چکا ہے"

اشلک فی بار وهمی سوز از طلب همچو شمعی سر بریده جمله شب. (۲)

---

(۱) اصول کافی، ج۲،ص ۴۷۸

(۲) دفتر پنجم، مثنوی

گریہ و سوز کے اُس طرف

عاشقوں، مشتاقوں اور خائفین کا گریہ و سوز دل کے پردے کے اس طرف تو سوز دل اور گریہ ہے، لیکن پردے کے اُس طرف سکون ولذت وخوشی وکرامت ہے۔

اس اجمال کی توضیح کلام معصومین سے پیش کرتے ہیں:

۱) سوز و گریہ اور سکون و اطمینان

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

کل عین باکیة الا ثلاثة : عین غضب عن محارم اللّٰہ و عین سهرت فی طاعة و عین بکت فی جوف اللیل من خشیة اللّٰہ. (۱)

"ہر آنکھ قیامت کے دن روئے گی سوائے تین آنکھوں کے:

۱) وہ آنکھ جو خداوند کے محارم سے بند رہے،

۲) وہ آنکھ جو ساری رات اطاعت خدا میں جاگتی رہے،

۳) وہ آنکھ جو رات کے وسط میں خوف خدا سے گریہ کرے،

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو رات کی تاریکی میں پردے کے اس طرف سوز دل اور گریہ ہے خوف خدا سے وہ پشت پردہ میں سکون واطمینان کی صورت میں ہے اور قیامت کا دن جب حقائق پس پردہ سے ظاہر ہوں تو یہ حقیقت بھی ظہور پذیر ہوگی، یعنی قیامت کے دن جو کہ حقائق کے آشکار ہونے کا دن ہے، اس دن پس پردہ حقائق ظہور پذیر ہوں گے۔

۲) سوز و گریہ اور لذت و خوشی

رسولؐ خدا نے فرمایا:

---

(۱) اصول کافی، ج۲، کتاب الدعاء

ان اللّٰہ یحب کل قلب حزین (۱)

''خداوند محزون وغمگین دل کو پسند فرماتا ہے''

خدا کے پسند کرنے کا مطلب بندے کا اس کی طرف جذب ہوتا ہے، اس لحاظ سے حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ بندے کا دل سوز و گریہ کی حالت میں پردے کے اُس طرف خداوند کی طرف جذب ہو جاتا ہے اس جذبے کی حالت میں اسے خاص لذت و خوشی حاصل ہوتی ہے.

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

ما من قطرة احب الی اللّٰہ من قطرة دموع فی سواد اللیل مخافة من اللّٰہ لا یراد بھا غیرہ. (۲)

''کوئی قطرہ بھی خداوند کو اس آنسو سے زیادہ پسند نہیں ہے جو رات کی تاریکی میں خوف خدا سے گرے اور خدا کے علاوہ اس سے کوئی اور مراد نہ ہو''

اس کے یہ معنی ہیں کہ بندہ رات کے وقت گریہ و سوز کی کیفیت میں خداوند کا محبوب ہوتا ہے یعنی پس پردہ خداوند کی طرف مجذوب ہے اور وہ ربوبی جذبات میں لذت و سرور کی کیفیتوں سے دوچار ہے.

پردے کے پیچھے ایسے ربوبی جذبے ہیں کہ جو تسلسل سے سالک کو جذب کرتے رہتے ہیں یہی جذبے ہیں جو پردہ کے اِس طرف سوز و گریہ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں. اِس طرف غم، پریشانی اور آنسو ہیں، اُس طرف جذبے یعنی خوشی شراب طہور اور لذت شہود ہے.

---

(۱) بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۱۵۷

(۲) اصول کافی، ج ۲، کتاب الدعاء

بر رہ گذرت بسہ ام از دیدہ دو صد جوی   باشد کہ تو چون سرو خرامان بہ درآیی (۱)

''تیرے راستے پر میں نے آنکھوں سے دو سرچشمے بنا دیئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ تم سرو کی طرح خراماں ہماری طرف آؤ''

اگر کسی کو اِس طرف اور اُس طرف کو مکمل طور پر دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہو، یعنی افق بالا میں برقرار رہ کر پردہ کے اِس طرف بھی دیکھے اور پردہ کے اُس طرف بھی تو اسے عجیب چیز نظر آئے گی، وہ ایک شخص کو ایک ہی وقت میں دو مختلف و متضاد حالتوں میں دیکھے گا اِس طرف (دنیاوی طرف) وہ اسے سوز گریہ واشک و نیاز کی حالت دیکھے گا اور اُس طرف (اخروی طرف) وہ اسے لذت، خوشی، شہود و شراب طہور کے ساتھ دیکھے گا عجیب بات ہے غم کا باطن خوشی ہے اور خوشی کا باطن غم ہے، گریہ کا باطن ہنسی ہے اور ہنسی کا باطن گریہ ہے.

اس سے بڑھ کر تعجب اس بات پر ہے کہ ہم اپنے طور پر سمجھتے ہیں کہ ہم نے کائنات اور اس کے رازوں کو سمجھ لیا ہے اور اس گمان غلط سے جو کرنا تھا وہ کرلیا اور سب سے بڑھ کر ہم اس بات کی طرف متوجہ بھی نہیں ہیں.

۳) سوز و گریہ اور قرب حضرت حق

امام صادق علیہ السلام نے ابو بصیر کو دعا و گریہ کے بارے میں کچھ مطالب ارشاد فرمائے. اس کے ضمن میں آپ نے اپنے والد گرامی سے یہ حدیث نقل فرمائی:

ان اقرب ما یکون العبد من الرب عز و جل وھو ساجد باک.(۲)

''بندے کی خداوند کے سب سے نزدیک حالت اس کی گریہ کے ساتھ سجدہ کرنے کی حالت ہے''

اس روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس طرف سوزِ دل کے ساتھ پیشانی خاک پر رکھنا ہے

---

(۱) حافظ

(۲) اصول کافی، ج۲، کتاب الدعاء

اور گریہ کرتا ہے جب کہ اسی حالت میں اُس طرف حضرت معبود حق کے نزدیک ہوتا ہے اور اس کے جوار میں نعمت و خوشی سے سرفراز ہوتا ہے۔

حافظ زدیده دانه اشکی همی فشان   باشد که مرغ وصل کند قصد دام ما

''حافظ اپنی آنکھ سے ایک دانہ آنسو گراؤ، ہوسکتا ہے کہ وصال کا پرندہ ہمارے دام میں آجائے''

عاشقانہ یا عاقلانہ (۱)

سوال ۲۰ : عاشورہ کے دن امام حسین علیہ السلام کے سارے کام عشق کی منزل پر تھے نہ عقل کی منزل میں، کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خلاف عقل تھے؟

جواب : انسان کے اندر صفات رذیلہ اور فضائل اخلاقی کے درمیان مسلسل چپقلش جاری ہے کہ عام طور پر اسے جہاد اکبر کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ جہاد اوسط ہے۔

جب انسان عقل کے مطابق کوئی کام کرنا چاہتا ہے اور ھویٰ و ہوس اور گناہ سے کنارہ کش ہونا چاہتا ہے یہ جہاد اوسط ہے، وہ عاقل رہنا چاہتا ہے، اس مرحلے کے بعد جہاد اکبر کی نوبت آئے گی جو کہ عقل و عشق، فلسفہ و عرفان اور معقول اور مشہور کے درمیان جہاد ہے، اس جہاد میں عقل مطالب و مفاہیم کو رسمیت دیتی ہے ان پر دلیل و برھان قائم کرتی ہے اور نتیجہ نکالتی ہے، لیکن عشق کبھی بھی مفہوم (علم حصولی) کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ خود حقیقت اور علم حضوری کا طالب ہے، وہ چاہتا ہے جسے سمجھا ہے اسے روح کے ساتھ ادراک کرے اور اس کا مشاہدہ کرے، اب عقل اور عشق کے درمیان چپقلش شروع ہوتی ہے اور اب جہاد اکبر کی ابتداء ہوتی ہے، البتہ کوئی بھی غلط نہیں ہے، دونوں حق ہیں، ایک کو حق کہیں گے اور دوسرے کو احق، ایک خوب و بہتر دوسرا بہترین و خوب تر، ایک کامل ہے،

---

(۱) یہ جواب آیت اللہ جوادی آملی سے ہے

دوسرا اکمل، اسی لحاظ سے اولیائے الٰہی کے کام عشق کی بنیاد پر ہیں.

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

افضل الناس من عشق العبادۃ(۱)

''سب سے افضل وہ شخص ہے جس نے عبادت سے عشق کیا ہو''

یعنی یہ وہ شخص ہے جس نے عبادت کا مزہ چکھ لیا ہے اور جنت وجہنم کے حقائق کو دیکھ لیا ہے.

عقل دلیل وبرھان کے ساتھ ثابت کرتی ہے کہ جنت وجہنم ہیں، جب کہ عشق کہتا ہے کہ میں جنت وجہنم کو دیکھنا چاہتا ہوں، جو شخص دلیل کے ساتھ معاد، جنت ومیزان وغیرہ پر اعتقاد پیدا کر لیتا ہے وہ عاقل ہے لیکن جو شخص جنت وجہنم کو دیکھنا چاہتا ہے وہ عاشق ہے.

سید الشہداء کے کام عاشقانہ تھے، عشق جو کہ عقل سے اوپر ہے نہ کہ عقل کے نیچے ہے، ایک دفعہ کہتے ہیں فلان کام عاقلانہ نہیں ہے بلکہ وہم وخیال کی بنیاد پر ہے، لیکن ایک وقت کہتے ہیں یہ کام نہ صرف یہ کہ عاقلانہ ہے بلکہ اس سے بڑھ کر عاشقانہ ہے یعنی جسے سمجھا اسے اپنے اندر پالیا ہے.

جب انسان ایک حقیقت کو پالیتا ہے اور عاشقانہ شہود کے مطابق آگے بڑھتا ہے وہاں عقل کا کردار نہیں ہے، لیکن اس وجہ سے کہ نور عقل سے ایک برتر نور کے تحت اشعاع قرار پاچکا ہے نہ کہ عقل کا نور بجھ چکا ہے. دو صورتوں میں عقل بے کار ہو جاتی ہے اور انسان کے کام عقل کے مطابق نہیں رہتے.

۱) جب انسان غصے (غضب) اور شہوت کا شکار ہو کر گناہ میں مبتلا ہو جائے یہاں کام عاقلانہ نہیں ہوگا بلکہ احمقانہ ہوگا، یہ ایسے ہی ہے جیسے چاند گہن کا شکار ہو جائے اور تاریک ہو جائے، اس حالت میں عقل بھی نورانیت نہیں رکھتی، گناہ گار انسان کی عقل گہن والے چاند کی مانند ہے، حضرت علی علیہ السلام نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا:

---

(۱) اصول کافی، ج۲

کم من عقل اسیر تحت ھو ی امیر (۱)

۲) عقل نورانیت رکھتی ہے لیکن کار آمد نہیں ہے، یہ اس وقت ہوگا کہ جہاں ایک قوی تر نور کے تحت اشعاع آجائے جیسا کہ ستارے دن کے وقت کار آمد نہیں رہتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نور سورج کے نور کے تحت اشعاع آجاتا ہے نہ کہ اب ان میں نورانیت نہیں رہی اگر کوئی عاشق ہو جائے تو عقل رکھتا ہے، اس کی عقل کام بھی کر رہی ہے، لیکن نور عقل نور عشق کے تحت اشعاع آچکا ہے، امام حسینؑ کے کام بھی عاشورہ کے دن اسی طرح سے تھے نہ صرف عاقلانہ تھے بلکہ اس سے بڑھ کر عاشقانہ بھی تھے.

عاشورہ کے حسین وخوبصورت پھلو

سوال ۷۱: عاشورہ کے حسین پھلو کیسے سمجھے جا سکتے ھیں اور کیسے حضرت زینبؑ کے اس کلام ﴿مارأیت الا جمیلا﴾ کا ادراک کیا جاسکتا ھے؟

جواب: کہا جاتا ہے کہ بعض دفعہ دیکھنے والی آنکھ میں عظمت ہوتی ہے نہ کہ اس چیز میں جسے وہ دیکھ رہی ہے، اس طرح بھی خوبصورتی انسان کی نگاہ میں ہوتی ہے نہ ان چیزوں میں جنہیں انسان دیکھتا ہے، جو نظام احسن کی آنکھ سے ہر چیز کو دیکھتا ہے، اسے ہر چیز خوبصورت نظر آتی ہے، جس عینک سے آپ ہستی اور واقعات کو دیکھ رہے اس طرح ہی وہ آپ کو نظر آئیں گے.

کائنات اور زندگی کو خوبصورت دیکھنے سے روح وضمیر کو بھی سکون ملتا ہے، ان میں پائیداری و پامردی بھی پیدا ہوتی ہے اور ان میں مشکلات کو برداشت کرنے کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے. اس نظر سے عاشورہ جیسا کہ حضرت زینبؑ نے فرمایا سوائے خوبصورت و جمال کے کچھ نہیں تھا، بی بی زینبؑ نے دشمن کے طعنہ کے جواب میں جو ''مارأیــت الا

---

(۱) اصول کافی، ج۲

جمیلا (۱) فرمایا، آپ سے پہلے حسینؑ بن علی اس سفر کی ابتداء میں اس کی امید کر چکے تھے کہ امید ہے جو ہمیں پیش آرہا ہے اور جو کچھ خداوند نے ارادہ فرمایا ہے وہ خیر ہو آپ کے لئے اور آپ کے ساتھیوں کے لئے چاہے فتح کی صورت میں ہو یا شہادت کی صورت میں فرمایا:

نرجوان یکون خیراً ماارادالله بنا قتلنا ام ظفرنا (۲)

بہن کا خوبصورت دیکھنا اور بھائی کا خیر دیکھنا ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں.

کربلا میں حسن وجمال اور خوبصورتی کے مظاہر ومناظر بہت زیادہ ہیں ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں.

۱) تجلی کمال آدم

انسان کہاں تک بلند ہوسکتا ہے، کس حد تک خدائی اور فانی ہوسکتا ہے، یہ میدان عمل میں روشن ہوتا ہے، کربلاء میں پتہ چلتا ہے کہ انسان کی عظمت، بلندی، روحی کمال وعظمت وجود، کمال جوئی اور کمال یابی کہاں تک جاسکتی ہے، اس دلیرانہ معرکہ کی تاریخ کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ:

تاچہ حد است مقام آدمیت آدمی کا مقام ومرتبہ کتنا عظیم ہے

یہ نکتہ خوبصورتیوں اور اقدار کی کھوج کرنے والوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے.

۲) قضائے خدا پر رضا کا جلوہ

عرفانی سیر وسلوک کے مراحل میں مقام رضا پر پہنچنا بہت مشکل اور دشوار ہے، اگر ثانی زہراء واقعہ کربلا کو خوبصورت دیکھتی ہیں تو اس خاطر کہ سید الشہداء اور ان کے ساتھیوں کے عمل میں اس عظیم منزل کا ظہور نظر آتا ہے.

---

(۱) بحار، ج۴۵، ص۱۱۶

(۲) اعیان الشیعہ، ج۱، ص۵۹۷

یہ سچ ہے کہ جس معاشرے میں کوئی درد کے بارے میں سوچتا ہے اور کوئی اس کے درمان کے بارے، لیکن سید الشہداء اسے پسند کرتے ہیں جو جان جاناں کو پسند تھا، کربلا و قضائے خدا پر انسان کی رضا کا مرکز تجلی ہے، آپ زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے مقتل میں فرماتے ہیں: الھی رضاً بقضائک بہن نے بھی یہی کہا تھا: ارضی بقضاء اللہ ''میں قضائے خدا پر راضی ہوں'' عرفان کی یہ منزل کہ جہاں سالک اپنے آپ کو کچھ نہ دیکھے صرف خدا کو دیکھے اور خداوند کی پسند کے مقابل کوئی پسند نہ رکھتا ہو، سید الشہداء نے مکہ سے کوفہ کی طرف سفر شروع کرتے وقت بھی ایک خطبہ میں فرمایا تھا:

رضا اللہ رضانا اھل البیت(۱)

''ہم اہل بیت کی پسند بھی وہی ہے جو ہمارے خدا کی پسند ہے''

یہ حسین علیہ السلام کے ایثار اور عشق کی منزل ہے اور ثانی زہراؑ اسے خوبصورت دیکھتی ہیں اور اس انداز فکر کو سراہتی ہیں۔

آن روز کہ جان خود فدا می کردیم   با خون بہ حسین اقتدا می کردیم
چون منطق ما منطق عاشورا بود   با نفی (خود) اثبات (خدا) می کردیم (۲)

''جس دن ہم جان فدا کر رہے تھے، اپنے خون کے ساتھ حسین کی اقتداء کر رہے تھے، چونکہ ہماری سوچ عاشورائی تھی، ہم اپنی نفی کے ساتھ خدا کے وجود کو ثابت کر رہے تھے''

۳) حق و باطل کا رسم الخط

عاشورہ کی خوبصورتیوں میں سے ایک اور خوبصورتی حق و باطل کے درمیان لکیر کا کھینچنا تھا تاکہ شیطان صفت انسان اور فرشتہ خو انسان کے کردار جدا جدا ہو جائیں۔

جب نیکی و بدی اور حق و باطل مل جاتے ہیں تو باطل کی تاریکی حق کے چہرے کو

---

(۱) موسوعۃ کلمات الامام الحسین، ص ۳۲۸

(۲) از نویسندہ

ڈھانپ لیتی ہے، اس طرح کی تاریک آبادی میں لوگوں کے افکار و نظریات میں انحراف ایک قدرتی سی بات ہے، کفر نقاب کے ساتھ ہو تو عام سادہ لوح مسلمان اشتباہ کا شکار ہو سکتے ہیں.

امام حسینؑ کے کام کی خوبصورتی یہ تھی کہ آپ نے چراغ جلادیا تا کہ روشن تاریکیوں کو ختم کردے اور جھوٹ وفریب واضح ہو کر پہچانے جائیں اور فریب ونقاب کا اب کوئی اثر باقی نہ رہے، کیا یہ خوبصورت ترین نہیں ہے؟

عاشورہ ایک طرز تحریر تھا، ایسا روشن خط جس نے حق و باطل کو جدا کر دیا، جس نے خالص مسلمان کی مسلمان نما مدعی اسلام سے الگ پہچان کروادی، رحمان کے پیروکار شیطان کے چیلوں سے الگ تھلگ نظر آنے لگے، حق آشکار ہو کر باطل کے مقابل آ گیا، باطل بھی ظاہر و بے نقاب ہو کر کربلا میں لشکر لے آیا تھا، دھوکے کے لئے "یا خیل اللّٰہ ارکبی" کے نعرے لگا رہا تھا، اگر کسی کو حق کی پہچان میں کمی رہ گئی تھی تو ثانی زہراء کے کوفہ و شام میں خطبوں نے وہ بھی ختم کردی، یہ کربلا کے خونی واقعہ کی اہم ترین خوبصورتی ہے.

۴) خالص فتح کا ظہور

عاشورہ کی ایک خوبصورتی فتح کا نیا مفہوم ہے، بعض لوگ غلطی سے کامیابی و فتح صرف ظاہری جنگ کی کامیابی میں سمجھتے تھے اور مظلومیت و شہادت کو شکست سمجھتے تھے، عاشورہ نے ثابت کردیا کہ اوج مظلومیت میں بھی فاتح ہوا جا سکتا ہے اور قتل ہو کر بھی فتح و کامیابی کی تحریر لکھی جا سکتی ہے، خون کے ساتھ بھی ظفر و فتح مندی کے جھنڈے گاڑے جا سکتے ہیں. پس کربلا کی جنگ میں فاتح حسینؑ بن علیؑ تھے کیا خوبصورت فتح ہے. اسے تلوار پر خون کی فتح "پیروزیٔ خون بر شمشیر" کہتے ہیں. امام خمینیؒ اس کی طرف اشارہ فرماتے رہے کہ:

ملتی کہ شہادت برای او سعادت پیروز است

ما در کشته شدن و کشتن پیروزیم .(۱)

"جس قوم کے لئے شہادت سعادت ہو، وہی ملت کامیاب ہے، ہم قتل ہوں یا قتل کریں، ہم ہی کامیاب ہیں"

یہ وہی قرآن کی تعلیم ہے کہ جسے "احدی الحسنین" کہا گیا ہے یہ انہی جنگجوؤں کا شعار ہوتا ہے جنہیں دو اچھائیوں میں سے کوئی ایک مل جائے شہادت یا مخالف کو مارنا، جس شخص نے اپنے وظیفہ وشرعی ذمہ داری پر عمل کیا ہو وہ ہر حالت میں کامیاب ہے وہ بھی خالص کامیابی.

گرچہ از داغ لالہ می سوزیم ما ھمان سر بلند دیروزیم

چون بہ تکلیف خود عمل کردیم روز فتح و شکست پیروزیم (۱)

یہ منطق اور فکر سید الشہداء کی تھی، ثانی زہراءؑ کی تھی اور امام زین العابدینؑ کی تھی، چونکہ ان تلخ حوادث کا نتیجہ اسلام اور حق کے لئے مفید تھا اس لئے جمیل وشیریں تھا، جب ابراہیم بن طلحہ نے امام زین العابدینؑ سے پوچھا، فتح کس کی ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا، جب نماز کے وقت اذان واقامہ کہی جائے گی تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ فتح کسے حاصل ہوئی.(۲) کیا یہ چیز واقعہ کربلا میں خوبصورت وحسین نہیں ہے؟ یعنی قتل ہو کر بھی کامیاب ہو جانا.

۵) مشیت خدا کے راستے پر چلنا

سب سے خوبصورت جلوہ یہ ہے کہ انسان ایک حادثہ وواقعہ کو مشیت خدا اور مرضی خدا کے مطابق دیکھے، اگر حسینؑ بن علیؑ اور آپ کے ساتھی بستر خون پر سو گئے یا رسولؐ کے گھر والے قید ہو گئے تو یہ بات مشیت خدا میں لکھی جا چکی تھی اور اس سے بڑھ کر خوبصورتی اور کیا ہوگی کہ انسان کا کام مشیت خدا کے دفتر سے ہم آہنگ ہو جائے.

---

(۱) صحیفہ نور، ج ۱۳، ص ۶۵

(۲) از نویسندہ

(۳) امالی، شیخ طوسی، ص ۲۶

حسینؑ بن علی علیہ السلام کو ھاتف غیبی نے کہا تھا کہ خدا کی مشیت وارادہ یہی ہے کہ تو اس کی راہ میں شہید ہو جائے ان اللہ شاء ان یراک قتیلا اور یہ بھی مشیت خدا ہی تھی کہ دین اور انسان کی نجات و آزادی کے لئے عترت رسولؐ خدا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرے. ان اللــه شــاء ان یراھن سبایا یہ دونوں کام دین کی بقاء اور طاغوت کو رسوا کرنے کے لئے ضروری تھے وہ بھی عشق وصبر اور دلیری کے ساتھ.

زینب عالیہ جو کہ دامن وحی اور مکتب علی علیہ السلام کی تربیت شدہ تھیں، ان کے لئے مشیت الٰہی کے مطابق یہ سفر ونہضت انتہائی اعلیٰ اقدار وحسن کا مظہر تھی، آپ اس نہضت کو آغاز سے انجام تک خوبصورت وجمیل دیکھتی ہیں کیونکہ آپ کو اس سفر کا قدم قدم مشیت الٰہی کے مطابق نظر آرہا تھا، عاشورہ پر اس طرح نظر کرنا کیا خوبصورت نہیں؟

۶) شب قدر عاشورہ

یہ منظر عاشورہ کے روشن ترین جلووں میں سے ایک خوبصورت جلوہ ہے، جو جانے یا نہ جانے کے حوالے سے تردّد کا شکار ہو کر جانے کو ایثار و وفا کے عنوان سے انتخاب کرلیں اور حسینؑ کے بغیر زندگی کو ذلت وموت شمار کرتے ہیں.

شب عاشورہ امام حسینؑ کا خطبہ اور جانے کی اجازت دینا، ساتھیوں کی گفتگو، امام کا شہزادہ قاسم سے سوال، اصحاب کی سحر تک شب بیداری، تلاوت قرآن اور دعا و مناجات کی آوازیں اور اصحاب کا ثانی زہراء کے خیمے کے باہر آکر وفاداری کا اعلان، ان میں سے ہر ایک اس خوبصورت کتاب کا سنہری ورق ہے، پھر کیوں سیدہ زینب سلام اللہ علیہا عاشورہ کو خوبصورت نہ سمجھے.

جو کچھ کربلاء میں ہوا وہ قیامت تک کے لئے روئے زمین پر ہر جگہ ظلم کے ساتھ مقابلے کی اساس وبنیاد بن گیا، کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟

عاشورہ کا ہر ہر لحظہ ایک مکتب بن گیا جو انسان کو آزادی، وفا، ایثار، مردانگی،

ایمان، شجاعت، شہادت اور، بصیرت کا درس دیتا ہے، کیا یہ خوبصورت نہیں؟ اس صحرا کی ریت پر جو پاک خون گرے یہ ایک سیلاب بن گئے جنہوں نے کاخ ظلم کی بنیادوں کو نابود کردیا، کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟

هر بساطی را که عمری شاهان گسترده بود   نیم روزی این حسین بن علی بر چید و رفت

"شامیوں نے جو بساط بچھانے میں ایک عمر لگا دی تھی، حسینؑ
بن علیؑ نے آدھے دن میں لپیٹ دی"

کوفہ وشام کے حادثے ایجاد کرنے والوں نے سمجھا کہ حسینؑ واصحاب حسینؑ کے قتل سے ان کی بنیادیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جائیں گی، لیکن ثانی زہراء کی گہری نگاہ میں انہوں نے اپنی قبریں کھودیں تھیں، اہل بیتؑ کے نورانی چہرے اور روشن ہو گئے، ان کا نام زندہ وجاوید ہو گیا، دین خدا کو زندگی مل گئی اور کربلا ایک دانش گاہ بن گئی، ثانی زہراء اس سب سے واقف تھیں آپ نے یہ نتیجہ صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا، یہی وجہ تھی کہ والی کوفہ نے جب زخم زبان لگاتے ہوئے طعنہ زنی کی کہ اے بنت علیؑ تو نے دیکھ لیا خدا نے تمہارے بھائی اور تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کیا" تو آپؑ نے فرمایا ما رایت الا جمیلا میں نے سوائے خوبصورتی کے اور کچھ نہیں دیکھا۔

عاشورہ کے اخلاقی و عرفانی پہلو

سوال ۶۲ : نہضت امام حسینؑ کے اخلاقی اور عرفانی پہلوؤں کی وضاحت کریں؟

جواب : آسمان کربلا کے ستاروں کی طرح کسی اور آسمان کے ستاروں نے ایسی عظمت وفضیلت نہیں دیکھی ہوگی، سورج جتنا مرژد، بے رنگ اور لرزیدہ عاشورہ کے دن تھا اتنا کسی اور دن نہ ہوا ہوگا، روئے زمین کے کسی نقطے پر اس طرح خوبصورتی وبدصورتی ساتھ ساتھ نظر نہ آئی ہوگی جیسے نینوا میں دیکھی گئی، تاریخ انسانی کے کسی حادثے میں انسان وانسانیت

کے لئے اس طرح کا پیغام نہیں ہوگا، جیسا پیغام واقعہ عاشورہ میں تھا۔

میدان کربلا میں توحید پھر زندہ ہوئی، عشق کے معنی معلوم ہو گئے، قرآن کو حیات نوملی، فرشتوں کے سجدۂ آدم کے راز سے پردہ اٹھ گیا، اور ایک جملے میں خداوند کی اپنے تمام جلال وجمال کے ساتھ تجلی ہوئی۔

عباس علیہ السلام نے نہر علقمہ کے کنارے تشنہ لبوں کے ساتھ، معرفت، غیرت، حریت، وفا اور ایثار کے چشمے تا ابد حقیقت طلب دلوں کی خشک زمین پر جاری کر دیئے۔

کربلا کے گرم اور خونی صحرا کے علمدار کا علم قیامت تک باطل کے خلاف حق کی اور بدصورتی ورذیلت کے خلاف خوبصورتی وفضیلت کی فتح وکامرانی کا نشان بن کر لہراتا رہے گا، کربلا مکمل طور پر انسان سازی اور معیار معرفت کا مکتب ہے۔

کسی دانش گاہ سے اس طرح کامیاب وکامران افراد نہیں نکلے جتنے دانش گاہ کربلا سے نکلے، کسی مکتب میں اتنے مختلف شعبوں کے طلبہ نہیں ہوں گے جتنے کربلا کے مکتب میں ہیں، یہاں معرفت، عشق، عظمت، ہدف کے راستے میں استقامت، صبر، شجاعت اور خالص عبودیت کی کلاسوں میں پیروجوان، زن ومرد، طفل وشیر خوار اور غلام سیاہ سب ہی ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں اور شہادت کے عظیم معلم سے درس لیتے نظر آتے ہیں، وہ متعلمین ان سخت تعلیمات اور مشکل امتحانات سے اس طرح سربلند اور سرخرو ہو کر نکلے کہ ان کے نام ان کے پاک امام کے نام کے ساتھ جریدہ عالم پر لکھے گئے ہیں اور وہ زیارت ناحیہ میں امام زمان کے سلام ودرود کے مستحق ٹھہرے۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق　　ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

عاشورہ کا ہر لحظہ معرفت، فضیلت اور اخلاق کے عطر سے معطر ہے اور سرزمین کربلا کا چپہ چپہ حق کے سامنے روح بندگی وتسلیم کی گواہی دے رہا ہے۔

کربلا کے جاوید حماسہ کا ورق ورق عظمت، عزت، عبودیت اور افتخار کے خطوط

سے لکھا گیا ہے۔ اس دفتر کے ورق ورق اور سطر سطر کا مطالعہ تو ہماری اس گفتگو میں نہیں سما سکتا ہم صرف اس کے بعض درخشاں اوراق ہی کھول سکیں گے۔

پہلا: امام حسینؑ کے اخلاق، عظمت اور معرفت کی ایک جھلک

اپنے کردار اور گفتار کے ذریعے توحید کی دعوت ہی تمام الٰہی معارف کا محور اور تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد رہی ہے اور امام حسینؑ کے قیام کے تمام مراحل ابتداء سے انتہاء تک توحید کے محور پر گھومتے نظر آتے ہیں، اول سے آخر تک آپ کا کوئی لحظہ یاد خدا اور ذکر خدا سے خالی نظر نہیں آتا، مکہ سے عراق کی طرف سفر اختیار کرتے وقت آپ نے پہلی بات ہی یہ فرمائی ''الحمد لله وما شاء الله لا حول ولا قوة الا بالله'' اور آپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں جب آپ زخمی بدن کے ساتھ پیاسے زمین پر گرے تو آسمان کی طرف نظر کی اور عرض کیا:

"صبرا علی بقضائک یا رب لا معبود سواک یاغیاث المستغثین(۱)

''خدایا تجھ سے تیری قضاء پر صبر کا طلب گار رہوں تیرے علاوہ
کوئی معبود نہیں ہے اے پناہ طلب کرنے والوں کی پناہ''

دوسرا: شرعی ذمہ داری نبھانا اور انسانی اعلیٰ اقدار کی مضبوطی

جو شخص بھی میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے اور دشمن کے مقابل کھڑا ہوتا ہے اس کا مقصد اپنی کامیابی اور دشمن کی شکست ہوتا ہے، امام حسینؑ کا بھی یہی مقصد تھا لیکن شکست اور کامیابی آپ کی نظر میں ایک الگ مفہوم رکھتی ہے جس کا بعض لوگوں کے لئے سمجھنا مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے ایک چاہنے والے طرماح بن عدی نے ایک منزل میں آپ سے ملاقات کی اور آپ نے اس سے کوفہ کے حالات پوچھے تو اس نے جواب دیا کوفہ کے بڑے بڑے سردار اور قبائل کے رؤسا و سربراہ ابن زیاد سے بھاری رشوتیں لے

---

(۱) علی سعادت پرور، فروغ شہادت، ص۱۸۵

کر اس کے ساتھ مل چکے ہیں اور لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں، یا بن رسول اللہ آپ کو خدا کا واسطہ اس سفر سے واپس ہو جائیں، آپ قبیلہ بنی طے کی طرف چلے جائیں کہ وہ بڑی پر امن اور دشمن کی پہنچ سے دور جگہ ہے. آپ نے طرماح کو شرعی ذمہ داری اور انسانی اقدار کی مضبوطی من جملہ عہد و پیمان کی وفاداری جیسے اہم نکات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے اور اہل کوفہ کے درمیان عہد و پیمان ہوا ہے جس کی وجہ سے میرا لوٹنا ناممکن ہے دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے"

یعنی میں نے کوفہ جا کر لوگوں کی دینی رہنمائی و رہبریت کا ان سے وعدہ کر لیا ہے اور انہوں نے بھی ہماری ہر طرح کی مدد کا وعدہ کر لیا ہے، اب میری ذمہ داری ہے کہ میں اپنا وعدہ پورا کروں اگرچہ اس راہ میں ہر طرح کے خطرات سے دو چار ہونا پڑے، چاہے کوفہ والے اپنے عہد و پیمان کا پاس کریں یا نہ کریں.(۱)

امام حسین علیہ السلام کی ہمدردی

سوال ۶۳: جب امام حسین علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ دشمن ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا پھر بھی آخری سانس تک آپ انہیں نصیحت کیوں فرماتے رہے اور ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیوں کرتے رہے؟

جواب: خدا کی مخلوق پر شفقت اور ہمدردی انبیائے الٰہی اور اولیاء خدا کی واضح خصوصیات میں سے ہے، آیات قرآن اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیاء کے لئے لوگوں کی گمراہی ناقابل تصور حد تک تکلیف دہ تھی اور وہ لوگوں سے اظہار ہمدردی کرتے رہتے تھے، وہ جب یہ صورت حال دیکھتے کہ پیاسے آب گوارا کے چشموں کے

---

(۱) نجمی محمد صادق، سخنان حسین بن علی از مدینہ تا کربلا

کنارے پر بیٹھ کر پیاس سے بلبلا رہے ہیں تو اس سے تکلیف محسوس کرتے اور آنسو بہاتے اوران کی ہدایت کے لئے دعا کرتے ۔لوگوں کا راہ حق وصراط مستقیم سے منحرف ہو کر کفرو باطل کے راستوں پر چل نکلنا ان کے دلوں پر بے پناہ تکلیف کا باعث تھا، رسول اکرم کی لطیف روح پر بھی لوگوں کی گمراہی و نادانی سے اس حد تک دباؤ پڑتا کہ غم کی شدت کی وجہ سے آپ کی جان خطرے میں پڑجاتی خداوند آپ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرماتا:

لعلک باخع نفسک الا یکونو ا مو منین(۱)

"آپ اپنی جان ہار دیں گے اس پر کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے"

جب تک آسمانی رہبروں میں یہ خصوصیت موجود نہ ہو، رہبریت کا عمیق مفہوم پیدا نہیں ہوسکتا.

امام حسین علیہ السلام بھی اسی شجر رسالت کا ثمر تھے، آپ رسولؐ خدا کے فرزند اور جزو وجود تھے، آپ رسولؐ سے تھے اور رسول آپ سے تھے، جیسا کہ ﴿حسین منی و انا من حسین﴾ خود رسولؐ خدا نے فرمایا .(۲)

حسین تمام کمالات رسولؐ کے وارث تھے اور آپ کے عالی فضائل کا آئینہ تمام نما تھے، رسول خدا کی رحمت وعطوفت کے سرچشمے وجود حسینؑ سے ہی پھوٹ رہے تھے یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ اپنی پوری عمر بالخصوص اپنی پوری نہضت کے دوران مسلسل لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے رہے، حتیٰ کہ دشمنوں کو بھی ہدایت کرتے رہے.

عاشورہ کے دن جب دشمن کا آپ سے آمنا سامنا ہوا آپ باوجود اس کے کہ دیکھ رہے تھے کہ دشمن مکمل طور پر جنگ پر تیار ہو چکا ہے، اس نے آپ کے خیام پر پانی تک بند کر رکھا ہے اور وہ آپ پر حملہ کرنے کے لئے لحظہ شماری کر رہا ہے، آپ نے پھر بھی دشمن کو نصیحت کرنے اور بیدار کرنے کی آخری وقت تک کوشش کی، وقت نہ ہونے کے باوجود اور

---

(۱) شعراء /۳، کہف /۶

(۲) کامل الزیارات، باب ۱۴، ح ۱۱

دشمن کے لشکر کے اس شور شرابے میں آپ نے ایک مفصل خطبہ ارشاد فرمایا جس کے ہر جملے کو شرح وسیط کی ضرورت ہے جس میں دشمن کی خیانت وعناد کی جڑیں بیان کی گئی ہیں.(۱)

امام حسینؑ نے تو دشمن کے لشکر کے سپہ سالاروں عمر سعد اور شمر ذی الجوشن کو بھی وعظ و نصیحت کرنے کا فریضہ ادا کیا، عاشورہ کے دن آپ نے دو لشکروں کے درمیان جب عمر سعد سے ملاقات کی تو فرمایا:

> ''تجھ پر افسوس ہے اے ابن سعد کیا اس خدا سے ڈرتے ہو جس کی طرف تمہیں لوٹ کے جانا ہے اور جب کہ تم یہ بھی جانتے ہو میں کس کا بیٹا ہوں، مجھ سے جنگ کرتے ہو، ان کو چھوڑ کر میرا ساتھ دو تا کہ تمہیں خدا کا قرب نصیب ہو، تو عمر سعد نے جواب میں کہا میں ڈرتا ہوں کہ وہ میرا گھر خراب کر دیں گے، حضرت نے فرمایا میں تمہیں گھر بنا دوں گا، عمر سعد نے کہا مجھے خوف ہے کہ وہ میرا مال ومتاع چھین لیں گے، امام پاک نے فرمایا، میں حجاز میں تمہیں اس سے زیادہ مال دوں گا، عمر سعد نے کہا مجھے اپنے بال بچوں کی جان کا خطرہ ہے، تو امام پاکؑ خاموش ہو گئے اور اسے کوئی جواب نہ دیا''

واضح ہے سید الشہداء کی اس ساری گفتگو میں آپ کا مقصد یہی تھا کہ ایک بدنصیب جو اپنے آپ کو یزید وابن زیاد کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہے اور حسینؑ کے قتل سے جہنم کے دائمی عذاب سے دوچار ہونے والا ہے نجات پا جائے، اس گفتگو اور نصیحت سے امام حسینؑ کے دو مقاصد تھے:

۱) دشمن پر اتمام حجت، تا کہ ان کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے،

---

(۱) سخنان امام حسین علیہ السلام از مدینہ تا کربلا، ص۲۱۹

۲) بعض افراد کو بیدار کرنا جیسا کہ حر بن یزید ریاحی تھے کہ جن کے دل میں ایمان اور محبت اہل بیتؑ کی روشنی موجود تھی،

آپ کی اس نصیحت آمیز گفتگو نے لشکر دشمن میں سے بعض افراد کے دلوں پر اثر بھی کیا اور ان میں سے بعض امام حسینؑ کے ساتھ آکر شامل ہو گئے اور ابدی سعادت و شرف ان کے شامل حال ہو گیا۔

ایک گناہ گار، سنگ دل اور بے رحم دشمن کے مقابل اسی طرح کی محبت و شفقت الٰہی رہبر کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ فرزند زہراء کی روش تھی کہ جو راستہ خداوند نے آپ کے لئے معین فرما دیا تھا، سخت ترین حالات میں بھی آپ بال برابر بھی اس سے الگ نہیں ہوئے۔

عاشورہ کی نماز

سوال ۶۴: عاشورہ کے دن دشمن کے لشکر کے سامنے امام حسینؑ کو ظہر کی نماز ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جس کی وجہ سے آپ کے بعض ساتھی شہید ہو گئے؟

جواب: نماز دین کا ستون ہے (۱) اور عبد و مولیٰ کے درمیان مضبوط ترین تعلق ہے، مومن کی پہچان نماز سے ہوتی ہے، نماز کی سیڑھی کے ذریعے عبد اوپر چڑھتا ہے اور بساط قرب الٰہی پر قدم رکھتا ہے۔ (۲)

نماز خدا کے ساتھ انس اور رسولؐ خدا کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، (۳)

نماز انبیائے الٰہی کی پہلی اور آخری وصیت تھی، (۴)

---

(۱) میزان الحکمۃ، ج ۵، ص ۳۶۸ حدیث ۱۰۲۳۳

(۲) حوالہ سابق، حدیث ۱۰۲۳۸

(۳) حوالہ سابق، ص ۳۶۷، حدیث ۱۰۲۳۵

(۴) حوالہ سابق، ح ۱۰۲۳۴

نماز ہی برائی اور گناہ سے روکنے والی ہے،(۱)

حتیٰ کہ ناقص ترین نماز بھی انسان اور گناہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے،(۲)

معاویہ بن وہب امام صادق علیہ السلام کے صحابی ہیں وہ آپؑ سے سوال کرتے ہیں وہ کون سی چیز ہے جو بندوں کو سب سے زیادہ خدا کے نزدیک کرتی ہے اور سب سے زیادہ خدا کو محبوب ہے؟

تو آپ نے فرمایا:

ما اعلم شیئا بعد المعرفة افضل من هذه الصلاة(۳)

''خدا کی معرفت کے بعد نماز سے زیادہ میں کسی چیز کو افضل نہیں سمجھتا''

امام حسین علیہ السلام کی یہ نہضت حق کے قائم کرنے، دین خدا کے زندہ کرنے اور اسے ظالموں، خواہشات پرستوں اور خرافات کا شکار افراد کے پنجوں سے نجات دلانے کی خاطر تھی۔

جب نماز دین کا ستون ہے تو پھر دین و شریعت محمدی کا محافظ و نگہبان کربلا کے خونی معرکے کے دوران دشمن کی مسلسل یلغار کے سامنے اس دین کے ستون کو نماز عشق پڑھ کر کیوں نہ محکم و استوار کرے؟ ابو ثمامہ صیداوی جو کہ اپنے مولا کی محبت میں جان کی پروا نہیں کرتے، ظہر عاشورہ کو دشمن کے شدید محاصرے کے دوران اپنے مولا سے عرض کرتے ہیں کہ مولا نماز ظہر کا وقت ہو چکا ہے اور خواہش کرتا ہوں کہ زندگی کی یہ آخری نماز اپنے امام کی اقتداء میں پڑھ کر اپنے معبود کے حضور حاضری دوں، امام حسینؑ اس کے جواب

(۱) عنکبوت /۴۵

(۲) میزان الحکمة، ج۵ص ۳۷۱ حدیث ۱۰۲۵۴

(۳) حوالہ سابق، ص ۳۶۹ حدیث ۱۰۲۴۵

میں فرماتے ہیں تم نے نماز کا وقت مجھے بتلایا ہے خداوند تجھے نمازیوں میں قرار دے.(۱)

امام حسینؑ نے معرکے کے دوران اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے تیروں کے سامنے نماز ظہر ادا کی، بعض اصحاب نماز کے دوران ہی زخمی ہو کر گرے اور شہید ہو گئے.

سید الشہداء اور آپ کے ساتھیوں کی شب عاشورہ عبادت و مناجات اور تلاوت قرآن کی آوازوں نے بندگی کا وہ خوبصورت منظر پیش کیا کہ جس کی مثال نہیں ملتی.

امام حسینؑ نے نماز سے عشق و محبت اور معبود کے ساتھ راز و نیاز کو اپنے پدر بزرگوار سے میراث میں پایا، ابن عباس نے جنگ صفین کے سخت ترین لحات میں حضرت امیرؑ کو دیکھا کہ آپ آسمان کی طرف بار بار دیکھتے ہیں، سوال کیا مولا کسی چیز کا انتظار ہے؟ فرمایا میں نماز کے وقت کا منتظر ہوں، ابن عباس نے عرض کیا مولا اس وقت ہم جنگ چھوڑ کر کیسے نماز کے لئے کھڑے ہو سکتے ہیں، تو مولا نے فرمایا:

انما قاتلنا هم علی الصلوة

''ہماری ان شامیوں کے ساتھ جنگ ہی نماز کی خاطر ہے''

اب آپ ذرا غور کریں جب ہمارے پیشوا جنگ و جہاد کے میدان میں بھی نماز کو اس طرح اہمیت دیتے ہیں تو ہم گھروں میں بیٹھ کر نماز کے بارے میں سستی و کاہلی کا مظاہرہ کریں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بات عقل میں کیسے سما سکتی ہے کہ ہم ان پاکیزہ ہستیوں کے ساتھ عشق و محبت کا اظہار کریں اور خود کو ان کا پیرو، تابع اور مطیع شمار کریں اور پھر نماز کے بجالانے سے پہلوتہی کریں، جو ان ذوات مقدسہ کے لئے مقصد حیات رہی اور جنگ کے میدانوں میں بھی اس کی اہمیت لوگوں کو بتلاتے رہے اور اسے وجہ جنگ ارشاد فرماتے رہے.

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۵، ص۲۱

اپنے آپ سے سوال کریں کہ نماز اور خدا کے ساتھ راز و نیاز میں ایسی کون سی لذت اور راز پنہاں ہے کہ امام حسین علیہ السلام کہ جنہوں نے دشمن کی یہ حسرت پوری نہ ہونے دی کہ آپ ان کے سامنے جھک جائیں اور مشہور جملہ "هيهات منا الذلة" ارشاد فرمایا جو رہتی دنیا تک جبینِ وقت پر لکھا ہے اور آزادی پسند افراد کو درس آزادی و انقلاب دے رہا ہے، ۹ محرم کی عصر کو جب دشمن کا لشکر خیام حسینی کی طرف بڑھا تو آپ نے اپنے بھائی عباس سے فرمایا:

''ان سے کل تک جنگ موخر کرنے کا کہیں''

لعلنا نصلی لربنا وندعوه ونستغفره ، فهو يعلم انی كنت احب الصلاة و تلاوة كتابه و كثرة الدعاء والاستغفار(۱)

''آج کی رات ہم خدا کی بارگاہ میں عبادت، دعا واستغفار میں گذارنا چاہتے ہیں، میرا پروردگار جانتا ہے کہ میں اس کے حضور نماز، تلاوت قرآن، دعا اور استغفار کو کتنا پسند کرتا ہوں''

خداوند کے حضور نماز اور راز و نیاز میں کیسی لذت تھی کہ سید الشہداء اس کی خاطر دشمن سے جنگ موخر کرنے کا سوال کرتے ہیں.

کربلا میں ظلم کی جڑیں (عوامل)

سوال ۶۵ : کربلا میں جو ظلم و ستم ہوا، خود سید الشہداء نے اس بارے میں کیا فرمایا؟ کیوں کہ اس کی جو وجوہ آپ بیان فرمائیں گے وہی حقیقت و واقعیت ہوں گی؟

جواب : انسانوں میں ظلم وستم اور درندگی، قساوت قلبی اور سنگ دلی سے پیدا ہوتی ہے، قساوت قلبی و سنگ دلی کے کئی عوامل ہیں لیکن ان میں سے سب سے زیادہ تاثیر حرام غذا کی

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۹۲

ہے، دل کی موت، فطرت الٰہی پر حجابوں کا طاری ہو جانا، حق کی طرف میلان پیدا نہ ہونا اور خدا و اولیاء الٰہی سے دشمنی و عناد، حرام خوری کے ہی ثمرات میں سے ہے اور دین اسلام میں عبادت کا مفہوم اس حد تک وسیع ہے کہ حرام کھانے سے پرہیز کو بہت بڑی عبادت شمار کیا گیا ہے۔ اس کے مقابل حرام کھانے کو بہت بڑا گناہ شمار کیا گیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

ما عبادة افضل عندا للّٰہ من عفة بطن وفرج

''پیٹ اور شرم گاہ کو حرام سے بچانے سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے''(۱)

ایک اور وجہ جو کہ حرام خوری ہی سے پیدا ہوتی ہے، حق و باطل میں تمیز کو کھو دینا ہے۔ اسے قرآن کریم اور ارشادات معصومینؑ میں دلوں پر مہر لگنے سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے نتائج میں سے باطل پر اصرار، حق کے مقابل ہٹ دھرمی، ظلم و ستم اور کفر جیسے امور ہیں، امام حسینؑ نے عاشورہ کے دن کہ جب لشکر انہیں نگینے کی طرح گھیر چکا تھا ایک خطبے میں انہی دو عوامل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

فمن اطاعنی کان من المرشدین ومن عصانی کان من المهلکین کلکم عاص امری غیر مستمع قولی، فقد ملئت بطونکم من الحرام و طبع علی قلوبکم.

''جو میری اطاعت کرے گا وہ ہدایت یافتہ ہے اور جو میری مخالفت کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، لیکن تم سب میری مخالفت کرو گے اور میری بات پر توجہ نہیں کرو گے کیونکہ تمہارے پیٹ حرام سے بھر چکے ہیں اور تمہارے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، افسوس ہے تم پر کیوں خاموش ہو کر سنتے نہیں ہو''(۲)

---

(۱) وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۹۷، باب ۲۲

(۲) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۸

تیسرا عامل جو کہ تمام انحرافات کی اصلی ترین وجہ ہے خداوند سے غفلت اور حق کو بھلا دینا ہے، ذکر خدا ہر کمال وسعادت کا سرچشمہ ہے جب انسان یاد خدا میں ہے تو اس کی مثال اس قطرہ کی سی ہے جو عظمت، کمال اور خوبصورتی کے بحر بیکران سے متصل ہو چکا ہے، وجود کے تنگ حصار سے نکل چکا ہے اور نمود وصفاء کی بے کراں فضاؤں میں پرواز کر رہا ہے اور غفلت کی حالت میں اس کی مثال اس گڑھے والی ہے جس میں پانی ٹھہرا ہوا ہے اور آب حیات کے چشمے سے کٹ چکا ہے جو بالآخر خراب ہو کر بدبودار ہو جائے گا۔

یاد حق وخدا سے خالی جان وروح شیطان کے لئے بہترین چراہ گاہ ہے اور اس کے چیلوں کے لئے کھیلنے کا میدان ہے، ایسے ہی دل میں گناہ وعصیان کا بیج بڑے سکون سے خوب شاخ وبرگ نکالتا ہے اور کچھ ہی عرصے میں انسان دام شیطان کا اسیر ہو جاتا ہے اور اس کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

امام حسینؑ نے اپنے خطبے میں دشمن کے سامنے اسے مخاطب قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ولقد استحوذ علیکم الشیطان فانسا کم ذکر اللّٰہ العظیم.(۱)

”شیطان نے تمہارے اوپر قبضہ جما لیا ہے جس کی وجہ سے اس نے تمہیں یاد خدا سے غافل کر دیا ہے“

امام حسینؑ کا یہ فرمان قرآن پاک کی آیت کا مضمون ہے کہ خدا فرماتا ہے:

”شیطان نے سختی سے تمہارا احاطہ کر لیا ہے لہٰذا اس نے ذکر خدا تمہیں بھلا دیا ہے یہ لوگ گروہ شیطان ہیں اور یاد رکھو گروہ شیطان ہی خسارے میں ہے“(۲)

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۵، ص۵

(۲) مجادلہ /۱۹

امام حسینؑ کا یہ کلام صدیوں پر محیط اور تمام زمانے کے انسانوں کے لئے ایک پیغام ہے، خزانہ سعادت ہے اور تمام انحراف اور گناہ جو کہ ہر طرح کے ظلم وجنایت کا باعث ہیں کی تند وتیز دھار کے سامنے صرف یہی سپر ہے۔

اصحاب امام حسین علیہ السلام کی خصوصیات

سوال ۲۶ : امام حسینؑ کے اصحاب اور ساتھی کیا خصوصیات رکھتے تھے؟ کیا سب ایک جیسی صورت حال کے حامل تھے اور ابتداء سے آخر تک آپ کے ساتھ رہے؟

جواب : کسی مکتب ومسلک کے پیروکار اس مکتب کی اصالت، گہرائی اور صلاحیت ہدایت کے بہترین گواہ ہوتے ہیں، امام حسینؑ کے اصحاب اور خاندان کے افراد وفا محبت، عشق اور ایثار کے میدان میں سب سے آگے نکل گئے، وہ آسمان فضیلت وکمال پر اس طرح چمک رہے ہیں کہ تمام لوگوں کے لئے روشنی بخش ہیں اور ان کے پاکیزہ نام آزاد وپاک لوگوں کی محفلوں کی زینت بن چکے ہیں۔

ان کی عظمت وکمال کے بیان کے لئے امام حسین علیہ السلام کا یہ فرمان ہی کافی ہے جو آپ نے ۹ محرم کے دن عصر کے وقت فرمایا:

> "اما بعد فانی لا اعلم اصحابا أوفی ولا خیرا من اصحابی ولا اهل بیتی أبر وأصل من اهل بیتی، جزاکم اللّٰه عنی خیرا۔(۱)
>
> "خدا کی حمد وثناء کے بعد، تحقیق میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اصحاب کہیں اور نہیں پاتا اور نہ اپنی اہل بیت سے زیادہ نیک اور صلہ رحم کرنے والی اہل بیت کسی کی پاتا ہوں، خداوند

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۴، باب۳۵، فروغ شہادت، ص۱۹۲

میری طرف سے تمہیں نیک جزا دے"

امام حسینؑ کے اصحاب کے بارے ایک زیارت میں وارد ہے:

انتم سادات الشهداء في الدنيا والآخرة(۱)

"دنیا و آخرت میں آپ شہداء کے سردار ہیں"

ایک زیارت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے جس میں ارشاد ہے:

انتم خاصة اللّٰه اختصكم اللّٰه لابي عبداللّٰه (۲)

"آپ لوگ درگاہ الٰہی کے خواص میں سے ہوں خداوند نے

تمہیں امام حسینؑ سے خاص کر دیا"

سید الشہداء کے اصحاب کے بارے "خاصۃ اللہ" کی اصطلاح کا استعمال ان کے عظیم الشان مقام و مرتبے کے بیان کی خاطر ہے۔

ان پاک ہستیوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے اس خوبصورت اختتام جو کہ بلند ترین افتخار و عظمت کا باعث تھا کے باوجود نہضت سید الشہداء کے آغاز سے وہ سب محبت و ارادت اور امام حسین علیہ السلام کی ہمراہی کے لحاظ سے ایک جیسی صورت حال نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ اس نظر سے ان اصحاب کی زندگی پر نظر کرنے سے بڑے مفید نکات سامنے آتے ہیں، لہٰذا ہم اختصار کے ساتھ چند اصحاب کی زندگی کا سرسری مطالعہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی زندگی کے پر پیچ واقعات سے ہم فائدہ اٹھا سکیں۔

۱) حُر بن یزید ریاحی

امام حسین علیہ السلام کا قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا جب منزل شراف پر پہنچا تو وہیں پر حُر بھی

---

(۱) کامل الزیارات، باب ۷۹، ص ۱۹۶

(۲) حوالہ سابق، ص ۲۳۲، زیارات، ۱۸

اپنے فوجیوں کے ساتھ وارد ہوا اور اسے امامؑ کو روکنے کے لئے بھیجا گیا تھا، یہ لشکر تھکا ماندہ ہوا پیاس سے بلکتا ہوا وہاں وارد ہوا، سید الشہداء نے جب ان کی پیاس کی یہ حالت دیکھی تو اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ انہیں پانی پلائیں اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیراب کریں اور ان کی سواریوں پر پانی بھی ڈالیں، اصحاب نے آپ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے لشکر کے افراد کو سیراب کرنا شروع کیا اور دوسری طرف ان کے گھوڑوں کے سامنے پانی کے برتن بھر کر رکھ رہے تھے، حُر کے سپاہیوں میں سے ایک شخص بیان کرتا ہے کہ میں شدید پیاس و تھکاوٹ کے عالم میں سب لشکر کے بعد وہاں پہنچا، اصحاب امام چونکہ دوسروں کو پانی پلا رہے تھے میری طرف کسی نے توجہ نہ کی، اسی دوران امام حسینؑ میری طرف متوجہ ہوئے تو آپ خود میری طرف تشریف لائے، میں شدت پیاس اور تھکاوٹ کی وجہ سے خود صحیح طرح سے پانی نہیں پی سکا، لہٰذا حضرت نے خود مشک سے مجھے پانی پلایا اس مہمان نوازی کے بعد لشکر نے جب آرام کرلیا اور نماز ظہر کا وقت ہوا، امام کے موذن نے اذان دی تو حضرت امام حسینؑ نے حُر سے فرمایا تم اپنے لشکر کے ساتھ نماز پڑھو تو حُر نے عرض کیا میں اپنے لشکر سمیت نماز آپ کی امامت میں پڑھوں گا، اس طرح عصر کی نماز بھی پڑھی گئی، نماز عصر کے بعد امام پاکؑ نے لشکر حُر کو خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ان پر حجت تمام کی۔

جب امام حسینؑ اور حُر کے درمیان گفتگو ہوئی تو حر نے کہا ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم آپ سے جدا نہ ہوں یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس کوفہ لے جائیں، تو آپ غضبناک ہوگئے اور فرمایا حُر تمہارے لئے موت اس فکر و سوچ سے زیادہ بہتر ہے، پھر آپ نے اپنے لشکر سے فرمایا، سوار ہو جاؤ واپس چلو حُر اپنے لشکر کے ساتھ آ کر رکاوٹ بن گیا، حضرت نے فرمایا ثکلتک امک ماترید ؟ تیری ماں تیرے غم میں روئے کیا چاہتے ہو؟ حُر نے کہا اگر کوئی اور میری ماں کا نام لیتا تو اسے جواب دیتا لیکن آپ کی ماں وہ عظیم ہستی ہیں کہ جن کا احترام کرنا لازم ہے۔

عاشورہ کے دن جب حُر نے دیکھا کہ لشکر ابن سعد جنگ پر کمر باندھ چکا ہے اور حُر نے سید الشہداء کا استغاثہ مظلومیت سنا تو اپنے آپ کو سعادت وشقاوت اور جنت وجہنم کے دوراہے پر پایا، اس حالت میں حر نے مکمل سوچ اور غور وفکر کے ساتھ سعادت کی راہ کا انتخاب کرلیا، اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی اور امام حسینؑ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے، عرض کیا اے فرزند رسول میری جان آپ پر قربان ہو، میں ہی وہ شخص ہوں جس نے آپ پر واپسی کا راستہ بند کیا اور میں باعث بنا کہ آپ اس کرب وبلاء اور رنج ومصیبت کی زمین پر اتریں، میں یہ گمان نہیں کرتا تھا کہ یہ لوگ آپ سے جنگ کریں گے اور اس طرح کا برتاؤ کریں گے، میں اب شرمندہ اور پشیمان ہوں خدا کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں کیا خداوند میری توبہ قبول کرلے گا؟

امام پاکؑ نے فرمایا ہاں خداوند تمہاری توبہ قبول کرلے گا اور تمہارا جرم معاف کر دے گا؟(۱)

وہ کون سی وجہ تھی جس کی وجہ سے حُر واپس آگئے؟ جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ حُر کا امام حسین علیہ السلام کے مقابل ادب واحترام کی حدود کا پاس رکھنا، آپ کے پیچھے نماز پڑھنا اور سیدہ فاطمہ زہراءؑ کے لئے اظہار تعظیم واکرام کرنا وہ عوامل تھے جو حُر کی نجات و سعادت کا باعث بنے.

بالآخر حُر نے امام حسینؑ کے سامنے بڑی جانبازی وفداکاری کا مظاہرہ کیا اور زخمی ہو کر جب گرے تو زندگی کی کچھ رمق باقی تھی جب اصحاب آپ کا بدن اٹھا کر سید الشہداء کے حضور لے آئے امام پاکؑ نے اپنا دست مبارک حُر کے چہرے پر پھیرا اور فرمایا:

انت الحر کما سمتک امک، وانت الحر فی الدنیا و

---

(۱) شیخ عباس قمی، منتهی الآمال، ج۱، ص۶۱۳، سخنان امام حسینؑ از مدینه تا کربلا، ص۱۳۷

انت الحرفی الآخرة.(۱)

''اے حُر تو آزاد ہے جیسا کہ تیری ماں نے تیرا نام رکھا تو دنیا اور آخرت میں آزاد ہے''

امام پاکؑ کا حُر کے بارے میں یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ حُر دنیاوی تعلقات اور ہوئی وہوس سے تمام تعلقات توڑ کر اس عظیم منزل پر پہنچ گئے جو انبیائے الٰہی وصدیقین کے ساتھ خاص ہے، حُر کا اس کمال پر پہنچنا سید الشہداء کی خاص نظر کرم (نظر ولائی) کا نتیجہ تھا اور آخرت کی سختیوں سے چھٹکارا بھی اسی کمال پر فائز ہونے کا نتیجہ ہے جس کی طرف سید الشہداء نے وانت الحر فی الآخرۃ(۲) کہہ کر ارشاد فرمایا۔

حُر بن یزید کا یہ عاقلانہ انتخاب اور مردانہ فیصلہ ہر اس انسان کے لئے چراغ راہ ہے جو عزت وذلت، پاکی وپلیدی، رفعت وپستی اور کفر وایمان کے دوراہے پر کھڑا ہو، تعلقات اور ان کے خوبصورت چہرے کے پیچھے سے ان کی بدصورتی کو دیکھ لینا اور انہیں پاؤں کی ٹھوکر مار کر ٹھکرا دینا حُر جیسے آزاد مرد ہی کا کام تھا، لشکر ظلم وظلمت کو چھوڑ کر لشکر نور سے آملنا اگرچہ بہت مشکل ہے لیکن اس میں ابدی سعادت اور دنیا وآخرت کی سربلندی ہے۔

حُر کی سرگذشت درحقیقت ہم سب کی زندگی کی ترجمان ہے کہ جب ہم خود کو اطاعت اور عصیان وعارضی ہوئی وہوس کے دوراہے پر قرار پائیں تو ہمیں آزادی کی روش اپنانا ہوگی، یہ چند روزہ دنیاوی لذت اور جوانی کا غرور ہمیں فریب میں مبتلا نہ کر دے اور ہمیں درستی، راستی اور تقویٰ کے راستے سے منحرف نہ کر دے۔

یہاں پر امام صادق علیہ السلام کے نورانی ارشاد کی گہرائی روشن ہو جاتی ہے کہ فرمایا:

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۴

(۲) فروغ شہادت، ۲۰۸

کل یوم عاشورہ وکل ارض کربلا (۱)

یعنی واقعہ عاشورہ صرف کربلا کے اندر عاشورہ کے دن میں محصور نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ عاشورہ ایک جاری وساری چشمہ ہے جو ہر زمانے میں ہر جگہ پر جاری ہے اور ایک جاوید فرہنگ ہے، حق وباطل کے ھابیل وقابیل، حضرت علیؑ اور معاویہ اور امام حسینؑ و یزید کے درمیان کشمکش مسلسل اور دائمہ ہے اور لشکر ظلمت کو چھوڑ کر کاروان نور سے آملنے کے لئے کبھی بھی دیر نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر انسان کی عمر سے صرف چند سانسیں ہی باقی رہ گئی ہوں "ھل من ناصر ینصرنا" کی آواز آج بھی مسلسل گونج رہی ہے اور ہمیشہ گونجتی رہے گی اور امام حسینؑ اور حسینی آج بھی لوگوں کو راہ حق وحقیقت کی مدد کے لئے پکار رہے ہیں، آوازیں دے رہے ہیں.

۲) زھیر بن قین

زہیر کوفہ کی بڑی مشہور شخصیت اور دلیر شخص تھے، جنگوں میں ان کا مرتبہ بڑا مشہور تھا، ابتداء میں آپ عثمانی نظریات رکھتے تھے، ۶۰ ہجری میں جب سید الشہداء مکہ سے کوفہ کے لئے نکلے تو زہیر بھی اپنے خاندان کے ساتھ حج سے واپس آرہے تھے، آپ یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ سید الشہداء کے ساتھ آپ کی ملاقات ہو اور ایک ہی منزل پر پڑاؤ ہو، جہاں سے امام علیہ السلام کوچ کرتے وہاں زہیر پڑاؤ کرتے جہاں امامؑ پڑاؤ کرتے زہیر وہاں سے کوچ کر جاتے، ایک منزل پر مجبوراً اکٹھے پڑاؤ کرنا پڑا تو زہیر نے اپنا خیمہ امام کے خیام سے کافی فاصلے پر لگایا، زہیر کے ساتھیوں میں سے بعض بیان کرتے ہیں کہ دوپہر کے وقت ہم کھانے کے لئے بیٹھے تھے کہ امام کا قاصد آگیا آکر اس نے سلام کیا اور کہا اے زہیر تجھے ابا عبداللہ الحسینؑ طلب فرمارہے ہیں، یہ بات ہمارے لئے اتنی غیر متوقع تھی کہ ہم سب بے حس وحرکت ہو گئے ایسے کہ لقمے ہمارے گلے میں رہ گئے نہ انہیں

---

(۱) فروغ شہادت، ص۲۰۸

نگل سکتے نہ اگل سکتے.

زہیر کی زوجہ نے کہا سبحان اللہ نواسہ رسول تمہیں بلا رہے ہیں اور تم جانے میں متردد ہو، بیوی کی بات سن کر زہیر جیسے ہوش میں آگئے، زہیر امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان سے باتیں ہوئی گویا آپ کی نورانی گفتگو نے زہیر کے دل میں آگ لگا دی، دل کے تاریک حصے روشن ہوگئے اور زہیر حسینی بن گئے، خوشی اور کھلکھلاتے چہرے کے ساتھ واپس آئے اور اپنے خیمے اکھاڑ کر امام حسینؑ کے خیام کے قریب لگا لئے، پھر اس خاطر کہ اس مشکل راستے میں زوجہ مومنہ کو تکلیف نہ ہو اسے طلاق دے دی اور کچھ ساتھیوں کی ذمہ داری لگائی کہ اس کے گھر تک پہنچا دیں، اس دوررس نگاہ رکھنے والی نیک خاتون نے دامن زہیر تھام لیا اور اسے قسم دی کہ قیامت کے دن رسولؐ خدا کے سامنے اس کی سفارش ضرور کریں.

جب حُر کے لشکر نے امام حسینؑ پر راستہ بند کر دیا تو زہیر نے مولا کے اذن کے ساتھ ان سے گفتگو کی اور امام کو ان سے جنگ کرنے کا مشورہ دیا لیکن امام نے قبول نہ فرمایا، ۹ محرم کے دن عصر کے وقت جب امام پاکؑ نے اپنے ساتھیوں کو چلے جانے کی اجازت دی تو زہیر بھی ان افراد میں ایک تھے جنہوں نے بڑی مؤثر تقریر کر کے اپنے خلوص ومحبت اور اخلاص وایثار کو امام کے سامنے ثابت کیا اور کہا خدا کی قسم اگر میں ہزار بار قتل کیا جاؤں تا کہ اس طریقے سے خداوند آپ کی جان اور آپ کے خاندان کی جان بچالے تو میں ایسا کروں گا.(۱)

عاشورہ کے دن سید الشہداء نے اپنے لشکر کے میمنہ کی سربراہی زہیر کے سپرد کی، امام پاکؑ کے بعد زہیر ہی وہ پہلے شخص تھے جو اسلحہ کے ساتھ لیس ہو کر دشمن کے مقابل گئے اور انہیں وعظ ونصیحت کی، ظہر کے وقت جب امام نماز پڑھنے لگے تو زہیر اور سعد بن

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۹۳

عبداللہ امام کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہوئے جو تیر بھی آتا اپنے اوپر اسے لے لیتے، نماز کے بعد زہیر میدان جنگ میں گئے اور داد شجاعت دیتے ہوئے مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے، امام پاکؑ آپ کے سرھانے تشریف لائے اور آپ کے لئے دعائے خیر کی اور قاتلوں پر نفرین فرمائی۔(۱)

امام حسینؑ کے ساتھ مختصر سی ملاقات اور زہیر کا عقیدہ وراستہ بدل لینا واقعہ عاشورہ کے عجیب اور پر رمز وراز واقعات میں سے ہے، پتہ نہیں زہیر نے اس مختصر ملاقات میں امام پاکؑ سے کیا سنا کہ زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ گیا اور امام کا فدائی اور شیفتہ بن گیا، واضح ہے زہیر اپنے زمانے کے ولی کے مورد عنایت بن گئے اور فطرت پر پڑے حجابات اٹھ گئے، آپ نے امام حسین علیہ السلام کی ولایت وامامت کو اپنے ظرف وجود کے مطابق پہچان لیا، زہیر کی گفتگو، جہاد اور عظیم ایثار آپ کی روحانی عظمت و معرفت پر دلالت کرتے ہیں، جو آپ کو امام حسین علیہ السلام کی امامت و منزلت کے بارے حاصل ہوئی تھی۔(۲)

یہ مسلم ہے جب تک انسان کے اندر ایسی قابلیت اور جوہر نہ ہو تو قرعہ خوش بختی اس کے نام نہیں نکل سکتا اور نہ ایسا قابل فخر انجام حاصل ہو سکتا ہے۔

گوھر پاک بباید کہ شود لایق فیض ورنہ ھر سنگ و گلی لولو و مرجان نشود

رسولؐ خدا ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

''کبھی نسیم رحمت تم پر چلتی ہے بیدار رہو اور اپنے آپ کو اس کی جہت میں قرار دو اس سے رخ نہ موڑو''(۳)

حُر وزہیر جیسے جوانمردوں نے اپنے آپ کو اس نسیم رحمت کی جہت میں قرار دیا، ان کے وجود کے درخت کی آبیاری ہوگئی اور عشق و معرفت اور سعادت کا پھل انہیں نصیب

(۱) منتھی الآمال، ج۱، ص۶۷۰، فرھنگ عاشورہ، ص۲۰۱

(۲) فروغ شھادت، ص۲۰۰

(۳) رسالہ لب الالباب، علامہ سید محمد حسین طہرانی، ص۲۵، انتشارات حکمت

ہوا، امام حسینؑ نے اپنے اس سفر میں کچھ اور لوگوں کو بھی اس کاروان نور میں شمولیت کی دعوت دی لیکن وہ بد بخت اس قابل نہیں تھے کہ سید احرار کے ہمراہ درجہ شہادت پر فائز ہو کر ان کے نام بھی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے امر ہو جائیں، ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہے اور ان کے الگ الگ مقاصد تھے، ہم یہاں صرف ایک مورد مثال کے طور پر ذکر کرتے ہیں.

عبید اللہ بن حُر جعفی

منزل بنی مقاتل میں امام پاک علیہ السلام کو بتایا گیا کہ عبید اللہ بن حُر جعفی بھی اس منزل پر ٹھہرا ہوا ہے، یہ شخص عثمان کے حامیوں میں سے تھا، ان کے قتل کے بعد یہ معاویہ کے پاس چلا گیا اور جنگ صفین کے موقع پر معاویہ کے لشکر میں شامل ہو کر حضرت علیؑ کے خلاف جنگ میں شریک ہوا.(۱)

امام پاک نے پہلے اپنے ایک فرد حجاج بن مسروق کو اس کے پاس بھیجا، حجاج نے اس سے کہا میں تمہارے لئے بہت قیمتی تحفہ لایا ہوں، حسینؑ بن علیؑ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور تجھے اپنی مدد کے لئے دعوت دے رہے ہیں ان کے ساتھ شامل ہو کر تم بہت بڑے مرحلۂ ثواب وسعادت پر فائز ہو سکتے ہو، عبید اللہ نے کہا خدا قسم میں جب کوفہ سے نکلا تو لوگوں کی اکثریت امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو رہی تھی، مجھے یقین ہے کہ حسین اس جنگ میں قتل ہو جائیں گے اور میں ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتا اور میں ان سے ملاقات بھی نہیں کرنا چاہتا، حجاج امامؑ کے پاس واپس آ گئے اور عبید اللہ کا جواب آپ کی خدمت میں پہنچا دیا، امام پاکؑ خود اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ عبید اللہ کے پاس تشریف لے گئے اس نے امام کا استقبال کیا اور سلام کیا، حضرت نے اسے فرمایا تم نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ گناہ کئے ہیں اور بہت زیادہ غلطیاں کی ہیں کیا

(۱) تاریخ طبری، ج ۷، ص ۱۶۷

گناہوں سے توبہ کرنا اور پاکیزہ ہونا نہیں چاہتے؟ عبید اللہ نے عرض کیا کیسے توبہ کروں ؟ امام نے فرمایا:

تنصر ابن بنت نبیک و تقاتل معه.

''دختر رسولؐ کے بیٹے کی مدد کرو اور اس کی رکاب میں اس کے دشمنوں سے جنگ کرو''

عبید اللہ نے کہا خدا کی قسم میں جانتا ہوں جو بھی آپ کے حکم کی پیروی کرے گا اسے ابدی سعادت وخوش بختی نصیب ہوگی، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میری مدد سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو، آپ کو خدا کی قسم مجھے اس امر سے معاف رکھیں، کیونکہ میں مرنا نہیں چاہتا ہاں میرا گھوڑا جو کہ دوڑنے میں معروف ہے اسے قبول کرلیں، حضرت نے فرمایا جب تم اپنی جان ہماری راہ میں نثار نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بھی نہ تمہاری ضرورت ہے نہ تمہارے گھوڑے کی، عبید اللہ آخر عمر تک ایسی عظیم سعادت کو ضائع کرنے پر افسوس کرتا رہا، اگر آئمہ معصومینؑ کے طرز عمل کو غور سے ملاحظہ کریں تو جنگ وصلح اور حرکت وسکون میں ان کے کردار کا ملاحظہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آئمہ راہ انبیاء کا ہی تسلسل تھے، ان کا ہدف انسانوں کی رہائی اور غرق ہونے والوں کی نجات کے علاوہ کوئی اور نہ تھا. یہ ہدف کبھی عمومی طور پر پورا کرتے اور کبھی خصوصی طور پر.

امام حسینؑ کا عبید اللہ کے پاس جانا طبیب کا بیمار کے پاس جانا تھا، اولیائے الٰہی کی لغت میں ایک فرد کو نجات دلانا اور اسے کاروان کمال وسعادت میں شامل کرنا، ان کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا، یہ کام اسی مقدس قیام کی خاطر تھا جس کے راستے میں سید الشہداء نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، لیکن جب امام دیکھتے ہیں کہ عبید اللہ نے آپ کے مقصد کا ادراک نہیں کیا اور اپنا گھوڑا پیش کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف مادی سطح تک ہی پہنچا ہے اور کامیابی وناکامی کو ظاہری طور پر دیکھ رہا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے نہ

تمہاری ضرورت ہے نہ تمہارے گھوڑے کی۔(۱)

جون امام حسینؑ کا سیاہ غلام

دوسری طرف جون جیسے افراد بھی کربلا و عاشورہ میں حاضر ہیں، جون ایک سیاہ غلام تھے جنہیں حضرت علیؑ نے خرید کر ابوذر غفاری کو بخش دیا تھا۔ جون ۳۲ ہجری تک ابوذر کے ہمراہ تھے کہ جب ابوذر ربذہ کے بے آب و گیا صحرا میں جلاوطنی کی حالت میں وفات پا گئے، اس کے بعد جون حضرت علیؑ کے پاس واپس آ گئے اور آپ کی خدمت گذاری کے افتخار سے مفتخر ہوئے، مولا کے بعد آپ امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں تھے، ان کے بعد امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں تھے اور پھر سید الساجدین امام زین العابدینؑ کے خادم قرار پائے اور انہی کے ہمراہ تھے جب کربلا پہنچے۔

عاشورہ کے دن جب جنگ کی بھٹی گرم ہوگئی اور غلام سیاہ کا نورانی دل سید الشہداء کی مظلومیت پر غم زدہ و ملول ہوگیا تو اس نے آ کر امام سے اذن جہاد طلب کیا۔ تو امام نے فرمایا:

> ”میں تجھے واپس چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں کیونکہ تم تو ہمارے ساتھ ہوئے آرام و سکون کی خاطر نہ کہ جنگ و مصائب کی خاطر، لہٰذا ہمارا ساتھ دینا ضروری نہیں ہے“

اس روشن دل غلام نے خود کو مولا کے قدموں پر گرا دیا اور حضرت کے پاؤں کے بوسے دیتے ہوئے عرض کیا ”اے نواسۂ رسول یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نعمت و آسائش میں تو آپ کے ہمراہ رہوں اور مشکلات و سختیوں میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ خدا کی قسم میرے بدن کی بو اچھی نہیں، میری نسل پست ہے اور میری جلد کا رنگ سیاہ ہے، لیکن خدا کی قسم میں ہرگز آپ سے جدا نہیں ہوں گا یہاں تک میرا سیاہ خون آپ کے خون کے ساتھ مل جائے،

---

(۱) سخنان امام حسین از مدینہ تا کربلا، ص۱۶۵

بالآخر جون نے امام حسینؑ سے اجازت لی، میدان میں گئے اور بڑی شجاعت و دلیری سے جنگ کی، بالآخر جام شہادت نوش کیا۔

سید الشہداء کے ساتھیوں کے لئے سب سے بڑی لذت یہ تھی کہ جب زندگی کے آخری لحوں میں آنکھیں کھولتے تو سید الشہداء کا رخ انور انہیں اپنے سرہانے نظر آتا۔اس نقد جنت کو دیکھ کر موت ان کے لئے شہد سے زیادہ شیریں اور گوارا ہو جاتی ہے۔

گر طبیبانہ آئی بہ سر بالینم ‏ ‏ بہ دو عالم ندھم لذت بیماری را

امام پاک جون کے سرہانے تشریف لائے اور دعا فرمائی :

اللھم بیض وجھه و طیب ریحه واحشره مع الابرار و
عرف بینه وبین محمد وآل محمد (۱)

''خدایا اس کا چہرہ سفید کردے، اسے خوشبو عطا فرما، اسے
پرہیزگاروں کے ساتھ محشور فرما اور اس کے اور محمدؐ و آل محمدؐ کے
درمیان پہچان کا رابطہ برقرار فرما''

امام کی یہ دعا یوں مستجاب ہوئی کہ اس کا اثر اسی دنیا میں ظاہر ہوگیا، جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام اپنے پدر بزرگوار سے نقل فرماتے ہیں کہ جب لوگ شہدائے کربلا کی تدفین کے لئے آئے تو جون کا بدن انہیں دس دن کے بعد ملا اور اس سے مشک وعنبر کی خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔(۲)

ترکی غلام

ایک اور غلام جو کہ ترکی غلام کے نام سے معروف تھے بھی کربلاء میں تھے۔ جب وہ زخمی ہوکر گرے اور امام اس کے سرہانے تشریف لائے اور گریہ فرمایا اور وہی کام کیا

---

(۱) بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۲۳

(۲) حوالہ سابق

جوآپ نے اپنے شبیہ رسول بیٹے علی اکبر کے ساتھ کیا یعنی امام نے اپنا چہرہ اس غلام کے چہرے پر رکھ دیا، امام کا یہ کام اس غلام کے لئے اس حد تک ناقابل یقین تھا کہ اس نے آخری وقت میں تبسم کیا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی.(۱)

امام پاکؑ نے اس عمل سے ثابت کردیا کہ آپ کو اپنے پاک ومخلص ساتھیوں سے کس حد تک محبت تھی، اقدار کی حفاظت اور حق کی برپائی کے راستے میں اپنے وغیر اور سیاہ وسفید میں کوئی فرق نہیں ہے سب کا رنگ خدائی ہے اور سب میں وجہ مشترک تقویٰ ہے.

عاشورہ اور فارسی ادب

سوال ۶۷: امام حسینؑ کی نهضت و شخصیت کی فارسی ادب پر تاثیر کے بارے میں کچھ بتلائیں؟

جواب: اس موضوع کی مفصل تحقیق تو اس مقالے کی گنجائش سے باہر ہے، لہٰذا ہم یہاں اختصار کے ساتھ کچھ مطالب ذکر کرتے ہیں.

قیام امام حسین علیہ السلام کا موضوع قرن سوم (تیسری صدی ہجری) کے درمیان میں فارسی ادب میں وارد ہوا، البتہ ابتداء میں باقاعدہ نہیں تھا بلکہ صرف تمثیل اور اشاروں کے ذریعے امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کے مقتل کو ذکر کیا جاتا تھا.

ایک دو صدیاں بعد (تقریباً پانچویں چھٹی صدی ہجری میں) سنائی نے شہادت امام حسینؑ کو وضاحت سے پیش کیا، پانچویں صدی کے بعد (ناصر خسرو کے زمانے میں) عاشورہ اور امام حسینؑ کے بارے صرف اشارۃً ذکر ملتا ہے، لیکن مکمل طور پر جزئیات کے ساتھ تیموریوں کے دور سے شروع ہوا اور صفوی دور کہ جب تشیع کو رسمیت حاصل ہوئی اور حکومتی نظام بدلا تو شعراء نے باقاعدگی سے عاشورہ پر توجہ کی.(۲)

---

(۱) فروغ شہادت، ص۲۱۴

(۲) حماسہ حسینی در ادبیات فارسی

صفوی دور سے پہلے کے شعراء میں سب سے زیادہ جس نے موضوع عاشورہ کو پیش کیا وہ ابن حسام ہیں، ان کے کلام کا زیادہ حصہ عاشورہ کے بارے میں ہے، ان کے بعد بہت سے شعراء نے یہی روش اختیار کی، یہاں تک کہ قاجاری دور میں واقعہ عاشورہ بالخصوص شاعری کا باقاعدہ باب بن گیا. یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں.

ان شعراء میں سے ایک مشہور شاعر محتشم کاشانی ہیں کہ تقریباً سب ان کے اشعار سے واقف ہیں جو انہوں نے عاشورہ اور امام حسینؑ کے حوالے سے کہے ہیں، وہ صفوی دور کے بڑے مشہور اور اہم شعراء میں سے تھے، انہوں نے اہل بیت کے تذکرے کے بارے میں اشعار کہے اور اس اسلوب نے بڑی شہرت پائی، یہاں تک انہیں ایران کے مشہور ترین مرثیہ کہنے والے شعراء میں سے کہہ سکتے ہیں.

ان کا بارہ بند کا مشہور مرثیہ جو خلوص وصفا سے تخلیق ہوا، آج تک بے نظیر ہے.

باز این چه شورش است که در خلق عالم است؟ — باز این چه نوحه و چه عزا و چه ماتم است؟
باز این چه رستخیز عظیم است کز زمین — بی نفخ صور خاسته تا عرش اعظم است. (۱)

دوسرے: زندیہ کے ابتدائی دور تیرہویں صدی ہجری کے شاعر صباحی بیگدلی ہیں. انہوں نے کلیم کی پیروی کرتے ہوئے ترکیب بیت کی ہے اور مرثیہ کہا ہے.

افتاد شامگه به کنار افق نگران — خور چون سر بریده این طشت، واژگون
گفتم محرم است و نمود از شفق هلال — چون تاختنی که غمزده آلایش ز خون. (۲)

تیسرے: ملک الشعراء محمد تقی بہار (مشروطیت دور کے شاعر) نے بھی سید الشہداء کا مرثیہ کہا ہے.

ای فلک آل علی را از وطن آواره کردی — زان سخن در کربلا شان بردی و بیچاره کردی
تاختی از وادی این غزالان حرم را — پس اسیر پنجه گرگان آدمخوار کردی. (۳)

---

(۱) ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر، چند مرثیه از شاعران پارسی گو، ص ۵۷
(۲) حوالہ سابق، ص ۶۹، ۷۰، ۷۱
(۳) حوالہ سابق، ص ۱۱۶، ۱۱۷

چوتھے : سید محمد حسین شہریار ہم عصر بڑے شعراء میں سے تھے، اہل بیت کے بہت دلدادہ تھے، آپ نے امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے بارے میں بڑے مرثیے کہے، شعر کہے اور گریہ کیا، آپ نے کاروان کربلاء کے نام سے جو غزل کہی اس کا مطلع یہ ہے.

شیعیان دیگر هوای نینوا دارد حسینؑ　　روی دل با کاروان کربلا دارد حسینؑ

دشمنانش بی امان و دوستانش بی وفا　　با کدامین سر کند، مشکل دو تا دارد حسینؑ (۱)

اس موضوع پر مزید گفتگو کافی طولانی ہو جائے گی، لہٰذا آپ درج ذیل کتب کا مطالعہ کریں:

۱) مرثیہ سرائی عاشوراء در ادبیات فارسی، محله بصائر سال ۳ شماره ۲۴،

۲) جایگاه شعر در تبیین فرهنگ عاشوراء، نشریه ره توشه راهیان نور، ویژه محرم الحرام، نشر دفتر تبلیغات اسلامی ۱۳۷۵،

۳) مرثیه پردازی در ادبیات فارسی، نشریه سروش، نشر صدا وسیما ۱۳۶۰، ش ۱۳۲

۴) نگاهی به انقلاب کربلا در ادب فارسی، نشریه اطلاعات ۲۲/۱/۱۳۸۱

---

(۱) دیوان اشعار شهریار

چھٹا حصّہ

تربیّتی اور نفسیاتی

عَلی زینتی

گریہ خلاف معمول یا معمول کے مطابق

سوال ۲۸ : امام حسینؑ پر گریہ کی ترغیب دلانا غمگینی کی ترغیب ھے جو کہ ایک منفی حالت ھے ،اسلام کیوں ھمیں امام حسینؑ پر گریہ کی ترغیب کے ذریعے غم وحزن کی ترغیب دیتا ھے ،جو دین کمال کا دعویدار ھے، اس کی طرف سے ایک منفی حالت کی ترغیب کیسے قابل توجیہ ھے؟

جواب : اسلامی تعلیمات اور معصومین کی روایات میں گریہ کی بہت زیادہ ترغیب دلائی گئی ہے اور اس پر بہت زیادہ اجر وثواب ذکر کیا گیا ہے.(۱)

اس بارے میں دو نکات بہت اہم ہیں جن پر توجہ کی ضرورت ہے.

ایک تو یہ کہ: ہر گریہ غم واندوہ کی علامت نہیں ہے، گریہ کی بہت سی اقسام ہیں

دوسرا یہ کہ :غم سے کیا جانے والا ہر گریہ منفی نہیں ہے. ابتداء میں ہم اس دوسرے نکتے

---

(۱) بحار الانوار، ج۴۴،ص۲۴۱، الخصائص الحسینیہ، ص۱۴۲

کو سامنے رکھتے ہوئے کہ امام حسینؑ پر گریہ غم وحزن اور ماتم وعزاداری ہے اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔

غم بے جا کی وجہ سے گریہ کرنا اور غمگین رہنا ایک طرح کی بیماری ہے کہ جسے آپ منفی حالت کہہ رہے ہیں، البتہ ماتم اور اس کے ساتھ غمگین حالات کی حدود وتعریف تو علمی زبان میں زیادہ وضاحت سے بیان نہیں ہوئی۔ ماتم، غم، غمزدہ، داغدیدہ اور عزاداری یہ الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں، ایک دوسرے سے الگ الگ استعمال ہونے کی حدود معلوم نہیں ہیں۔

البتہ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے درج ذیل تعریف کی جاسکتی ہے ''ماتم'' یہ وہ اہم علامت ہے جو غم واندوہ کے مقابل فیزیالوجیکل اور نفسیاتی طرز عمل کا جواب دیتی ہے اور ممکن ہے سخت وکہنہ اثر کا باعث بھی بن جائے''

''داغدیدگی'' یعنی کسی متعلقہ شخص کی وفات یا کسی خاص موضوع کا بچھڑنا جس سے جذباتی تعلق ہونے کی وجہ سے جو حالت حاصل ہو۔

''عزاداری'' داغدیدگی کی کیفیت کا معاشرتی اظہار ہے، طرز عمل کے ذریعے اور یہ معنی عزاداری کے اس نفسیاتی معنی سے فرق رکھتا ہے جو کہ اندرونی علاج کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔

''غم'' یہ ایک جذباتی حالت ہے جو کسی اہم شے کے چلے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

غمگینی بھی ایک غم آور حادثے کے ردعمل کو کہتے ہیں نہ کہ یہ افسردگی کے ہم معنی ہے، البتہ افسردگی غمگینی کی حالت کو شامل ہے جو کہ انسان کے روزانہ کے کاموں، فیصلوں اور نیند وبھوک وغیرہ پر اثرانداز ہوتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہر طرح کا غم وماتم منفی اور مرض شمار ہوتا ہے یا ایسا نہیں ہے،

تاکہ معلوم ہو سکے کہ امام حسینؑ پر رونا کس زمرے میں آتا ہے۔

علمی نکتہ نظر سے اور نفسیات کی روشنی میں ہر طرح کا گریہ نہ مرض ہے، نہ خلاف طبیعت ہے، بلکہ غمگینی تب مرض شمار ہوتی ہے کہ جب مدت اور شدت کے لحاظ سے ہر واقعہ میں اس کے اپنے لحاظ سے حد سے تجاوز کر جائے اور خصوصا جب بغیر کسی ظاہری علت و وجہ کے اس کا اظہار شروع کر دیا جائے، یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب غم کی شدت انسان کو دباؤ میں لے لے اور وہ غیر طبیعی طرز عمل اپنا لے یا یہ کہ ماتم کو لمبی مدت گذر جائے اور اس کے ماتم میں کمی واقع نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اگر عزاداری اور ماتم درج علامتوں کے ہمراہ ہو تو یہ عزاداری مرض و بیماری شمار ہوگی۔

۱	صحت گرتی جائے	۲	معاشرے سے کٹ جائے
۳	ناچیز ہونے کا احساس	۴	گناہ کا احساس
۵	خودکشی کے رجحانات	۶	زیادہ کام بے مقصد ہوں
۷	غم کی نشانیاں لمبی مدت رہیں	۸	اچانک نشانیوں کا ظہور

اب آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا شیعہ کا سید الشہداء کے غم میں عزاداری کرنا ان علامات میں سے کوئی علامت رکھتا ہے یا نہیں؟ کیا آپ نے دیکھا ہے کہ سید الشہداء کی عزاداری کرنے سے ان مذکورہ بالا علامات میں سے کوئی ایک علامت بھی پیدا ہوتی ہے اور عزاداری کرتے وقت کیا احساس ہوتا ہے، سائنسی طور پر سید الشہداء کی عزاداری میں طبعی و فطری غمگینی کی مکمل شرائط موجود ہیں اور معرفت پر مبنی اجتماعی طرز عمل کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے۔

اسی وجہ سے عزاداری بغیر کسی خاص طرز عمل کو بنیاد بنائے، لوگوں کی دینی و معاشرتی فرہنگ و ثقافت کی بنیاد پر برقرار کی جاتی ہے اور لوگوں کی معرفت و شناخت پر استوار ہے نہ کہ صرف ایک مردہ و بے روح عزاداری کا اظہار ہو، لوگوں کا عزاداری کرنا اس معرفت

وشناخت کی بناء پر ہے جو انہیں حسینؑ بن علیؑ اوران کے بلند اہداف ومقاصد اوران کی اس نہضت کے بارے میں حاصل ہے جس کا نتیجہ شہادت امام تھی، لہٰذا ان کی عزاداری ومرثیہ ونوحہ خوانی باطل کی نقاب کشائی کرتی ہے نہ کہ یہ بے مقصد رونا دھونا ہے بلکہ وہ اس عزاداری کے لئے اپنی پوری زندگی کو باہدف وبا مقصد بناتے ہیں، اپنی زندگی کو حسینی بنا کر اسے تازگی بخشتے ہیں اور ذلت کی موت کے بجائے عزت کی زندگی اور اہمیت کے احساس کے ساتھ زندگی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، لہٰذا سید الشہداء پر گریہ وماتم کو بے مقصد ومنفی اور مرض نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ تو دینی ومعاشرتی تقاضوں کے عین مطابق اور روح وجسم کی سلامتی کے برابر ہے. اگر ہمارے آنسو جو ہم سید الشہداء کے غم میں گراتے ہیں ہماری روح کے موافق راستے میں ہوں تو یہ ہماری روح کی معمولی سی پرواز ہے حسینی روح کی ہمراہی میں.

علمی نفسیات شناسی کی نظر میں ایک مسلمان سے اس طرح کا جذباتی ردعمل ظاہر نہ ہو تو یہ بیماری کی علامت ہے، جیسا کہ عزاداری کی علامات کا نہ ہونا یا ماتم ونوحہ سرائی کے طرز عمل کا ظاہر نہ ہونا بھی بیماری شمار کیا گیا ہے، جو لوگ اپنے کسی عزیز کی وفات میں آنسو نہیں بہاتے متاثر نہیں ہوتے، بے حس وحرکت رہتے ہیں اور کوئی غم کی علامت ان سے ظاہر نہیں ہوتی ممکن ہے سطحی نظر میں انہیں کوئی بڑی ہستی سمجھ لیا جائے لیکن درحقیقت یہ اچھی بات نہیں ہے بلکہ اس سطحی رویے میں حد سے زیادہ دفاعی نظام اور انکار غم سے استفادہ کیا گیا ہے، ہوسکتا ہے تھوڑی مدت کے لئے تو یہ رویہ اسے سنبھال لے، لیکن یہی رویہ اگر ذرا لمبی مدت کے لئے اس میں باقی رہ جائے تو اسے زبردست نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ صرف عزاداری کی علامات کا نہ ہونا بیماری ہے بلکہ ان کا دیر سے ظاہر ہونا بھی بیماری ہے، جیسے تذکرہ کی گئی آٹھ علامتوں کا ماتم وعزاداری میں ظاہر ہونا باعث بنتا ہے کہ وہ ماتم وعزاداری ایک طرح کی بیماری ومنفی شمار ہو اسی طرح جن افراد میں عزاداری کی علامات ظاہر ہی نہیں ہوتی یا دیر

سے ظاہر ہوتی ہیں انہیں بھی بیمار و منفی شمار کیا جائے گا، ممکن ہے کوئی کہے کہ آپ کی بات کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جو بھی سید الشہداء پر عزاداری و سوگواری نہ کرے وہ بیمار ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ قطعاً ہم نے ایسا نہیں کہا بلکہ جو سید الشہداء پر عزاداری نہیں کرتا وہ آپ سے تعلق خاطر نہیں رکھتا اسی وجہ سے تو آپ کی شہادت و مصائب کا اس کے دل پر اثر نہیں ہو رہا، چونکہ وہ امام پاک سے تعلق خاطر نہیں رکھتا، اپنے آپ کو ان سے الگ سمجھتا ہے لہٰذا غم و اندوہ کا احساس نہیں کرتا، ماتم کی تعریف میں بیان ہو چکا ہے کہ جو شے یا شخص چلا گیا ہے اس سے ایک تعلق خاطر ہونا چاہیے تاکہ انسان میں غم و اندوہ کی حالت پیدا ہو سکے اور جو شخص امام حسینؑ کے غم میں نہیں روتا تو اسے چونکہ آپ سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے کہ آپ کی شہادت یا آپ کے فیض وجود سے محرومی کی وجہ سے وہ محزون ہو، اگر آپ کے محلے کا دکاندار فوت ہو جائے تو اس پر بھی آپ متاثر ہوتے ہیں چونکہ اس سے آپ کو تعلق خاطر تھا یا فیض وجود حاصل تھا، ہاں جو شخص سید الشہداء سے تعلق خاطر رکھتا ہو جیسا کہ شیعہ ہیں لیکن اسے آپ کی شہادت و مصائب سن کر رونا نہ آئے یا رونے سے اپنے آپ کو روکے یا بڑی دیر کے بعد رونا آئے تو یہ طرز عمل منفی اور بیماری شمار ہوگا۔

اگر یہی علامات وہاں ہوں جہاں پر کسی شخص کو امام حسینؑ سے تعلق خاطر نہیں ہے تو نفسیاتی طور پر تو اسے منفی یا بیمار نہیں کہا جائے گا لیکن دین اور دینی شخصیات کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے اسے اپنے اندر ضرور جھانکنا چاہیے کہ وہ کیسا مسلمان ہے جسے نواسہ رسول دلبند زہراء، ابن علی مرتضیٰ کی شہادت و مصائب پر کیوں احساس رنج و غم نہیں ہو رہا؟ ہاں شیعہ کے بارے امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:

> شیعہ اس طینت سے خلق ہوئے جسے ہمارے ساتھ نسبت حاصل ہے اور ہماری ولایت کے نور سے مخلوط ہو چکے ہیں ہماری امامت کے معتقد ہیں ہم بھی ان کی پیروی و محبت پر راضی ہیں،

ہماری مصیبت ان کے اندر سرایت کرتی ہے اور وہ اس پر گریہ کرتے ہیں ہمارا غم انہیں غمگین کر دیتا ہے اور ہماری خوشی سے وہ خوش ہوتے ہیں ہم بھی ان کی حالت سے مطلع ہیں اور ان کے ساتھ ہیں، ان کی تکلیف پر ہم بھی متاثر ہوتے ہیں، نہ وہ ہم سے جدا ہوتے ہیں اور نہ ہم ان سے جدا ہوتے ہیں.(۱)

پس امام حسینؑ کے لئے گریہ وسوگواری صحت کی علامت ہے نہ کہ بیماری کی اور نہ کوئی منفی وغیر عادی، بلکہ غمگین نہ ہونا اور سوگ نہ منانا ایک مسلمان کے لئے بیماری یا نامانوس طرز عمل ہو سکتا ہے، گریہ نہ صرف یہ کہ بیماری کی علامت یا منفی حالت نہیں ہے بلکہ مصیبت زدہ شخص کے لئے رونا باعث شفا وصحت بھی بن سکتا ہے کیونکہ رونے سے اندرونی دباؤ میں کمی واقع ہو جاتی ہے ورنہ مصیبت کی وجہ سے انسان کے ذہن اور اعصاب پر جو دباؤ پڑتا ہے وہ اس کے داخلی کیمیائی عمل کے سسٹم کو خراب کر سکتا ہے رونے سے یہ دباؤ کم ہو جاتا ہے اور اس سسٹم پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، بعض کے نزدیک رونے سے بدن سے زہریلا مادہ خارج ہو جاتا ہے اور اس سے زندگی کا اعتدال باقی رہتا ہے.

واقعہ کربلا پر ہماری نظر صرف علم نفسیات کے نتائج کے حوالے سے نہیں ہے کہ ہم اس الٰہی حادثہ کی صرف ایک زمینی و بشری توجیہ کر سکیں اور امام حسینؑ پر سوگ وگریہ کے بارے علم نفسیات کی توجیہ ہی حاصل ہو جائے، ایک آسمانی وماورائے طبیعی واقعہ کے بارے صرف بشری وزمینی توجیہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام حسینؑ پر گریہ وماتم ان تمام اصولوں کے مطابق ہے جو علم النفسیات نے غم وماتم کے حوالے سے بیان کئے ہیں اور جس پر مصیبت پڑتی ہے اس سے اس مصیبت کے تمام منفی اثرات کو ختم کر دیتا ہے، لہٰذا سید الشہداء کی عزاداری کی جتنی شکلیں اور رسمیں رائج ہیں وہ سب غم و

---

(۱) بحار الانوار، ج۵۱،ص۱۵۱

ماتم کے بارے میں علم النفسیات کے تمام اصولوں پر پوری اترتی ہیں، ہم یہاں چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں.

۱) اگر امام حسینؑ کی عزاداری میں ہم واقعہ کربلا کو ذکر کرتے ہیں اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور ان کے خاندان کی قید کو یاد کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جان لیوا مصیبت و اسارت کے غم کو کم کرنے کا بھی یہ ایک طریقہ ہے، جیسا کہ اپنی پسندیدہ شخصیت کے بارے گفتگو کرنا، اس کے کمالات وصفات کو بیان کرنا اور اس کی وفات کے اسباب کا ذکر کرنا یہ سب چیزیں غم کو کم کرنے اور تسلی خاطر کا باعث بنتی ہیں.

البتہ دینی فکر میں واقعہ کربلا کو زندہ رکھنے کا مقصد صرف یہی نہیں ہے بلکہ حسینی تعلیمات کو قدم بہ قدم زندگی کی رگوں میں خون کی طرح دوڑانا اور دین کی تبلیغ کرنا خود خط رسالت ہی کا تسلسل ہے.

امام حسین علیہ السلام کی مجلس عزا مکتب حسینیؑ ہے اور اس مکتب میں دین داری، شجاعت، حریت اور جوانمردی کی تعلیم دی جاتی ہے، صرف غم زدوں کے دلوں پر مرہم مقصد نہیں ہے بلکہ شعر بھی ہے، شعور بھی ہے، احساس بھی ہے اور ادراک بھی ہے.

۲) امام حسینؑ کی عزاداری میں دو عنصر ہیں:

(i) الٰہی سنتیں و مذہبی اصول،

(ii) قومی و علاقائی آداب و رسوم،

یعنی عزاداری دینی والٰہی بھی ہے اور لوگوں کے علاقائی آداب و رسوم بھی اس میں دخیل ہیں اور مذہبی و دینی رسوم کی برقراری خود غمزدہ افراد کی تسلی خاطر کا ذریعہ ہیں، نوحہ خوانوں کا نوحہ پڑھنا اور خطباء کا واقعات شہادت پڑھنا اس طریقے پر جو آئمہؑ نے خود ہمیں تعلیم فرمایا ہے اور یہی ہماری مجالس میں بھی مرسوم ہے. یہ بہترین اور مناسب ترین مذہبی و دینی طریقہ ہے جو عزاداری و سوگواری میں برقرار ہو سکتا ہے. یہ طریقہ بے مقصد

گریہ، حد سے بڑھے ہوئے طرز عمل سے بالکل دور اور مکمل پاک ہے اور غم سید الشہداء میں شکستہ دلوں کے لئے بہترین راہ علاج ہے، البتہ وہ دل ایسا ہو جو امام حسین علیہ السلام کی محبت میں گرفتار ہے اور اہل بیت کے ساتھ تمسک رکھتا ہے. لیکن جو دل حسینی تعلق سے خالی ہے وہ شکستہ ہی نہیں ہوا تو اسے علاج کی کیا ضرورت ہوگی؟ اس کی نظر میں تو یہ گریہ و عزاداری بے مقصد کی گریہ وفریاد ہے.

۳) عزاداروں کی مجلس میں جا کر بیٹھنا اور اس غم آلود فضا اور غمزدہ ماحول میں غم و اندوہ کا احساس کرنا اپنے غم کو ہلکا کرنے کے لئے ایک اور طریقہ ہے، غمزدہ شخص اس محفل میں اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتا ہے جہاں غم وسوگ برقرار ہو بجائے اس کے کہ اسے کسی خوشی کی محفل میں لے جایا جائے کہ جہاں لوگ اس کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے، اسے غم منانے کی ضرورت ہے تاکہ آنسوؤں کی صورت میں اس کے اندر کا غبار نکل جائے اور اسے سکون حاصل ہو.

جو شخص سید الشہداء کی مصیبت میں غم زدہ ہے وہ گریہ کی کوشش کر کے بھی اپنا دل ہلکا کرسکتا ہے لیکن اگر اس دل میں ایسا سوز ہی نہ ہو تو پھر اس کا کوئی اور علاج کرنا چاہیے.

پس ثابت ہو گیا کہ عزاداری ایک منفی چیز یا بیماری نہیں ہے بلکہ غمگین نہ ہونا بیماری ہے اور جو دل غم حسینؑ میں گرفتار ہے اس کے لئے مجالس عزا میں شریک ہونا، رسوم عزاداری انجام دینا یا کم از کم رونے کی کوشش کرنا اس کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے بھی ضروری ہے اور ان دنیاوی فوائد کے علاوہ اخروی اجر وثواب کا باعث بھی ہے اور انسان کے اندر روح شہادت، شجاعت، ایثار، حق طلبی اور حقیقت طلبی جیسی صفات بھی پیدا کرتا ہے.

۴) مجالس عزا میں شرکت غم ومصیبت کی وجہ سے پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ میں کمی واقع ہونے کے علاوہ عزاداری کا فائدہ اور بھی ہے اور وہ ہے امید کا پیدا کرنا، معلومات کو

دوسروں تک منتقل کرنا اور غم کو عمومیت دینا (مشکل میں عمومیت پیدا ہو جائے تو اس کا برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے) ایک دوسرے کے طرز کو اپنانا، مل بیٹھنے کی عادت پڑنا، نفسیاتی خلوت اور انسان دوستی جیسے ایک دوسرے سے تاثیر کے لحاظ سے جدا نہیں ہیں یہ سب مل کر غم کو کم کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، سید الشہداء کی مجالس عزا میں غمزدہ مومنین شرکت کرتے ہیں اور ان میں مذکورہ بالا عوامل سے استفادہ کرتے ہوئے غم سید الشہداء کے بوجھ کو مومنین کے دلوں سے کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس جواب کے حوالہ جات

۱) معتمدی، غلام حسین، انسان ومرگ، نشر مرکز ۱۳۷۲، ص ۲۱۹

۲) خسروی، زہرہ، روان درمانی داغدیدگی۔ انتشارات نقش ہستی، ۱۳۷۴

۳) مطہری، مرتضی، حماسہ حسینی انتشارات صدرا، ۱۳۶۷ ص ۹۴

۴) رمضان زادہ، محمود، ہیجانہا، انتشارات آستان قدس رضوی ۱۳۷۱ ص ۱۵۵

۵) دادستان، پریرخ، روان شناسی مرضی، انتشارات سمت ۱۳۷۶ ص ۲۷

عزاداری کے دوران غم و گریہ کا غلبہ

سوال ۶۹ : مشہور تو یہ ہے کہ ہنسی ہر غم کا علاج ہے تو پھر دینی اجتماعی پروگراموں میں گریہ و زاری کی حالت کیوں زیادہ تر برقرار ہوتی ہے، ہم مسلمانوں کے دینی پروگرام ہمیشہ نوحہ خوانی و مصائب کی وجہ سے غم و اندوہ سے پر ہوتے ہیں، کیا اسلام میں خوشی و سرور کی کوئی محفلیں نہیں ہوتیں کہ ہر محفل ہی غم و حزن کا مُرقع بنی ہوتی ہے؟

جواب : اس سوال سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مسلمانوں میں فکری گہرائی کی کس حد تک کمی ہے، اس مسئلہ کی گہرائی و گیرائی کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک حقیقت طلب معاشرے کو سامنے

رکھتے ہوئے اس مسئلہ سے ابہام کے پردے اٹھائے جائیں، ان جیسے احساسات و جذبات کی اسلامی صورت واضح کی جائے اور اس مقالے کی گنجائش کے مطابق یہاں کچھ مطالب ذکر کیے جائیں گے۔

اس سوال کے جواب کے لئے درج ذیل چار مراحل ذکر کیے جائیں گے۔

۱) اس فکری ابہام یا انحراف کی علت و وجہ کی پہچان

۲) اسلامی معارف میں غم و خوشی کا مقام

۳) سائنسی و دینی حوالوں سے علم النفسیات میں خوشی و غم کا مقام

۴) خوشی و غم کی صحیح شکل و صورت

پہلا اس ابہام کی وجہ

یقیناً آج کل کے مذہبی مراسم دیکھ کر ہی آپ نے خوشی و غم کے بارے ایسا سوچا ہے یا اس کے بارے ابہام کا آپ شکار ہوئے حالانکہ آپ کا یہ اظہار نظر اسلام کی طرف سے کی جانے والی تعریفوں سے کوئی مطابقت و مناسبت نہیں رکھتا۔

ان پروگراموں کے برقرار کرنے والوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو عید کے دن اور آئمہ کے جشن کی محفلوں میں بھی مصائب و گریہ کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو رلانا ان کا سب سے بڑا مذہبی فریضہ ہے، لیکن یہ کاملاً ایک غلط سوچ ہے اور اس سوچ کا منشاء و منبع یہ تصور ہے کہ گریہ و غم ایک پسندیدہ حالت ہے اور اس حالت میں انسان خدا و آئمہؑ کے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا یہ لوگ جیسے بھی ہو سکے لوگوں کو رلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے اپنا بڑا فن سمجھتے ہیں یعنی محفل گرم ہی تب ہوتی ہے کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکلیں، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی شرعی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو رلائیں اور ان کی یہ سوچ معارف دین کے بارے ایک افراطی فکر سے پیدا ہوئی ہے۔

ان افراطیوں کے مقابل ایک گروہ تفریطیوں کا ہے کہ وہ بعض روایات اور ان علمی

اصولوں کی بنا پر جن میں گریہ و ماتم کو نقصان دہ قرار دیا گیا ہے اپنی پوری ہمت و کوشش اس میں لگا دیتے ہیں کہ لوگوں کو جیسے ہو سکے خوش و خرم رکھیں اگر چہ وہ خوشی و سرور بے وجہ ہی کیوں نہ ہو.

پہلی قسم والے لوگ اپنے زندگی سے خوشی و سرور پیدا کرنے والے تمام عوامل خارج کر دیتے ہیں یا انہیں اہمیت کم دیتے ہیں حتیٰ کہ خوش رنگ و پر کشش لباس بھی نہیں پہنتے اور وہ اپنے اس غم واندوہ میں خوش ہیں، ان کے اس رویے کی وجہ سے بعض لوگ دین کو دین گریہ سمجھنے لگتے ہیں اور دوسرے بعض لوگوں کی وجہ سے لوگ دین کو دین خندہ شمار کرتے ہیں.

اکثر مسلمان اس افراط و تفریط کا شکار ہو کر اعتدال کی راہ چھوڑ بیٹھے ہیں، گویا کوئی تیسرا راستہ ہے ہی نہیں کہ وہ مجبور ہیں ان دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں، حالانکہ یہ دونوں نظریے غلط ہیں، حقیقی اسلام کا راستہ نہ یہ ہے اور نہ وہ ہے بلکہ حقیقت ان کے برعکس ہے.

دوسرا اسلام میں خوشی و غم کا مقام

اسلام کی نظر میں ہنسی ہو یا غم، گریہ ہو یا سرور کسی کو بھی مطلوبیت ذاتیہ و استحباب نفسی حاصل نہیں ہے. ان میں سے کسی کو حقیقی ارزش حاصل نہیں ہے، چہ جائیکہ ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہو، اسلام نے کسی کو گریہ کی ترغیب صرف گریہ کی خاطر نہیں دلائی جیسا کہ خوشی و سرور بھی صرف خوشی و سرور کے عنوان سے مطلوب نہیں ہے، بلکہ گریہ و خوشی اگر ارزش و مطلوبیت و رجحان پیدا کرتے ہیں تو ان مقدمات و نتائج کی وجہ سے جو ان پر مترتب ہوتے ہیں.

یہ انسان کی نفسانی صفات اور روحی جذبات و حالات ہوتے ہیں جو ہنسی یا گریہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، ابتدائی طور پر ایسے جذبات ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں،

ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ حالات انسان کے اجتماعی اور الٰہی تعلقات اور بندگی خداوند پر منفی اثر نہ ڈالیں بلکہ ان پر مثبت تاثیر ڈالیں۔ وہ غم اور گریہ جو انسان کے لئے نقصان دہ ہو یا اسے بندگانِ خدا کی خدمت سے روک دے یا عبادت سے مانع ہو جائے اور انسان کو اس کے ہدف تک نہ پہنچنے دے یہ گریہ مذموم و ناپسندیدہ ہے، اس طرح خوشی و سرور جب نقصان دہ ہو جائے یا عبادت یا انسانی و دینی وظائف کی انجام دہی سے مانع ہو جائے تو یہ بھی سخت ناپسندیدہ ہے، خوشی و گریہ کے بارے دو عنصر کو سامنے رکھ کر ہی کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے کہ حسن ہے یا قبیح۔

۱) ان جذبات کے ظہور کا عامل کیا ہے

۲) ان جذبات کی کیفیت کیا ہے

جاہلانہ ہنسی کہ جسے روایات میں "ضحک من غیر عجب" کہا گیا ہے مورد مذمت ہے، اس کے مقابل اگر ہنسی، بمعنی ہو تو اس کی مدح کی گئی ہے، امام حسن عسکری علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"بغیر تعجب کے ہنسنا جہالت کی علامت ہے" (۱)

دوسری حدیث میں فرمایا:

"جو شخص بغیر تعجب کے ہنسے خداوند اس سے متنفر ہے" (۲)

پس معلوم ہو گیا کہ نہ ہر طرح کی ہنسی ناپسندیدہ ہے اور نہ ہی ہر ہنسی پسندیدہ ہے، گریہ بھی اسی طرح ہے بلکہ گریہ اگر خوف خدا سے ہو تو اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اس قطرہ آنسو سے کوئی قطرہ خداوند کو زیادہ پسند نہیں جو رات

---

(۱) بحار الانوار، ج۷۲، ص۵۹، من الجهل الضحک من غیر عجب

(۲) حوالہ سابق، ج۷۸، ص۳۰۹ ان الله عز وجل یبغض الضحاک من غیر عجب

کی تاریکی میں خوف خدا سے نکلتا ہے"(۱)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "خوف خدا سے رونا رحمت الٰہی کی کنجی ہے"(۲)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ:

"یہ گریہ دل کی نورانیت کا موجب اور دوبارہ گناہ کی طرف لوٹنے سے مانع ہے"(۳)

وہ ہنسی پسندیدہ ہے جو تعجب انگیز نکتہ ادراک پر مبنی ہونے کی وجہ سے طبیعت کے مناسب ہے اور یہ گریہ پسندیدہ ہے چونکہ انسان کی روحانی ترقی اور اعلیٰ شناخت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ ان دونوں کا مقصد رضائے خدا کا حاصل کرنا ہے اور اس میں ہنسنے والے یا رونے والے کی سلامتی وضمانت بھی پائی جاتی ہے.

اسلام کی نظر

۱) اسلام ایسے گریہ کو بالکل پسند نہیں کرتا جو انسان میں افسردگی و مایوسی کو زیادہ کرے بلکہ اس کی مذمت کرتا ہے، رسولؐ خدا کے بارے روایات میں وارد ہے کہ اگر اصحاب میں سے کوئی شخص غمگین ہوتا تو حضورؐ مزاح کے ذریعے اسے خوش مضم کرتے تھے. (۴)

آئمہ طاہرین بھی اپنے اصحاب کو خوش رہنے کے طریقے ذکر فرماتے اور ارشاد فرماتے:

"خدا کی رضا پر خوش وخرم رہو، تا کہ ہنسی خوشی زندگی گذار سکو"

۲) اسلام میں با ارزش گریہ

یہ گریہ خدا کے خوف سے ہوتا ہے اور یہ خودسازی وتربیت کے لئے ایک ذریعہ ہے نہ کہ مایوسی و بے ارزشی ہے اور جو گریہ خدا کے بندوں کی محبت اور اعدائے خدا سے نفرت کی وجہ سے ہو اس کا بھی یہی حکم ہے.

---

(۱) اصول کافی، ج۲، کتاب الدعاء باب البکاء

(۲) میزان الحکمة، ج۱، ص۳۵۳، حدیث۱۸۳۶، البکاء من خشیة الله مفتاح الرحمة

(۳) حوالہ سابق، البکاء من خشیة الله ینیر القلب و یعصم من معاودة الذنب، ص۳۵۴

(۴) سنن النبی، ص۶۰

۳) ہنسنا قطعاً بری بات نہیں اور نہ ہی منفی شمار ہوتا بلکہ اسلام اور شارع مقدس اسلام کی نظر میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے، خوشی کا ایک جلوہ ہنسی ہے جیسے کہ خوشی کے اور جلوے بھی ہیں جیسے مزاح یا لطیفہ گوئی وغیرہ جو کہ کچھ حدود کے ساتھ ایک پسندیدہ عمل ہے، ہاں ہنسی کی بعض صورتیں مورد مذمت واقع ہوئی ہیں۔

۴) اسلام ہنسی کو گریہ کے مقابل یا گریہ کو ہنسی کے مقابل قرار نہیں دیتا ہے اگر چہ گریہ باارزش ہو یا ہنسی حکیمانہ وسنجیدہ ہو، اسلام ان کا ایک دوسرے کے ساتھ مقایسہ نہیں کرتا کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی نوبت آئے بلکہ زندگی کی حقیقت وواقعیت ہونے کے ناطے ان دونوں کو قبول کرتا ہے اور ہر ایک کے لئے خاص شرائط قرار دیتا ہے۔

۵) عام حالات میں انسان کی طبیعت پر خوشی وتروتازگی غالب ہوتی ہے نہ کہ غم واندوہ یا گریہ، لہٰذا جو جائز طریقے ہیں ان کا خیال رکھا جانا چاہیے جیسے ہنسنا، تبسم کرنا، مزاح، ورزش کرنا، کام کرنا، سیر وسفر کرنا، خوشبو لگانا اور اچھے اچھے کپڑے پہننا۔

اسلام میں مومن خوش طبع وخوش مشرب ہے جب کہ منافق گھٹا گھٹا سا رہتا ہے۔(۱)

رسولؐ خدا جنہیں سب لوگوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا فرماتے ہیں:

''میں بھی آپ لوگوں کی طرح ہنسی مزاح کرتا ہوں'' (۲)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''میں مزاح کرتا ہوں لیکن جو بات کہتا ہوں وہ حق وصداقت پر مبنی ہوتی ہے'' (۳)

یعنی ایسی ہنسی کہ جس کے ذریعے اخلاق، اجتماعی عقائدی یا فقہی علم حکمت کا تبادلہ ہو، اس طرح کی ہنسی کی مثالیں رسولؐ خدا کی زندگی سے کثرت سے ملتی ہیں۔

حضور اکرمؐ نے ایک دفعہ بوڑھوں کے ساتھ مزاح کرتے ہوئے فرمایا:

''جنت میں بوڑھے نہیں ہوں گے'' (۴)

---

(۱) بحار الانوار، ج ۷۷ ص ۱۵۵

(۲) کنز العمال، ج ۳ ص ۶۴۸

(۳) بحار الانوار، ج ۱۶ ص ۲۹۵ (۴) میزان الحکمة، ج ۱ ص ۳۸۴

جب وہ پریشان ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

"آپ پہلے جوان ہوں گے پھر جنت میں داخل ہوں گے"

اور جو ہنسی حکمت سے خالی ہو اور قہقہہ پر مشتمل ہو یا جس ہنسی میں گناہ کا عنصر شامل ہو جیسے غیبت، تہمت، تمسخر اڑانا اور بدگوئی وغیرہ سخت مورد مذمت ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح زیادہ ہنسی بھی ناپسندیدہ ہے، ائمہ علیہم السلام نے اسی طرح کی جذباتی آفات کے بارے تنبیہ فرمائی ہے اور ناپسندیدہ ہنسی کی اقسام ذکر فرمائی ہیں، اس ذیل میں قہقہہ مارنا، زیادہ ہنسنا، ہنسی کی محفلیں منعقد کرنا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جس ہنسی میں جھوٹ شامل ہو اسے بھی برا شمار کیا گیا ہے۔

امام حسینؑ نے فرمایا: القهقهة من الشيطان(۱)

رسولؐ خدا نے فرمایا: کثرة الضحک یمحو الایمان(۲)

رسولؐ خدا نے فرمایا:

ويل للذی يحدث فيكذب ليضحک به القوم ويل له، ويل له(۳)

پہلی روایت میں ہے کہ قہقہہ شیطان سے ہے، دوسری میں ہے "زیادہ ہنسی ایمان کو ختم کر دیتی ہے" اور تیسری روایت ہے "افسوس و ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے تاکہ دوسروں کو ہنسا سکے اس پر سخت افسوس ہے، اس پر سخت افسوس ہے"

۷) جب معلوم ہوگیا کہ اہمیت کا حامل وہ گریہ ہے جو خوف خدا سے ہو یا خدا کے بندوں سے محبت یا دشمنوں سے نفرت کی وجہ سے ہو تو اس کے علاوہ جو گریہ بھی ہو مذموم ہوگا، گریہ

---

(۱) میزان الحکمۃ، ج۱ص۳۸۱

(۲) حوالہ سابق،۳۸۲

(۳) حوالہ سابق،۳۸۳

صرف اس صورت میں اہمیت کا حامل ہوگا کہ خوف خدا کی بنا پر معنوی ترقی اور معرفت کا باعث ہو، لہٰذا جو گریہ نالہ وزاری (۱) داد وفریاد (۲) اعتراض آمیز ہو سب کے سب مذموم ہیں.

اس وضاحت سے معلوم ہوگیا کہ فکری ابہام یا عملی انحراف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ بعض روایات کو دیکھا گیا ہے اور دوسری بعض روایات سے چشم پوشی کی گئی ہے، جو لوگ ہنسی کو غلط یا گناہ سمجھتے ہیں وہ اپنی زندگی سے ہر طرح کی خوشی وشادمانی کو ختم کردیتے ہیں اور رونے رلانے کو ہی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں انہوں نے صرف ان روایات کو دیکھا ہے جو ہنسی کی مذمت کرتی ہیں اور گریہ کی مدح کرتی ہیں اور جو لوگ موقع وبے موقع ہنسی کو اپناتے ہیں یا جاہلانہ انداز میں ہنسی کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی صحیح راستے سے ہٹ چکے ہیں

اب جب کہ معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کی اجتماعی وانفرادی زندگی میں خوشی وخوشحالی ہی کو اصلیت وغلبہ حاصل ہے، جس کی وجہ سے کام وفعالیت انجام پاتی ہے وہ خوشی و تروتازگی ہی ہے، پس خوش ہونے کے لئے سبب ووجہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے امکانات فراہم ہونا کافی ہیں، جب کہ رونے کے لئے ایسے منظر اور موسم کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے رونا اور غم زدہ ہونا وجود پذیر ہوسکے، اس وجہ سے اہل ایمان کے اوصاف میں کہا گیا ہے کہ وہ شوخ طبع اور خوش مشرب ہوتے ہیں. (۳) یا مومن کی خوشی اس کے چہرے پر ہوتی ہے اور اس کا غم اس کے دل میں ہوتا ہے. (۴)

دوسری طرف خوف خدا سے گریہ کرنے پر تاکید کی گئی ہے تو اس کا مورد خلوت اور

---

(۱) قال رسول ؐ النیاحة عمل الجاھلیة (میزان الحکمة ج ۵ ص ۴۴۹)

(۲) قال رسول ؐاللہ صوتا ن ملعو نا ن یبغضھما اللہ: اعوال عندا لمصیبة (میزان الحکمة ج ۵ ص ۴۵۰)

(۳) بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۱۵۵

(۴) حوالہ سابق، ۶۹، ۴۱۱

تنہائی ہے نہ کہ جلوت میں اور سب کے سامنے۔ لہٰذا روایت میں آیا ہے سجدہ کی حالت انسان کی خدا کے سب سے نزدیک حالت ہے (۱) اور خوف خدا سے رات کی تاریکی میں آنسو کا قطرہ خدا کو سب قطروں سے زیادہ پسند ہے۔(۲)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر چہ فرد و اجتماع کی روح پر خوشی ونشاط کو اصلی جذبہ شمار کیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام ہنسی وہنسانے کی محفلوں کے انعقاد کی اجازت دیتا ہے بلکہ انہیں وہ اہل باطل وخسارت کی مجلسیں شمار کرتا ہے۔(۳)

نیز اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسلام خوف خدا سے یا اولیائے الٰہی کی وفات پر گریہ کا حکم نہ دے، کیونکہ ایسا گریہ دل کو پاکیزگی وصفاء عطا کرتا ہے، دوسروں کے ساتھ انس والفت ایجاد کرتا ہے اور سکون باطن وسرور دل کا باعث ہے۔

تیسرا : نفسیات کی روشنی میں خوشی

اس سوال کے جواب اور مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے لئے نفسیات کے نکتہ نظر سے چند اہم وضروری نکات پر توجہ ضروری ہے۔

۱) خوشی کی تعریف

۲) خوشی کو پانے کے طریقے

خوشی کی تعریف

خوشی علم النفسیات کے ان محدود موضوعات میں سے ایک ہے کہ جن کے بارے زیادہ گفتگو نہیں کی گئی لیکن پھر بھی خوشی کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں:

> ''خوشی وہ مثبت احساس ہے جو کامیابی کی حس کے پورا ہونے پر حاصل ہوتا ہے''

---

(۱) اصول کافی، ج ۲، کتاب الدعا و باب البکاء

(۲) حوالہ سابق

(۳) میزان الحکمۃ، ج ۵، ص ۳۸۲

''خوشی یعنی تمام لذتیں جو بغیر کسی درد و رنج کے ہوں''

ارسطو کے نزدیک تمام طبقات کے لوگوں کے لئے خوشی کی ایک تعریف کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ خوشی کے درجے کئے جائیں.

۱) خوشی کا نچلا درجہ یعنی لذت اٹھانا،

۲) خوشی کا درمیانی درجہ جس کی تعریف اچھی کارکردگی پر کی جاتی ہے،

۳) خوشی کا اعلیٰ درجہ یہ مفکرانہ زندگی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے،

اکثر افراد کے لئے زندگی میں لذات کے حصول کو خوشی شمار کیا جاتا ہے اور فرق نہیں کیا جاتا کہ یہ لذتیں پست و ناپسندیدہ حرکات سے حاصل ہوں یا جوانمردانہ قربانی کے ساتھ حاصل ہوں، خوشی کا ایسا مفہوم انسانی زندگی سے مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض کو خوشی کے وسائل سے وقتی خوشی ہو جائے لیکن اس سے زندگی پر رضایت کی سطح کم ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ سقراط حکیم کہتے ہیں: ''ایک سؤر کی طرح خوش رہنے سے تو بہتر ہے کہ غمگین رہیں، سؤر لذت تو اعلیٰ درجہ کی رکھتا ہے لیکن ذہنی طور پر اپنی فعالیات کی سطح نہیں جانچ سکتا، لہٰذا اپنی رضایت کو ظاہر بھی نہیں کر سکتا.

لہٰذا لذت کی ایک ایسی تعریف کی ضرورت ہے جو سب کے لئے قابل قبول ہو کہ جس میں خوشی و رضایت با سطح لذت (خوشی = رضایت + سطح لذت) موجود ہو، پس اگر خوشی کی اعلیٰ سطح مفکرانہ زندگی تک نہیں پہنچ سکتے تو کم از کم خالی لذت جس میں سطح رضایت نہ ہو پر تو راضی نہیں ہونا چاہیے جو کہ ایک حیوانی خوشی ہے.

۲) خوشی پانے کے طریقے

دنیاوی زندگی رنج و غم سے مکمل خالی تو نہیں ہو سکتی لیکن ساری زندگی رنج و غم سے بھری بھی نہیں ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ رنج و غم کے سائے پوری زندگی پر چھا جائیں اور انسان سے لذت و سرور بالکل ہی چھین لیں، لہٰذا خوشی کے مواقع کے حصول کا راستہ اپنانا

چاہیے کہ مختصر طور پر جو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ لمبی و دائمی خوشی صرف ایک طریقے سے حاصل ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زندگی اخلاقی و مذہبی ہو، پس خوشی کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان لذت حاصل کر لے اور نہ خوشی کا مطلب یہ ہے کہ انسان تمام اخلاقی، شرعی، قانونی اور عرفی حدود و قیود کو توڑ دے۔

علمی لحاظ سے خوشی کے درج ذیل مختلف طریقے موجود ہیں۔

الف) غموں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنا ب) برداشت کی قوت میں اضافہ کرنا

ج) ورزش کرنا د) سفر کرنا

ھ) تبسم و ہنسی و) خوش رنگ لباس پہننا

ط) مزاح کرنا ح) خوشی کی محافل میں شرکت کرنا

م) بن ٹھن کر رہنا ی) توقعات کم کرنا

چوتھا: صحیح اور پسندیدہ گریہ و غم کی شکل و صورت

سابقہ گفتگو کے نتیجہ کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ:

۱) خوشی کے اظہار کا ایک طریقہ ہنسنا اور تبسم ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ وہ جو پسندیدہ ہے ہمیشہ خوش رہنا ہے نہ کہ ہمیشہ ہنستے رہنا، دائمی خوشی اسلام کی پسندیدہ ہے اور زندگی کا ہدف ہے اور یہ خوشی اخلاقی و دینی زندگی کے راستے سے حاصل شدہ علمی نتائج کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

۲) درست ہے کہ ہنسی غم کا علاج ہے لیکن ہر غم کا علاج نہیں ہے، ہاں اگر جسم نقصان سے حیوانی یا متوسط انسانی زندگی کے خطرات سے غم پیدا ہو تو اس کا علاج ہنسی ہے، یہی وجہ ہے کہ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے انسان کی اعلیٰ خوشی صرف مفکرانہ زندگی کو شمار کیا ہے، پس اگر ہم خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اعلیٰ سطح کی خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور نچلے درجے کی خوشی پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے۔

اس اعلیٰ سطح کی خوشی کو روایات میں ''زاہدانہ خوشی'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام زاہدوں کے وصف میں فرماتے ہیں:

''زاہد اگرچہ دنیا میں ہنستے ہیں لیکن ان کے دل روتے ہیں وہ اگرچہ خوش ہوں لیکن ان کا غم واندوہ شدید ہے'' (۱)

با دلی خونین لب خندان بیاور همچو جام　　نی گرت زخمی رسد چون چنگ آیی در خروش (۲)

پس ہمیشہ کم درجے کی خوشیوں کو کافی نہیں سمجھ لینا چاہیے بلکہ زاہدانہ خوشی کی جستجو کرنی چاہیے، اعلیٰ درجے کی خوشی کے حصول پر گامزن ہونا چاہیے اور بچوں کی طرح ابتدائی لذات پر ہی اکتفا نہیں کر لینا چاہیے.

۳) صرف اجتماعی زندگی پر غالب ہیجان ہی خوشی نہیں ہے بلکہ فردی وشخصی زندگی کے ہیجان بھی خوشی شمار ہوتے ہیں. اگر آپ مذہبی ودینی پروگراموں سے اس کے علاوہ کا احساس پاتے ہیں تو پھر وہ ان افراطی لوگوں کا اپنا طریقہ کار ہے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اور وہ دینی ومذہبی شیوہ نہیں ہے، البتہ اسلام میں گریہ کا صرف ایک مورد ہے اور وہ خوف خدا کی وجہ سے گریہ ہے جو رات کی تاریکی میں سجدے کی حالت میں ہوتا ہے یہ نفس و روح کی عظمت ومعراج کا باعث بنتا ہے.

۴) **مذہبی پروگراموں میں تین بنیادیں مد نظر ہوتی ہیں**

الف: دینی احکام ومعارف، علمی حقائق ومطالب اور فردی واجتماعی زندگی کی ضروریات و ذمہ داریوں کا بیان کرنا،

ب: انسانی الفت ودوستی کو ایجاد کرنا،

ج: خداوند کی عبادت وبندگی،

---

(۱) میزان الحکمۃ، ج۵، ص۳۸۵

(۲) دیوان حافظ

ان تین بنیادوں سے ہٹ کر کچھ بھی ہو، چاہے گریہ ہو یا خوشی یہ مذہبی پروگرام شمار نہیں ہوگا بلکہ خاص مواقع میں دینی بنیادوں پر اضافہ کیا جاتا ہے. ان نکات کو سامنے رکھتے ہوئے اب مجالس عزا میں مصائب، نوحہ سرائی، دعا اور زیارات کو دیکھتے ہیں.

۱) اکثر دینی پروگراموں کی بنیاد گریہ و نوحہ سرائی پر قائم نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو صرف اہل بیت اطہارؑ کے ایام عزا ہی میں ہوتا ہے.

دینی معارف کے مطابق پروگراموں میں مصائب خوانی و نوحہ سرائی صرف اہل بیتؑ کے ایام غم میں ہونی چاہیے جیسا کہ خود ائمہ نے فرمایا ہے کہ:

''ہمارے شیعہ ہماری خوشی میں خوش ہوتے ہیں اور ہمارے غم میں غمگین ہوتے ہیں''(۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف غم اہل بیت کے دنوں میں غمگین ہونا چاہیے اور ان کے مصائب پڑھنے چاہئیں، جیسا کہ ہماری خوشی بھی اہل بیت علیہم السلام کی خوشی کے مطابق ہونی چاہیے، پس اگر ایام عزا کے علاوہ مصائب و عزاداری برپا کریں یا ایام خوشی کے علاوہ جشن برپا کریں تو یہ افراط و تفریط ہوگی.

۲) ان پروگراموں کی ماہیت اگر چہ گریہ ہے لیکن یہ غم و ماتم افزا نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ ہم ان پروگراموں میں گریہ کرتے ہیں، مصائب پڑھتے ہیں، نوحے پڑھتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ روح کی بالیدگی و تازگی کی صورت میں نکلتا ہے اور راہ اہل بیتؑ پر چلنے کے حوالے سے ایک تازہ ولولہ حاصل ہوتا ہے. جیسا کہ ہر ہنسی بھی خوشی نہیں ہوتی، اسی طرح اہل بیتؑ پر گریہ بھی افسردگی و بیماری نہیں ہے، لہٰذا ہم اگر روتے ہیں تو یہ وہی ارزشی گریہ ہے جو خوف خدا سے ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس گریہ کو غم انگیز نہیں کہا جاتا.

۳) مصائب و مجالس عزا کی برقراری کا مقصد اہل بیتؑ سے وابستگی و تعلق کے احساس کو

---

(۱) بحار الانوار، ج ۵۱، ص ۱۵۱

اجاگر کرنا ہوتا ہے اور شیعہ اپنی مجالس عزا میں یہی کام کرتے ہیں اور اس سے ان کے دلوں کو سکون ملتا ہے نہ ان کے گریہ کا مقصد غم واندوہ کو پیدا کرنا ہوتا ہے، اہل بیت کی مجالس عزا برپا کر کے شیعہ اہل بیت علیہم السلام کا قرض چکانے کی کوشش کرتے ہیں اور قرض کی ادائیگی سے تو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے نہ کہ غم واندوہ میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ کہ قرض کی ادائیگی صرف ان کے مصائب پر گریہ کر کے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی خوشی میں جشن کی محفلیں برپا کر کے بھی کی جاتی ہے اور اس سے بھی روح کو سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے۔

۴) اپنے پروگراموں کے آخر میں مختصر ساذکر مصیبت اہل بیتؑ یا نوحہ خوانی خود دینی و اخلاقی زندگی کا احساس ہے اور ادائے دین ہے اور ایک دینی واخلاقی زندگی تو خود خوشی ہے، اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کی خوشی کے جشن کی محفلیں منعقد کرنا بھی دینی پروگرام شمار ہوتا ہے اور خوشی وسرور کا باعث ہے۔

۵) دعا وزیارت کے دوران مصائب پڑھنا اور اس میں سے ایک حصہ دعا یا زیارت کا بلاوجہ تکرار کرنا جس سے زیارت یا دعا اس طرح پڑھے جانے سے خارج ہو جائے جیسے معصومؑ پڑھتے تھے تو یہ ایک قسم کا افراط (زیادہ روی) ہے، اس روش پر اگر آپ نے اعتراض کیا ہے تو یہ درست ہے، اس کی وجہ بھی ہم بیان کر چکے کہ یہ ایسا کرنے والوں کی کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

پس دینی مراسم و پروگرام ذیل کی چند چیزوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۱) خداوند کی عبادت و بزرگی اس طرح جیسے اہل بیت کرتے تھے،

۲) دینی امور ومعارف، علمی مسائل اور زندگی کی ضروریات ووظائف کا بیان،

۳) لوگوں کے درمیان محبت والفت پیدا کرنا،

۴) اہل بیتؑ کا قرض چکانا اور ان کے راستے پر چلنے کے لئے تازہ ولولہ حاصل کرنا،

اس جواب کے حوالے جات

۱) محمدی ری شہری۔ محمد ۔میزا ن الحکمۃ مکتب الا علام اسلامی ۱۳۶۲

۲) مجلسی . محمد با قر، بحا ر الا نو ار مو سسہ الو فا ء بیر و ت ۱۴۰۳

۳) کلینی ، محمد ، اصول کا فی

۴) طریقہ دا ر ، ابو الفضل ، شرع و شا دی حضو ر ۱۳۸۰ص ۴۳۔۱۳

۵) پلا چیك ، رابر ٹ ، ھیجا نہا ، ترجمہ محمو د رمضا ن زا دہ ، آستا ن قدس رضوی ۱۳۷۱ص ۱۵۶

۶) عزیزی ، عبا س ، فضائل و سیر ت اما م حسینؑ صلوۃ ۱۳۸۱ص ۳۶۴

۷) ایزیك مائل ، روان شنا سی شا دی ، ترجمہ مہر داد فیروز بخت و خشا یار بیگی ، بدر ۱۳۷۵ص ۸۲

۸) لطفی ، محمد حسن، دو ر ہ آثا ر افلا طو ن ج ۳

۹) کن و یز ، بہ دنبا ل شا د کامی ، ترجمہ ف شجر ی، انجمن قلم ایران ۱۳۷۹ ص ۶۷

۱۰) مطہری، مرتضٰی، حماسہ حسینی صدرا، ۱۳۶۷،ص ۹۵

۱۱) الضو اء والـلـدن فی القرآن ا لکریم ،نذیر،حمدان دارابن کثیر، بیروت ۲۰۰۲، ص ۳۸

۱۲) اکبر زا دہ ، علی ، رنك و تر بیت محمد ی، ۱۳۷۴ پ ج ا،ص ۲۴

سیاہ لباس مکروہ یا مستحب

سوال ۷۰ : سیاہ لباس کے حوالے سے دینی تعلیمات اور علمی تحقیقات کے درمیان جو تعارض پایا جاتا ہے اسے کیسے حل کریں گے؟ علمی تحقیقات کے مطابق خوش رنگ لباس پہننا انسان کی خوشی، تازگی اور فعالیت میں اضافہ کرتا ہے جب کہ سیاہ لباس اس حوالے سے منفی اثر رکھتا ہے اور ہماری مذہبی مجالس و رسوم میں کالا لباس رائج ہے، ان دونوں کا تعارض کیسے دور ہوگا؟

جواب : اس سوال میں اہم نکتہ اور ابہام اس تعارض کے بارے ہے جو علمی تحقیقات اور دینی تعلیمات کے درمیان سیاہ لباس کے پہننے کے حوالے سے پایا جاتا ہے، پہلے مرحلہ میں دیکھنا یہ ہے کہ آیا واقعاً ایسا تعارض پایا جاتا ہے، کیا علمی تحقیقات کلی طور پر کالے لباس کو تمام مواقع میں نامناسب سمجھتی ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی تعارض علمی تحقیقات ونفسیات اور دینی تعلیمات کے درمیان نہیں پایا جاتا، اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یہ آخری حدیں ہیں کالا لباس مکمل طور منفی و ناپسندیدہ ہے اور دوسرے تمام رنگوں کی نفی ہے(۱) لیکن یہ نظریہ علم النفسیات کا صرف ایک پہلو ہے۔رنگوں کا انسان کی ذہنیت پر اتنا زیادہ اثر نہیں ہے کہ فوراً ان سے متاثر ہو کر کوئی دوسرا طرز عمل اپنا لے، مثلاً نیلا رنگ انسان کے لئے سکون بخش ہے، لیکن اسے انسان کے لئے ایک مسکن دوا کے طور پر استعمال نہیں کرسکتے یا سرخ رنگ کو ایک تیز تحریک آمیز دوا کے طور پر استعمال نہیں کرسکتے، رنگوں کی تاثیر صرف جزوی طور پر قبول کی گئی ہے وہ بھی بڑی دیر کے بعد جاکر اثر کرتی ہے۔

علم النفسیات کی بعض تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ سیاہ رنگ اس وقت منفی وعدم شمار ہوتا ہے کہ جب انسان کا پہلا انتخاب قرار پائے یا پہلے تین منتخبہ رنگوں میں سے ایک ہو، لیکن اگر کالا رنگ آٹھویں نمبر پر ہو یعنی زندگی میں آخری رنگ انتخاب میں کالا قرار پائے

کہ جسے نادر موارد میں استعمال کیا جائے تو اس میں ایک مناسبت کا پتہ چلتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا حالات پر کنٹرول ہے اور اسے ایسے حالات میں بھی اپنے ارادوں اور اعمال پر تسلط حاصل ہے کہ جب اضطراب کا پیدا ہونا یقینی ہو جاتا ہے(۱).

کسی چیز سے محروم ہو جانا یا کسی شخص یا حیثیت کا چلے جانا انسان کو ایک تعارض کی ناقابل انکار کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے، ایسی صورت حال میں وہ اپنی سابقہ کیفیت کو حاصل کرنے کے لئے اور حالات کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے کچھ اقدامات اٹھاتا ہے.

سیاہ لباس پہننا جتلاتا ہے کہ ان حالات میں انسان فکر و تدبر سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے، یعنی یہ کام ان مناسب کاموں میں سے ہے جو انسان کو حالات کے کنٹرول کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، کیونکہ سیاہ لباس کے پہننے سے ایک طرح کا سکون و سکوت حاصل ہوگا اور اس کی تحریک میں کمی واقع ہوگی.(۲)

معلوم ہوا کہ علمی طور پر بھی سیاہ لباس پہننا یا پہننے کے علاوہ کالے رنگ سے استفادہ کرنا (جیسے دیواروں پر سیاہ کپڑے لہرانا) تمام حالات میں نامناسب عمل نہیں ہے، نہ ہی یہ زندگی کا اختتام و مایوسی شمار ہوگا، لہٰذا عزاداری میں اور مصیبت کے وقت سیاہ لباس پہننا اس کے غم کے لئے تسکین کا باعث ہے اور مصیبت سے پیدا ہونے والے اضطرب سے سکون و سکوت کی طرف لے جاتا ہے، اس کے علاوہ اندرونی احساسات کے ساتھ باہر کی فضا کی موافقت بھی اس سے حاصل ہو جائے گی.(۳)

غم زدہ شخص اگر مصیبت کے لمحات میں خوشی و راحت کے ماحول میں موجود ہوگا تو اس کی اندرونی صورت حال اور باہر کی فضا میں ایک طرح کا تعارض پیدا ہو جائے گا جو کہ اس کے لئے قطعاً فائدہ مند نہیں ہے، بلکہ اسے تو ضرورت اس چیز کی ہے کہ اس کی اندرونی

---

(۱) ماکس لوچہ ترجمہ منیرہ روانی پور، ۱۳۶۸

(۲) حوالہ سابق

(۳) رمضان زادہ، ۱۳۷۱

حالت کے ساتھ باہر کی فضا مناسب وہم آہنگ جائے اور زندگی کی اس نادر صورت حال میں سیاہ رنگ (آٹھویں رنگ کے طور پر) بہترین انتخاب ہے اور مثبت اثر رکھتا ہے، یہ اس میں سکون وسکوت ایجاد کرے گا اور ہر طرح کی تحریک کو کم کرے گا اور یہی اس کی ضرورت ہے.(۱)

پس ثابت ہوگیا کہ علمی لحاظ سے سیاہ رنگ انسان کی روح پر منفی اور نامناسب اثر نہیں کرتا بلکہ مصیبت میں رنج وغم کو کم کرتا ہے، لہٰذا علم اسے بطور کامل نہیں ٹھکرا سکتا البتہ دینی سنت نے اسے اہمیت دیتے ہوئے ایسے حالات میں اسے استعمال کرنے کی تاکید فرمائی ہے.

دوسری طرف سے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کیا دین نے ہمیشہ اور تمام حالات میں سیاہ لباس کی تاکید فرمائی ہے یا نفسیات شناسی کی تعبیر میں پہلا انتخاب یا پہلے تین منتخب شدہ رنگوں میں سے اسلام کیوں سیاہ رنگ کو قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو اس انتخاب کی دعوت دیتا ہے؟ اس کے جواب میں کہنا چاہیے کہ اسلام پہلی نظر میں سیاہ رنگ کو منفی نظر سے دیکھتا ہے اور ہرگز عام حالات میں اسے روزمرہ کے رنگوں میں سے قرار نہیں دیتا اور نہ ہی اس کا انتخاب کرتا ہے، بلکہ اسے شیطان، فرعون، سرکشی اور ظلم وستم کا رنگ شمار کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ''سیاہ لباس نہ پہنو یہ فرعون کا لباس ہے'' (۲) اسلام کا پہلا منتخب شدہ رنگ سفید رنگ ہے، امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں ''سفید لباس سے بہتر کوئی لباس نہیں ہے'' (۳)

سفید رنگ کے بعد اولیائے الٰہی کی طرف سے زرد اور سبز کی تاکید فرمائی گئی ہے اور یہی اسلام کے برگزیدہ رنگ ہیں. اسلام کی نظر میں زندگی، حرکت وکوشش کا رنگ سفید

(۱) اکبر زادہ، ۳، ۱۴۷

(۲) بحار الانوار، ج ۸۳، ۲۲۸

(۳) حوالہ سابق، ج ۸۷، ص ۳۲۰۔ ری شھری، میزان الحکمۃ، ج ۸، ص ۴۷۲

رنگ ہے اور کوشش و فعالیت کے بعد آرام وسکون کا رنگ سیاہ (رات) قرار دیا گیا ہے، سیاہ رنگ (جو کہ رات کا رنگ ہے) سکون وآرام کا رنگ ہے اور انسان کو دن کی بھاگ دوڑ کی تھکاوٹ کے بعد آرام دیتا ہے.(۱)

خداوند نے بھی قرآن میں رات کی سیاہی وتاریکی کو آرام وسکون اور دن کی روشنی کو جدو جہد کا ذریعہ قرار دیا ہے.(۲) مکتب اہل بیت علیہم السلام میں سیاہ رنگ کا استعمال صرف مصائب اور مجالس عزا کے دوران ہی ہوتا ہے یعنی یہ ایک نادر اور غیر معمولی حالات کا انتخاب ہے نہ کہ ہمیشہ اور تمام حالات کا انتخاب ہے. ابن ابی الحدید نقل کرتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے حضرت علی علیہ السلام کے سوگ میں سیاہ لباس زیب تن فرمایا تھا اور اس رنگ کے ساتھ لوگوں میں تشریف لائے اور آکر خطبہ ارشاد فرمایا.(۳)

ابتدائی نظر میں سیاہ رنگ مکروہ اور ناپسندیدہ رنگ ہے اور نماز میں اس کا پہننا مکروہ ہے.(۴)

سیاہ رنگ آٹھواں رنگ اور آخری انتخاب ہے وہ بھی اس عنوان سے کہ ان حالات میں اس کی تاثیر مثبت ہے یعنی غم کی شدت کو کم کرتا ہے، مصیبت زدہ شخص کے اضطراب میں کمی لا کر اسے سکون وآرام عطا کرتا ہے کہ اس بارے بہت موثر ہے.

رونے پر آمادگی

سوال ۱۷: کیا کریں که همیں امام حسینؑ کے مصائب پر رونا آئے، امام حسینؑ پر گریه کی روحی ونفسیاتی آمادگی کا کیا طریقه هے؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے علم نفسیات کی رو سے ایک

---

(۱) نذیر الحمدان،۲۰۰۲،

(۲) قصص /۷۳، اسراء /۱۲، فرقان/۴۷، یونس/۶۷

(۳) ابن ابی الحدید ،شرح نہج البلاغہ، ج۱۶،ص۲۲

(۴) طریقه دار،۱۳۸۰

طرز عمل اور ایک ہیجانی کیفیت کے جلوے کے طور پر گریہ کا معنی بیان کریں، پھر گریہ میں اثر کرنے والے اسباب وعوامل ذکر کریں گے.

گریہ کی متعدد اور وسیع اقسام ہیں، جن میں غم کے گریہ سے لے کر خوشی کے گریہ تک سب شامل ہیں، واضح ہے کہ امام حسینؑ پر گریہ سوگ وغم کا گریہ ہے، لہٰذا گریہ کی اقسام میں سے صرف غم وسوگ کے گریہ کی تعریف اور اس کے عوامل ذکر کرتا ہوں گے، غم وسوگ کا گریہ درحقیقت غمگینی کا جلوہ یعنی غم کی حالت کے احساس کے مقابل شخص کا ردعمل گریہ کی صورت میں ہوتا ہے اور عزاداری وسوگواری (گریہ جس کا جلوہ ہے) ماتم اور غم واندوہ کا اجتماعی طرز عمل ہے، لیکن اگر ہم عزاداری کرنا چاہتے ہیں تو غم حاصل کرنا ضروری ہے جس سے گریہ پیدا ہوتا ہے یعنی اگر سید الشہداء پر گریہ کرنا چاہتے ہیں تو دل میں غم حسین ہونا ضروری ہے اور داغ امام حسینؑ ہمارے دل پر ہونا چاہیے.

ای صبا نکهتی از کوی فلانی به من آر　　زار و بیمار غمم راحت جانی به من آر

گر دیگران به عیش و طرب خرمند و شاد　　ما را غم نگار بود مایه سرور

"اے باد صبا فلاں کے کوچے سے خوشبو میرے لئے لاؤ، میں غم کا مارا بیمار ہوں میری راحت جان لادو"

چونکہ گریہ کے لئے غم کا ہونا ضروری ہے لہٰذا پہلے غم کی تعریف کریں گے اس کے بعد غم پیدا کرنے والے اسباب بیان کریں گے.

غم یا غمگین ہونا ایک ردعمل ہے، ایک تکلیف دہ واقعہ کے مقابل اور ایک ایسی صورت حال وکیفیت ہے جو کسی شخص یا چیز کے ہاتھ سے دے بیٹھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے، غم وداغدیدگی وہاں ہوتی ہے جہاں کسی ایک شخص کی موت ہو جائے یا وہ چیز تلف ہو جائے جس سے انسان کو جذباتی لگاؤ ہو. پس اس شے یا شخص کے ساتھ قلبی تعلق ولگاؤ ہونا چاہیے تا کہ اس کے چلے جانے سے انسان اس کے غم میں مبتلا ہو جائے اور اس کے نہ ہونے سے غمگین ہو کر سوگ وعزا منائے، اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ غم حسین علیہ السلام آپ کے سینے

میں جاگزین ہو جائے تاکہ ان کی شہادت پر آپ غمگین ہو جائیں تو پہلے سید الشہداء سے قلبی تعلق پیدا کریں، جو دل امام حسینؑ کے ساتھ وابستہ نہیں ہے ہو سکتا ہے ان کی مخالف چیزوں کے ساتھ وابستہ ہو، اسے امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے تکلیف بھی محسوس نہیں ہوگی اور نہ اس کے آرام و سکون میں خلل پڑے گا، جیسے امام حسینؑ کے ہونے سے اسے قرار نہیں، اسی طرح ان کے نہ ہونے اسے بے قراری بھی نہیں ہوگی.

جو امام حسینؑ سے وابستہ ہے اسے امام حسینؑ ہی کی جدائی کا غم ہوگا، جب غم آ گیا جو کہ علت ہے تو اس کا معلول گریہ خود بخود آ جائے گا، کسی عزیز ہستی کے بچھڑنے کا غم ہونا یعنی گریہ کرنا.

پس معلوم ہو گیا کہ گریہ کے لئے دلبستگی و لگاؤ ضروری ہے اور امام حسینؑ کے ساتھ قلبی لگاؤ معرفت و شناخت کے مرہون منت ہے، کسی شے کی پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ آپ جو یہ جان لیں کہ آپ کی زندگی میں اس کا کیا کردار ہے خصوصاً عملی کردار اور زندگی کے مقاصد کو پانے کے لئے وہ کس حد تک مؤثر ہے اور اسے آپ کی زندگی میں کیا حیثیت حاصل ہے، جب اس کی معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کے ساتھ قلبی تعلق بھی پیدا ہو جائے گا.

علمی لحاظ سے کسی شے کی معرفت کے علاوہ اس کے ساتھ رہنے سے بھی اس کے بارے قلبی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، صرف اپنی شخصی زندگی میں تھوڑا سا غور و فکر کرنے سے بھی ان حقائق کا پتہ چل جائے گا کہ کیسے اس شخص کے چلے جانے سے جس کے ساتھ کافی وقت گذارا ہو (اگرچہ وہ اجنبی ہو) انسان غم زدہ ہو جاتا ہے اور اس میں غم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں.

اگر ہم بھی امام حسینؑ پر گریہ کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کے بارے میں اپنی معرفت میں اضافہ کریں، امام حسین علیہ السلام کی پہچان، ان کے اہداف و مقاصد،

مکتب وعقیدہ ہماری فردی، اجتماعی اور دینی زندگی میں ان کے کردار کی پہچان اور اس معرفت کے ساتھ زندگی بسر کرنا یہ وہ سب امور ہیں جو امام حسینؑ کے ساتھ قلبی تعلق ولگاؤ کا باعث بنتے ہیں، ہم نے جو یہ کہا کہ اس معرفت کے ساتھ زندگی بسر کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے مقاصد کے بارے میں ہماری شناخت ومعرفت صرف ذہنی تصور تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس معرفت کو بنیاد بنا کر زندگی بسر کی جائے، تا کہ امام حسینؑ سے تعلق پیدا ہو سکے ورنہ صرف ذہنی معرفت تو ہمیں بہت سے افراد کے بارے میں حاصل ہوتی ہے لیکن ان کے چلے جانے سے ہم غمگین نہیں ہوتے، پس معرفت کے ساتھ اس معرفت کو بنیاد بنا کر اس فرد کے ساتھ زندگی گذارنا بھی ضروری ہے یا اسے ہماری زندگی میں ایسا مقام ومرتبہ حاصل ہونا چاہیے کہ گویا اس نے مدتیں ہمارے ساتھ ایک چھت کے نیچے زندگی گذاری ہیں اس طرح سے قلبی تعلق پیدا ہوتا ہے۔

البتہ واضح ہے کہ قلبی تعلق سب کو برابر حاصل نہیں ہوتا، بلکہ کم اور زیادہ ہو سکتا ہے، ایک شخص کے ساتھ چند افراد نے زندگی گذاری ہو اور اس کی معرفت رکھتے ہوں تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا اس سے قلبی لگاؤ بھی ایک جیسا ہو، کسی میں زیادہ ہوگا کسی میں کم، جس میں یہ لگاؤ جتنا زیادہ ہوگا اسے اس کی جدائی کا غم بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

افسوس ہے کہ بعض نے یاد حسینؑ سے اپنے دل زندہ نہیں کیے، وہ امام پاک علیہ السلام کی معرفت وشناخت نہیں رکھتے، ایسے افراد نہ صرف یہ کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر غمگین ہو کر سوگ نہیں مناتے بلکہ دوسروں کے گریہ وسوگواری کا تمسخر بھی اڑاتے ہیں۔

اس جواب کے حوالہ جات

۱) داستان پری رخ، روان شناسی مرضی، سمت ۱۳۷۲، ص ۱۲۷ اور ۳۲۷۔

۲) معتمدی، غلام حسین، انسان ومرگ، نشر مرکز، ۱۳۷۲، ص ۲۱۹

۳) خسروی، زہرہ، روان درمانی داغدیدگی، نشر نقش ہستی، ۱۳۷۶ء، ص ۱۶۱ اور ۵۳
۴) شعاری نژاد، علی اکبر، فرہنگ علوم رفتاری، امیر کبیر، ۱۳۶۴ء، ص ۴۲۵.

عاشورہ کی یاد جذبات یا عاقلانہ

سوال ۷۲ : جب انسان کے اعمال، فکر و اندیشہ اور عقل و معرفت کی بنیاد پر انجام پانے چاھئیں تو پھر عاشورہ کی یاد جذبات و احساسات ابھار کر کیوں منائی جاتی ھے؟ اور جذبات میں سے بھی صرف منفی جذبات (گریہ و زاری) کا ھی انتخاب ھوتا ھے، سکوت اور ھنسی جیسے جذبات سے کیوں استفادہ نہیں کیا جاتا؟

جواب : اس سوال کے جواب کی خاطر پہلے دو مقدمے بیان کرنا ضروری ہیں.

پہلا: کون سے عوامل طرز عمل میں موثر واقع ہوتے ہیں؟ مسلمانوں اور شیعہ کا عزاداری امام حسینؑ سے مقصد کیا ہے؟

پھلا مقدمہ : ایک طرز عمل میں موثر عوامل

انسان جو بہت سے اعمال انجام دیتا ہے ان میں سے ایک طرز عمل واقعہ کربلا پر عزاداری ہے، لہٰذا انسان کے طرز عمل کے بارے نفسیات کے جو اصول وضوابط ہیں وہ اس پر بھی لاگو ہیں. ایک طرز عمل کے اظہار کے لئے جتنے اصول، قواعد اور موارد ذکر کئے گئے ہیں وہ سید الشہداء کی عزاداری جیسے عمل پر بھی صادق ہیں.

علم نفسیات کی رو سے کم از کم دو عامل انسان کے طرز عمل میں موثر واقع ہوتے ہیں. ایک معرفت، اور دوسرا جذبہ.

معرفت موجب بنتی ہے کہ انسان ایک مطلب کو سمجھ کو قبول کرلے اور اپنی معرفت کے مطابق عمل کرے. انسان جب تک ایک خاص عمل کے بارے معرفت نہ رکھتا ہو اسے انجام نہیں دے سکتا، لیکن معرفت اگرچہ عمل کے انجام کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے

لئے صرف معرفت ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک اور عامل کی ضرورت ہے جو ہمارے اندر جذبہ پیدا کرے۔ ہر کام کی انجام دہی کے لئے اس کی معرفت کے علاوہ اس کے بارے شوق اور میلان بھی موجود ہونا چاہیے تاکہ وہ کام انجام پا سکے، اس کام کے بارے میلان ہو، تاکہ اس کی انجام دہی کا اقدام اٹھائے۔

مثال کے طور پر معرفت راستہ دکھاتی ہے، لیکن طرز عمل کی گاڑی کو ایک طاقت و قوت کی ضرورت ہے جو اسے اسٹارٹ کرے اور دکھائے ہوئے پہچانے ہوئے راستے پر وہ گاڑی چل سکے، یعنی جذبہ انسان کے طرز عمل کی موٹر ہے اور معرفت راستہ دکھاتی ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ خود معرفت کسی عمل کے انجام پانے کے لئے کافی نہیں ہے اور ہمیں متحرک نہیں کر سکتی۔

اب واقعہ کربلا اور امام حسین علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے اہداف کے بارے میں ہماری معرفت اگرچہ آپ پر عزاداری و سوگواری کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جذبے کا ہونا بھی ضروری ہے۔

بہت سے لوگ امام حسین علیہ السلام کو جانتے ہیں لیکن آپ پر سوگواری کے لئے ان کے اندر کوئی جذبہ موجود نہیں ہے، لہذا سالہا سال مسلمان لباس میں زندہ رہتے ہیں، امام حسینؑ سے ناواقف بھی نہیں ہوتے لیکن آپ کی عزاداری کا ذرہ برابر شوق ان میں موجود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی عزاداری پر ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے ایک بے فائدہ و جاہلانہ بلکہ نقصان دہ عمل شمار کرتے ہیں، کہتے ہیں امام حسینؑ نے ایک قیام کیا جیسا بھی غمگین یا تلخ جو بھی تھا ختم ہو گیا، اب صدیوں بعد اس پر رونے کی کیا تک بنتی ہے یا اسے زندہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے امام حسین علیہ السلام کو کیا فائدہ ہوگا یا ہمیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

البتہ عزاداری کا جذبہ پیدا کرنے کے طریقے بھی موجود ہیں، لیکن فی الحال ہماری

گفتگو کا محور وہ نہیں ہیں بلکہ ہماری گفتگو اس پر ہے کہ عزاداران امام حسین علیہ السلام کس جذبے کے تحت عزاداری کرتے ہیں، تا کہ معلوم ہو سکے کہ وہ معرفت اور یہ جذبہ کس طرح کی عزاداری کا تقاضا کرتے ہیں.

دوسرا : شیعیان کا عزاداری کے بارے جذبہ

جذبہ کس طرز عمل کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی جب سوال کرتے ہیں کہ فلاں عمل کا جذبہ کیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طرز عمل کے اپنانے کی وجہ کیا تھی، جس کی وجہ سے یہ عمل انجام دیا گیا ہے.

یہاں بھی بہتر ہے کہ معلوم ہو جائے کہ عزادار مسلمان کس وجہ سے واقعہ عاشورہ کی یاد مناتے ہیں؟ البتہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص اپنی معرفت کی بنیاد پر عزاداری کا اپنا ایک خاص جذبہ رکھتا ہو جو صرف اسی کے ساتھ مربوط ہو، یعنی اس میں مختلف طرح کے جذبات کارفرما ہو سکتے ہیں. لیکن یہاں ہمارا مقصد ان سب جذبوں کو فہرست وار بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ ہماری مراد اس جذبے کا بیان کرنا ہے جو دینی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو یا ایک عام جذبہ ہو جو تمام عزاداروں کے لئے عزاداری کی وجہ بن سکتا ہو.

اسلامی فکر کی گہرائی اور انسانوں کی یاداشت میں تاریخ ساز واقعات کی یاد درج ذیل تین جذبوں میں سے کسی ایک وجہ سے منائی جاتی ہے.

۱) اس واقعہ کی یاد کو زندہ رکھنے اور اس کی تجدید کی خاطر،

۲) اس واقعہ کے حق کی پہچان اور اس کی ادائیگی کی خاطر،

۳) اس واقعہ سے آج کی زندگی کے لئے درس عبرت لینے کی خاطر،

اس لحاظ سے انسانی زندگی کے تمام ادوار میں واقعہ عاشورہ کو رسالت کے تسلسل (۱) اور دین کے اہداف و مقاصد کی تکمیل (معاشرہ کی ہدایت) میں ایک بڑا کردار حاصل رہا

---

(۱) یہ حدیث نبوی "حسین منی و انا من الحسین" کی طرف اشارہ ہے، تاریخ اسلام، ج ۳، ص ۱۹

ہے، لہٰذا اس کی یاد منا کر ہم اپنے ذہن اور دینی ماحول میں اسے زندہ رکھتے ہیں تا کہ ہماری زندگی کے لئے ہمیشہ نمونہ عمل بنا رہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے اذہان میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ وہ امام حسینؑ کے مقروض ہیں اور اسی احساس کے ساتھ وہ سید الشہداء کی مجلس عزا میں شرکت کرتے ہیں تا کہ اس طرح سے اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکیں۔

اب ممکن ہے کسی کے لئے واقعہ کربلا میں فی الحال ہدایت موجود نہ ہو لیکن جب یہ واقعہ ہوا اس وقت جو اس سے اسلام کو فائدہ پہنچا اس کی بنا پر اس کا حق آج بھی آپ کی گردن پر ثابت ہے اور اس حق کی کم از کم ادائیگی یہ ہے کہ عزاداری کی مجالس میں شرکت کریں، البتہ عاشورہ حسینی کی یاد منانے سے حق و قرض کی ادائیگی کے ساتھ پیغام عاشورہ کی یاد منا کر ہم قیام امام حسین علیہ السلام کو اپنے لئے نمونہ عمل بھی بنا سکتے ہیں تا کہ حق و باطل کی کشمکش میں حسینی کردار کا مظاہرہ کیا جائے۔

واضح ہے کہ کسی عمل کا جذبہ اس کی شکل وصورت اور مقدار کی تعیین بھی کرتا ہے، جو عمارت رہائش کی غرض سے تعمیر کی جاتی ہے وہ اس عمارت سے فرق رکھتی ہے جو تجارت کی غرض سے تعمیر کی جاتی ہے۔

واقعہ عاشورہ کی یاد بھی اس طرح منائی جانی چاہیے کہ اس کے اہداف و مقاصد کو پورا کر سکے، کیسے مجالس عزاداری برقرار کی جائیں تا کہ حق ادا ہو سکے، کیسے شہادت حسینؑ بن علیؑ کی یاد منائیں تا کہ ان کی تعظیم کے ساتھ ساتھ اس سے درس زندگی لے سکیں اور وہ رسالت کا تسلسل بن سکے؟

کیا ایک محفل موسیقی کے ساتھ حسینؑ بن علی علیہ السلام کی یاد منا سکتے ہیں، ان کا حق ادا کر سکتے ہیں؟ کیا تھوڑی دیر کے لئے خاموشی اختیار کر کے یہ حق ادا کیا جا سکتا ہے، کیا رقص و سرور کی محفل سے یہ ممکن ہے؟ کیا ایک سیمینار یا مقالے پڑھنے سے اہداف و مقاصد امام

حسینؑ کو زندہ رکھا جا سکتا ہے اور خط رسالت کو تسلسل دیا جا سکتا ہے؟

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا عمل کی شکل وصورت ایسی ہو جو اس مقصد کو پورا کر سکے جس کی خاطر یہ عمل منعقد کیا جا رہا ہے، لہٰذا اس کی بعض شکلیں تو ایسی ہیں جو نہ صرف اس کے مقاصد کو پورا نہیں کرتیں بلکہ ان مقاصد کو ضائع کرتی ہیں، حسینؑ جو راہ عدالت وحق کے شہید ہیں، ان کی یاد محفل رقص وموسیقی سے تو نہیں منائی جا سکتی اور نہ اس سے ان کے مقصد کو زندہ کیا جا سکتا۔

بعض شکلیں ایسی ہیں جو مقصد کو ضائع تو نہیں کرتیں لیکن اسے پورا بھی نہیں کرتیں بلکہ صرف اس کے بعض پہلوؤں کو پورا کرتی ہیں یا اصلاً اس کے مقصد سے بے ربط ہیں، جیسے کچھ دیر کی خاموشی مقصد امام حسینؑ کو کیسے زندہ رکھ سکتی ہے؟

ایک سیمینار یا ایک علمی مقالہ اگرچہ امام حسینؑ کے اہداف ومقاصد کے بارے ہماری معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن امام حسینؑ کے مقصد کو زندہ رکھنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

ہم میں سے اکثر کو عفو ودرگذر کے خیر ہونے کا پتہ ہے لیکن اس کے انجام دینے کا جذبہ نہیں رکھتے، مقاصد حسینی اور ان کے ہماری دنیاوی واخری سعادت میں کردار کے بارے صرف ہماری معرفت کافی نہیں ہے کہ ہم امام حسینؑ کے راستے پر قدم بڑھائیں۔

واقعہ عاشورہ کی یاد اس وقت ہمیں ان کی راہ پر چلنے کے لئے کرے گی جب ہمارے اندر اس کا جذبہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے ہمارے اندر اس کے انجام دینے کی خواہش پیدا ہو جائے اور ہم اس نہضت کے ساتھ ساتھ قدم بڑھائیں ہمارے جذبات ابھارنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم بھی حسینی کام کر سکیں اور اس طرح سے ان کا حق ادا کر سکیں اور ان کی یاد کو زندہ رکھ سکیں۔

اور ان مجالس سے تب حق کی ادائیگی اور مقاصد حسینی حاصل ہو سکتے ہیں کہ جب یہ

کم ازکم دو عنصر پر مشتمل ہوں.

۱) امام حسینؑ، ان کی نہضت اور ان کے اہداف و مقاصد کی معرفت کی بنیاد پر برقرار ہوں.

۲) اس معرفت کے بعد انسان کے جذبات و احساسات کو امام حسینؑ کے راستے پر قدم اٹھانے کے حوالے سے ابھاریں اور تحریک دیں، یعنی شعور بھی دیں اور شوق و میلان بھی دیں، شعور حسینی اور جذبہ حسینی افکار و اذہان میں زندہ کر دیں تا کہ حسینی کام کیا جا سکے.

اب آپ کی یہ بات کہ چلیں جذبات و احساسات ابھارنا تو ٹھیک لیکن ان میں سے صرف منفی جذبے یعنی گریہ وزاری کا انتخاب کیا گیا ہے کہ مرثیے، مصائب اور نوحے پڑھے جاتے ہیں؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ گریہ، ہنسی اور خوشی سب جذبات ہی کی حالتیں ہیں لیکن ان کی تاثیر ایک جیسی نہیں ہے، لہٰذا ہمیں ایسے احساس کا انتخاب کرنا ہوگا کہ جو اس معرفت و شعور کے ساتھ ساتھ اس غرض و جذبے کو بھی پورا کر سکے جو ان مجالس میں ہمارے مدنظر ہے، اگر امام حسین علیہ السلام کی یاد ہنسی و خوشی کی محفلیں منعقد کر کے منائی جائے تو اس سے مقصد امام حسین علیہ السلام کو زندہ نہیں کیا جا سکتا، ہنسی مذاق آدمی میں شہادت کا جذبہ بیدار نہیں کر سکتے اور نہ ہی استقامت و پائیداری اور ثابت قدمی کی دعوت دے سکتے ہیں.

دوسری طرف انسان کے جذبات و احساسات کا گریہ کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے، جب کہ مل کر ہنسنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کوئی قلبی یا جذباتی تعلق بھی ہو بہت سے لوگ جو آپ کی ہنسی و خوشی میں آپ کے شریک ہوتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں پتہ ہوتا ہے کہ انتہائی ناراض و ناخوش ہیں یعنی دل سے خوش نہیں ہوتے صرف خوشی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن گریہ و سوگواری میں ظاہر و باطن کا یہ اختلاف کم تر ہوتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ خوشی میں شریک ہونا کوئی فن نہیں ہے، فن تو یہ ہے کہ وہ آپ کے دکھ اور درد کا ساتھی ہو،

اس کے علاوہ کسی واقعہ سے متاثر ہونے کی گہرائی غمگین ہونے سے ہی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ خوشی میں۔

ان دو نکات کو سامنے رکھتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کی ہمراہی کی گہرائی گریہ ہی کی حالت میں ظاہر ہو سکتی ہے، گریہ و سوگواری سے مصیبت زدہ شخص کے ساتھ مخلصانہ ہمراہی کا پتہ چلتا ہے، اگر اس کے ساتھ مکمل ہمدردی و ہمراہی ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے غم و حزن میں شریک ہوں نہ کہ اس کی خوشی میں شریک ہو کر یہ ثابت کریں، اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جو یاد مجالس عزا و سوگواری کے ذریعے منائی جاتی ہے وہ مقصد امام حسین علیہ السلام کو زندہ رکھنے اور امام حسینؑ کے ساتھ ہمدردی و ہمراہی اور حق کی ادائیگی پر بہتر دلالت کرتی ہے۔

اس جواب کے حوالہ جات

۱) ایڈوارڈ ج موری، انگیزش و ہیجان، ترجمہ براہینی محمد تقی، شرکت سہامی چہر، ۱۳۶۳، ص ۳۲

۲) مہر آراء علی اکبر، زمینہ روان شناسی اجتماعی، انتشارات مہر داد ۱۳۷۳، ص ۱۸۴

۳) مصباح، محمد تقی، آذرخشی دیگر از آسمان کربلا، انتشارات موسسہ آموزش، پژوہشی امام خمینی ۱۳۷۹، ص ۱۱-۲۰

۴) رسولی محلاتی، سید ہاشم، خلاصہ تاریخ اسلام، ج ۳ انتشارات دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳۷۲، ص ۱۹

ساتواں حصّہ

اِحکامِ عزاداری

سیّد مجتبیٰ حسینی

شبیہ خوانی

سوال ۷۳ : اکثر جگھوں پر (ایران میں) شبیہ خوانی نام کی ایک پرانی رسم بر قرار ھے ھو سکتا ھے لوگوں پر کوئی مثبت اثر بھی رکھتی ھو، شرعاً اس کا کیا حکم ھے؟

جواب : سب فقھاء : اگر شبیہ خوانی میں جھوٹ اور باطل شامل نہ ہو اور موجودہ دور کے لحاظ سے مذہب کی کمزوری و بدنامی کی باعث نہ بنے تو اس میں کوئی ڈر نہیں، البتہ بہتر ہے کہ اس کی جگہ پر مجلس وعظ و نصیحت، مصائب خوانی اور مرثیہ و نوحہ خوانی انجام دی جائے.(۱)

آیۃ اللہ صافی : اگر تعزیہ و شبیہ خوانی کی رسم میں حرام کام نہ ہو تو کوئی ڈر نہیں (۲).

---

(۱) امام، استفتاءات، ج۲، ومکاسب محرمہ، ص۷۰، خامنہ ای، اجوبۃ الاستفتاءات، ص۱۳۳۰، مکارم، استفتاءات ج۱، ص۵۷۲ و ۵۷۳، فاضل، جامع المسائل، ج۱، ص۲۱۶۶، ۲۱۷۰، نوری استفتاءات، ج۲، ص۵۹۶، تبریزی، استفتاءات، ص۲۰۰۳، ۲۰۰۵، ۲۰۱۴

(۲) صافی، جامع الاحکام، ج۲، ص۱۵۹۹

عَلَم وعزاداری

سوال ۷۴ : عزاداری میں عَلَم رکھنا یا ماتم داری کے دوران علم ساتھ اٹھانا کیا حکم رکھتا ہے ؟

جواب: امام خمینی ، شیخ جواد تبریزی ، ناصر مکارم اور آقا سیستانی : کوئی ڈر نہیں. (۱)

آقای خامنہ ای : خود اس میں تو کوئی ڈر نہیں لیکن اسے جزء دین نہ سمجھا جائے.(۲)

نوری ہمدانی : معمول کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں. (۳)

صافی گلپائگانی: علم کا شعار الٰہی سے ہونا بعید نہیں ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں.(۴)

عزاداری میں موسیقی

سوال ۷۵ : عزاداری میں آلات موسیقی و لہوی کا استعمال کیا حکم رکھتا ہے ؟

جواب : بہجت و صافی کے علاوہ باقی سب فقہاء :

اگر ایسے آلات ہوں جو لہو و حرام کے ساتھ خاص ہوں، ان کا بجانا ہر حال میں جائز نہیں ہے اور اگر مشترکہ آلات میں سے ہوں تو پھر اس کا جائز کام میں بجانا کوئی حرج نہیں رکھتا اور موسیقی کے حکم میں عزاداری اور جشن کے پروگراموں میں کوئی فرق نہیں.(۵)

---

(۱) امام استفتاءات ج ۲،مکاسب محرمہ ،ص ۴۷،تبریزی،استفتاءات ،ص ۲۰۰۷،فاضل، جامع المسائل ،ج ۱،ص ۴۱۷،۲۱۷،مکارم،استفتاءات،ج ۱،ص ۵۷۹،سیستانی،سائٹ،شعائر دینی،ص ۶

(۲) خامنہ ای،اجوبۃ الاستفتاءات،ص ۱۳۳۲ (۳) نوری،استفتاءات،ج ۲،ص ۵۹۸، و۶۰۴

(۴) صافی،جامع الاحکام،ج ۲ص ۱۵۹۵

(۵) امام استفتاءات،ج ۲،مکاسب محرمہ،ص ۳۰،خامنہ ای،اجوبۃ،ص ۱۱۶۴،فاضل،جامع المسائل ج ۱،ص ۹۹۴،مکارم،استفتاءات،ج ۱،ص ۵۲۴و۵۲۵،ص ۷۰۷و۱۰۴۷،تبریزی،استفتاءات،ص ۱۰۶۵،۱۰۵۴،صراط النجاۃ،ج ۱،ص ۱۰۰۵،دفتر سیستانی،وحید و نوری

بھجت : اگر ایسے آلات میں سے ہو جو حرام سے مختص ہے تو اس کا لہوی طرز پر بجانا حرام ہے اور بنا بر احتیاط واجب غیر لہوی صورت پر بھی بجانا جائز نہیں ہے، لیکن اگر مشترکہ آلات میں سے ہو تو اسے جائز کاموں میں استعمال کرنا کوئی حرج نہیں رکھتا اور موسیقی کے حکم میں عزاداری اور جشن کے پروگرام فرق نہیں رکھتے (۱).

صافی گلپائگانی : آلات موسیقی (آلات لہو) کا بجانا ہر حال میں کلی طور پر حرام ہے اور عزاداری و جشن کی محفلوں میں موسیقی کا حکم کوئی فرق نہیں رکھتا. (۲)

سوال ۷۶ : تعزیہ وجلوس میں شہنائی ، بانسری اوراس جیسے دوسرے آلات بجانے کا کیا حکم ہے ؟

جواب : امام خمینی ، آقای خامنہ ای و فاضل لنکرانی : آلات موسیقی کا طرب آور و لہوی انداز میں بجانا جو کہ مجالس لہو و گناہ سے مناسبت رکھتا ہو حرام ہے.(۳)

مکارم ، سیستانی ، تبریزی ، نوری اور وحید خراسانی : آلات موسیقی کا لہوی اور مجالس گناہ و سرور کے انداز میں بجانا حرام ہے.(۴)

صافی و بھجت : ہاں ہر صورت میں اشکال رکھتا ہے.(۵)

تبصرہ : آقای صافی اور بھجت کے علاوہ باقی مراجع کی نظر میں جشن و عزاداری اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں رکھتے، آلات لہو کا لہوی صورت میں بجانا حرام ہے، لیکن غیر لہوی صورت میں بجانا جائز ہے.

---

(۱) بھجت، توضیح المسائل متفرقہ،م۲۰

(۲) صافی، جامع المکارم ،ج۱،س۱۰۰۳و۱۰۱۵و۱۰۱۸

(۳) امام، استفتاءات،ج۲، مکاسب محرمہ ،س۳۵،خامنہ ای،اجوبۃ الاستفتاءات،س ۱۱۶۱،فاضل، جامع المسائل ج۱،س۹۸۸و۲۱۷۳

(۴) مکارم،استفتاءات،ج۱،س۵۱۶و۵۲۱،نوری، استفتاءات،ج۲،س۵۷۱،تبریزی، استفتاءات س۲۰۱۹،سیستانی،sistani.org موسیقی،س۲۳،دفتر وحید

(۵) صافی،توضیح المسائل،مسئلہ۲۸۳۳،دفتر بھجت

سوال ۷۷ : عزاداری محافل میں طبل اور دستی حلقه بجانا کیا حکم رکھتا ھے ؟

جواب :صافی و بهجت کے علاوہ سب فقہاء : اگر غیر لہوی انداز میں بجایا جائے تو کوئی ڈر نہیں.(۱)

صافی و بهجت : ان کا استعمال اشکال رکھتا ہے.(۲)

تبصرہ : بعض فقہاء کے کلام میں مذکورہ بالا آلات کے استعمال کے جواز کو اگر چہ غیر لہوی کی قید نہیں لگائی گئی لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ان کے نزدیک بھی جواز مطلق نہیں ہے بلکہ دوسرے مسائل کو مدنظر رکھنے سے غیر لہوی ہونے کی قید معتبر ہوگی.

قمہ زنی

سوال ۷۸ : آیا قمہ زنی جائز ھے ؟

جواب :امام خمینی ، آقای خامنہ ای و آقای فاضل : آج کل چونکہ اس کی کوئی ایسی توجیہ موجود نہیں جو قابل قبول ہو، لہٰذا یہ مذہب کی کمزوری و بدنامی ہونے کی وجہ سے جائز نہیں اور اس سے اجتناب ضروری ہے.(۳)

ناصر مکارم : سید الشہداء کی عزاداری اہم ترین دینی شعائر میں سے ہے اور بقائے تشیع کا راز بھی اسی میں مضمر ہے، لیکن عزاداروں کو ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جو مذہب

---

(۱) امام،استفتاءات،ج ۲،مکاسب محرمه،س ۲۷و۳۶، خامنہ ای،اجوبۃ الاستفتاءات ، س ۱۴۳۱،مکارم،استفتاءات ،ج ۱،س ۵۱۶،نوری،استفتاءات ،ج ۲،س ۶۰۲و ۵۹۶ وج ۱،س ۴۳۸،تبریزی استفتاءات،س ۲۰۰۹،صراط النجاۃ،ج ۶،س ۱۴۷۷،فاضل،جامع المسائل،ج ۱،س ۲۱۷۴

(۲) صافی،جامع الاحکام،ج ۱،س ۱۶۰۲،توضیح المسائل،م ۲۸۳۳،دفتر بہجت

(۳) امام،استفتاءات، ج ۳،سوالات متفرقہ ۳۷، خامنہ ای،اجوبہ،س ۱۴۶۱،فاضل،جامع المسائل ،ج ۱،س ۲۱۷۳

کے لئے کمزوری اور بدنامی کا باعث ہوں یا ان کے ذریعے بدن کو نقصان پہنچتا ہو.(۱)

نوری : قمہ زنی اشکال رکھتی ہے.(۲)

جواد تبریزی : سیدالشہداء کی عزاداری اہم ترین شعائر دینی میں سے ہے اور رمز بقاء تشیع ہے لیکن عزاداروں کو ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جو بدنامی مذہب یا دشمنان اسلام واہل بیتؑ کے لئے سوء استفادہ کا باعث ہوں.(۳)

صافی گلپائگانی : اگر بدن کو زیادہ نقصان نہ ہو تو سیدالشہداء کی عزاداری کے طور پر کوئی ڈر نہیں ہے.(۴)

سوال ۷۹ : آیا قمہ زنی مخفی طور پر کی جا سکتی ہے اور اگر کسی نے اس کی منت مان رکھی ہو تو وہ کیا کرے ؟

جواب : خامنہ ای: قمہ زنی عرفاً غم وحزن کا مظہر شمار نہ ہونے کے علاوہ آئمہ علیہم السلام کے زمانے میں یا ان کے بعد والے زمانوں میں اس کا وجود بھی نہیں ملتا اور معصومؑ سے اس کی تائید کے بارے کوئی حکم خاص یا عام بھی ثابت نہیں ہے اور آج کے دور میں یہ مذہب کی بدنامی کا باعث بھی ہے، لہٰذا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اور اگر کسی نے ایسی منت مانی ہو تو شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے وہ منت منعقد نہیں ہوتی.(۵)

زنجیر زنی (بغیر چھریوں والی)

سوال ۸۰ : بدن پر زنجیر مارنا جیسا کہ آج کل رائج ہے، کیا حکم رکھتا ہے ؟

---

(۱) مکارم :سائٹ :makaremshirazi.org،قمہ زنی

(۲) نوری، استفتاء ات، ج۲،ص۵۹۷

(۳) جواد تبریزی، استفتاء ات س۲۰۰۳، ۲۰۱۲، ۲۰۱۳

(۴) دفتر صافی

(۵) خامنہ ای اجوبۃ الاستفتاء ات، ج۱ ۳۶۱

جواب : آقائے خامنہ ای : اس طرح ہو کہ عام طور پر اسے غم وحزن کا اظہار شمار کیا جائے تو اس میں کوئی ڈر نہیں ہے۔

سوال ۸۱: زنجیر جن میں چھریاں بھی موجود ہوں ان کے مارنے کا کیا حکم ھے ؟

جواب : امام خمینی ، آقای خامنہ ای ، مکارم اور فاضل لنکرانی : اگر لوگوں کے درمیان ان زنجیروں کا مارنا مذہب کی بدنامی کا باعث ہو یا بدن کو کافی حد تک نقصان دہ ہو تو جائز نہیں ہے۔(۱)

صافی : اگر بدن کو زیادہ نقصان نہ پہنچائے تو سید الشہداء کے غم میں ایسا کرنا جائز ہے۔(۲)

نوری : امام حسین علیہ السلام کی عزاداری جیسا کہ شیعہ میں رائج ہے اس کے مطابق انجام پائے تو کوئی ڈر نہیں ہے۔(۳)

سینہ زنی

سوال ۸۲ : عزاداری میں قمیص اتار کر ماتم کرنے کا کیا حکم ھے ؟

جواب : اکثر مراجع کے نزدیک کوئی ڈر نہیں ہے، مگر اس صورت میں کہ خرابی وفساد کا موجب ہو تو جائز نہیں ہے ۔

مکارم : بنا بر احتیاط واجب جائز نہیں ہے۔(۴)

---

(۱) امام خمینی، استفتاءات ج ۳ ص ۳۳، ۳۷ ،خامنہ ای اجوبہ، س ۱۴۴۱، تبریزی، استفتاءات ۲۰۰۳، ۲۰۱۲، مکارم، استفتاءات ، ج ۱، س ۱۴۷۵، ج ۲ و سائٹ makaremshirazi.org قمہ زنی، فاضل جامع المسائل، ج ۱، س ۲۱۶۴، ۲۱۴۴، ۲۱۷۴۳

(۲) صافی، جامع الاحکام، ج ۲، س ۱۵۹۴

(۳) نوری ہمدانی، استفتاءات، س ۱۰۶۳، ج ۲ س ۴۰۱

(۴) ناصر مکارم سائٹ makaremshirazi.org

سوال ۸۳ : عزاداری میں آیا جائز ہے کہ جہاں عورتیں موجود ہوں وہاں قمیص اتار کر ماتم کریں ؟

جواب : امام خمینی و فاضل لنکرانی: اگر خرابی کا باعث نہ ہو تو جائز ہے اور عورتوں پر واجب ہے کہ نامحرم کے بدن پر نگاہ ڈالنے سے اجتناب کریں۔(۱)

مکارم : احتیاط واجب کی بنا پر مرد ایسے کام سے پرہیز کریں۔(۲)

تبریزی ، کوئی ڈر نہیں ہے۔(۳)

صافی : اگر نامحرم عورتوں کی نظر نہ پڑے تو جائز ہے۔(۴)

بہجت : بنابر احتیاط واجب بدن کو نامحرم سے چھپائے۔(۵)

عزاداری میں دوڑنا یا چھلانگیں لگانا

سوال ۸۴ : عزاداری کی حالت میں اوپر نیچے اچھلنا کیا حکم رکھتا ہے ؟

جواب : آقای خامنہ ای : مومنین کو ان تمام کاموں کو پرہیز کرنا چاہیے جو عزاداری سیدالشہداء کے شایان شان نہ ہوں اور اس قسم کی حرکات اگر عزاداری کی بدنامی کا باعث نہ ہوں تو کوئی ڈر نہیں ہے۔(۶)

مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی

سوال ۸۵ : بعض عورتو ں کی مجالس میں عورتیں لاوڈ سپیکر پر نوحہ و

---

(۱) امام، استفتاءات ج ۳، سوالات متفرقہ س ۳۶، فاضل، جامع المسائل، ج ۱، س ۲۱۶۳، ۲۱۶۵

(۲) مکارم، استفتاءات، ج ۲ س ۷۶۵

(۳) تبریزی، استفتاءات، س ۲۰۰۴، tabrazi.org لخت شدن عزاداران

(۴) صافی، جامع الاحکام، ج ۲، س ۱۵۹۷

(۵) بہجت، توضیح المسائل، م ۱۹۳۷

(۶) استفتاء از دفتر آقای خامنہ ای

مرثیہ پڑھتی ہیں اور ان کی آواز مردوں کو سنائی دیتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب : مکارم کے علاوہ باقی سب فقہاء: اگر عورتوں کی آواز مردوں کے لئے لذت لینے اور شہوت ابھارنے کی باعث ہو تو جائز نہیں ہے۔(۱)

مکارم : جائز نہیں ہے۔(۲)

عزاداری و نماز

سوال ۸۶ : اگر کسی سے عزاداری میں شرکت کی وجہ سے بعض واجبات جیسے صبح کی نماز قضا ہو جائے تو کیا بہتر ہے کہ اس کے بعد عزاداری کی مجالس میں شرکت نہ کرے یا یہ کہ اس کی عدم شرکت اہل بیتؑ سے دوری کا باعث ہو گی؟

جواب : سب فقہاء: نماز سب چیزوں پر مقدم ہے اور عزاداری میں شرکت کو بہانہ بنا کر نماز قضا نہیں کی جا سکتی، لیکن عزاداری میں شرکت نماز کے مقابل نہیں ہے، بلکہ یہ مستحب موکدہ ہے لہذا دونوں پر عمل کرے۔

سوال ۸۷ : کیا عزاداری کو جاری رکھا جائے یا اول وقت نماز جماعت قائم کی جائے؟

جواب : سب فقہاء: نماز جماعت مقدم ہے، جیسا کہ خود امام حسینؑ نے عاشورہ کے دن ظہر کی نماز قائم فرمائی، لہذا اہل بیتؑ کے ماننے والوں کو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہر حالت میں نماز کو اول وقت میں جماعت کے ساتھ قائم کریں کیونکہ ائمہ معصومینؑ ان کی

(۱) فاضل، جامع المسائل، ج۱، س۲۱۸۲، صافی، جامع الاحکام، ج۲ س۱۶۸۱، خامنہ ای، اجوبہ، س۱۱۳۵، نوری استفتاءات، ج۲، س۵۲۵، امام، استفتاءات، ج۳، احکام نظر، تبریزی، استفتاءات، س۱۰۵۸، دفتر: حوالہ سابقہ، بہجت وسیستانی۔

(۲) ناصر مکارم، استفتاءات، ج۲ س۶۳۷، ج۱ س۷۸۵، دفتر

اولاد واصحاب کی ساری کوشش اور شہادت کا مقصد دین کی برپائی تھا اور معرفت خدا کے بعد سب سے بڑھ کر نماز ہے۔(۱)

سوال ۸۸ : مسجد سے قرآن کی آواز اور امام بارگاہ سے مجلس کی آواز لاؤڈ سپیکر کی وجہ سے بہت بلند ہوتی ہے اس طرح کہ ہمسائیوں کے آرام وسکون میں خلل انداز ہو جاتی ہے، جب کہ وہاں کی انتظامیہ اس بارے میں کچھ سننے پر آمادہ نہیں ہے ایسی صورت میں وظیفہ کیا ہے ؟

جواب :سب فقہاء: دینی شعائر کا ان کے مناسب وقت میں برپا کرنا اگرچہ بہترین کام ہے اور مستحب ہے، لیکن منعقد کرنے والوں پر واجب ہے کہ جتنا ہو سکے ہمسایوں کے لئے اذیت وتکلیف پیدا کرنے سے پرہیز کریں (یعنی سپیکر کی آواز کم رکھیں) (۲)

عاشورہ میں منت

سوال ۸۹ : کسی نے منت مانی کہ عاشورہ کے دن لوگوں کو حلیم دے گا کیا اس کی جگہ کوئی دوسری غذا دے سکتا ہے یا یہی منت والی حلیم عاشورہ کے علاوہ محرم کے کسی دن میں دے سکتا ہے ؟

جواب : سب فقہاء: اگر منت صحیح شرعی صیغہ کے ساتھ کی ہو تو اسی صورت میں ادائیگی ضروری ہے جیسے منت مانی تھی اور اگر شرعی صیغہ نہیں پڑھا تھا تو اسے اختیار ہے جیسے چاہے انجام دے۔(۳)

---

(۱) فاضل، جامع المسائل، ج۱، ص۲۱۷۶، ۲۱۷۷، نوری، استفتاءات، ج۲، ص۵۹۹، دفتر سب فقہاء

(۲) خامنہ ای، اجوبۃ الاستفتاءات، ص۱۳۴۷، بقیہ فقہاء کے دفتر سے،

(۳) امام، استفتاءات، ج۲ نذر، ص۲۰، ۲۶، بہجت، توضیح المسائل، مسئلہ ۲۱۳۵ مکارم، استفتاءات، ج۲، ص۱۳۵۵، ج۱، ص۱۰۱۳، فاضل لنکرانی، جامع المسائل، ج۱، ص۸۳۲۶، نوری ہمدانی، استفتاءات، ج۲، ص۷۲۵، جواد تبریزی، استفتاءات، ص۱۷۳۳، بقیہ مراجع کے دفتر سے یعنی آقای خامنہ ای، وحید خراسانی اور صافی گلپائگانی

سوال ۹۰ : کیا محرم کے دوران زیب و زینت کرنا ، بال رنگنا اور عورتوں کا میک اپ کرنا جائز ہے ؟

جواب : سب فقہاء : اگر اس سے گناہ نہ ہو اور عزاداری کی بے حرمتی کا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، لیکن غیرت مند افراد کو چاہیے کہ محرم کے دوران اس طرح کے کاموں سے پرہیز کریں اور دوسری محفلوں میں یہ کام کریں، کیونکہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"خداوند ہمارے شیعہ پر رحمت نازل کرے کہ وہ ہماری خوشی میں خوش ہوتے ہیں اور ہماری مصیبت کے دنوں میں محزون و غمگین ہوتے ہیں"

اور مسلّم ہے کہ محرم آئمہ علیہم السلام کے لئے غم و اندوہ کا مہینہ ہے۔

محرم میں شادی

سوال ۹۱ : کیا ماہ محرم کے دوران شادی بیاہ کرنا جائز ہے ؟

جواب : سب فقہاء : اگر اس میں گناہ نہ ہو اور اس سے سید الشہداء کی بے احترامی لازم نہ آئے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن یہ مد نظر رہے کہ ایسی شادی میں کوئی برکت نہیں ہوگی اور غیرت مند مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے کام دوسرے مہینوں میں انجام دیں اور محرم میں صرف غم سید الشہداء امام حسین علیہ السلام منائیں۔

امام حسین علیہ السلام کے قیام کے مراحل تاریخ وار

۱)	حاکم مدینہ ولید کی طرف سے بیعت کی درخواست	بروز جمعہ ۲۷ رجب، ۶۰ ہجری
۲)	امام حسینؑ اور ولید میں دوسری ملاقات	ہفتہ ۲۸ رجب، ۶۰ ہجری
۳)	امام حسینؑ کا مدینہ سے خروج	اتوار کی رات ۲۸ رجب، ۶۰ ہجری
۴)	امام حسینؑ کا مکہ میں ورود	شب جمعہ ۳ شعبان، ۶۰ ہجری
۵)	امام حسینؑ کا مکہ میں قیام	شعبان تا ۸ ذی الحجہ، ۴ ماہ پانچ دن۔
۶)	اہل کوفہ کا امامؑ کی خدمت میں پہلا خط پہنچا	بروز بدھ ۱۰ ماہ رمضان، ۶۰ ہجری
۷)	مسلم بن عقیل کا مکہ سے نکلنا	بروز پیر ۱۵ رمضان، ۶۰ ہجری
۸)	مسلم کا کوفہ پہنچنا	منگل ۵ شوال، ۶۰ ہجری
۹)	شہادت مسلم بن عقیل	بروز منگل ۸ ذی الحجہ، ۶۰ ہجری
۱۰)	خروج امام علیہ السلام از مکہ	بروز منگل ۸ ذی الحجہ، ۶۰ ہجری
۱۱)	امامؑ کا کربلا پہنچنا	بروز جمعہ ۳ محرم، ۶۱ ہجری
۱۲)	عمر سعد کا کربلا پہنچنا	جمعہ ۳ محرم، ۶۱ ہجری
۱۳)	عمر سعد کا لشکر کو ترتیب دینا اور امامؑ سے گفتگو	از ۳ تا ۶ محرم، ۶۱ ہجری
۱۴)	امامؑ پر پانی کا بند ہونا	بروز منگل ۷ محرم، ۶۱ ہجری
۱۵)	امام کے لشکر پر ابتدائی حملہ	جمعرات ۹ محرم، ۶۱ ہجری
۱۶)	واقعہ عاشورہ	بروز جمعہ ۱۰ محرم، ۶۱ ہجری
۱۷)	اسیروں کا کربلا سے کوچ	بروز ہفتہ بعد از ظہر ۱۱ محرم، ۶۱ ہجری

فہرست

حصہ اول (تاریخ وسیرت)

پیش لفظ ۵

معاویہ کے دور میں قیام نہ کرنا ۸

اول: صلح نامہ کا وجود ۹

دوم: معاویہ کی منزلت ۱۱

سوم: معاویہ کی سیاست ۱۱

چہارم: زمانے کے تقاضے اور حالات ۱۳

مدینہ میں قیام نہ کرنا ۱۴

مکہ کی طرف ہجرت ۱۶

مکہ سے خروج ۱۹

پہلا: جانی خطرہ کا احتمال ۲۰

دوسرا: حرمت حرم کی حفاظت ۲۰

کوفہ کا انتخاب ۲۱

پہلا نظریہ شہادت ۲۳

دوسرا: اسلامی حکومت کی تشکیل ۲۵

امام حسین علیہ السلام کے قیام کی عقلی بنیادی ۳۲

یمن کو منتخب نہ کرنا ۳۵

کوفیوں کی خیانت ۳۷

۱:۔ نفسیاتی اقدامات ۴۱

۲:۔ اجتماعی چالیں ۴۲

۳:۔ اقتصادی چالیں ۴۳

کربلا میں پیاس ۴۷

پانی مانگنا ۵۰

امام حسین علیہ السلام کے سر کا دفن ۵۳
امام حسین علیہ السلام کے اصحاب ۵۷
پہلا حصہ :۔ اصحاب امام کی وفاداری ۵۸
دوسرا حصہ :۔ اصحاب کی تعداد ۵۹
پہلا :۔ بنی ہاشم کے افراد ۶۰
دوم :۔ اصحاب میں جو زندہ رہے ۶۱
بی بی شہربانو ۶۲
امام سجاد علیہ السلام کی والدہ گرامی ۶۳
امام سجاد علیہ السلام کی والدہ کا کربلا میں موجود نہ ہونا ۶۹
بی بی شہربانو کا مقبرہ ۶۹
یزید کی توبہ ۷۰

دوسرا حصہ (فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر ۷۸
امر بالمعروف اور خطرہ ۸۰
یزید کی بیعت نہ کرنا ۹۱
یزید کی حکومت کے خطرات ۹۹
کربلا میں اتمام حجت ۱۰۲
شہادت کا علم ۱۰۴
نفس کا ہلاکت میں ڈالنا ۱۰۷
عورتوں کا کردار ۱۱۰
پہلا : پیغام پہنچانا ۱۱۴
دوسرا : بنی امیہ کے پروپیگنڈے کا توڑ ۱۱۵
تیسرا : ظالموں کے چہرے سے نقاب کھینچنا ۱۱۸

تیسرا حصہ (سیاسی فکر)

پہلا: ڈیموکریٹک نظریہ میں حق خروج	۱۲۳
دوسرا: نظریہ حق الٰہی میں شورش وخروج	۱۲۵
اہل سنت کا نظریہ	۱۲۶
شیعہ نظریہ	۱۲۷
ظالم حکومت میں شورش وخروج	۱۲۷
خروج کے مراحل	۱۲۹
شرعی حکومت میں سرکشی وخروج	۱۳۲
نمائندوں کے خلاف سرکشی	۱۳۳
عاشورا اور دین وسیاست میں رابطہ	۱۳۴
پہلا: حکومت کا فلسفہ اور اہداف	۱۳۶
دوسرا: الٰہی حکومت کا جواز	۱۳۷
تیسرا: اسلامی حاکم کی شرائط	۱۴۰
احکام الٰہی کا علم	۱۴۱
خدا کی کتاب اور سنت رسول پر عامل ہو	۱۴۱
عدالت برپا کرنے والا ہو	۱۴۲
ابن زیاد کا قتل نہ کیا جانا	۱۴۲
ٹیرر (دھوکہ سے قتل) کا عدم جواز	۱۴۳
الف:۔ ٹیرر (دہشت گردی) مغربی ادب	۱۴۴
ب:۔ اسلامی ادب میں ٹیرر	۱۴۵
عاشورہ اور اسلامی انقلاب	۱۵۰
پہلا:۔ انقلاب اسلامی کی پیدائشگاہ میں عاشورائی فرہنگ کے اثرات	۱۵۱
ا:۔ انقلابیوں کے اہداف ومقاصد پر اثرات	۱۵۲

۲:۔ رہبر انقلاب پر اثرات ۱۵۳
۳:۔ مبارزے کے انداز پر اثرات ۱۵۳
۴:۔ عزاداری کے مقامات وایام کے اثرات ۱۵۴
دوسرا:۔ انقلاب اسلامی کی کامیابی میں عاشورائی فرہنگ کے اثرات ۱۵۴
تیسرا:۔ انقلاب اسلامی کی بقاء میں فرہنگ عاشورہ کی تاثیر ۱۵۵

چوتھا حصہ (عزاداری کا فلسفہ)

فلسفۂ عزاداری ۱۶۰
الف:۔ محبت و دوستی ۱۶۱
ب:۔ انسان سازی ۱۶۲
ج:۔ معاشرہ کی تعمیر ۱۶۳
د:۔ شیعہ فرہنگ و ثقافت کو اگلی نسل تک منتقل کرنا ۱۶۳
روایات میں عزاداری ۱۶۴
عزاداری کی تاریخ ۱۶۶
امام سجاد علیہ السلام کی عزاداری ۱۶۷
امام محمد باقر علیہ السلام کی عزاداری ۱۶۸
امام صادق علیہ السلام کی عزاداری ۱۶۸
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی عزاداری ۱۶۹
امام رضا علیہ السلام کی عزاداری ۱۶۹
امام زمان (عجل) کی عزاداری ۱۷۰
سیاہ لباس ۱۷۶
۱:۔ سیاہ پوشی کی تاریخ ۱۷۸
۲:۔ اہل بیت علیہم السلام کا سیاہ لباس پہننا ۱۸۰
۳:۔ عباسیوں کے سیاہ لباس کی وجہ ۱۸۱
عزاداری کی روش وطریقہ ۱۸۲
زمان عزاداری ۱۸۹

ثواب عزاداری ۱۸۹
اہمیت زیارت عاشورہ ۱۹۳

پانچواں حصہ (اخلاق و عرفان)

خدا کا انتقام ۲۳۶
سیر و سلوک میں گریہ کا کردار ۲۳۹
گریہ و سوز کے اس طرف ۲۴۳
۱:۔ سوز و گریہ اور سکون و اطمینان ۲۴۳
۲:۔ سوز و گریہ اور لذت و خوشی ۲۴۴
۳:۔ سوز و گریہ اور قرب حضرت حق ۲۴۶
عاشقانہ یا عاقلانہ ۲۴۷
عاشورہ کے حسین و خوبصورت پہلو ۲۴۹
۱:۔ تجلی کمال آدم ۲۵۰
۲:۔ قضاء خدا پر رضا کا جلوہ ۲۵۰
۳:۔ حق و باطل کا رسم الخط ۲۵۱
۴:۔ خالص فتح کا ظہور ۲۵۲
۵:۔ مشیت خدا کے راستے پر چلنا ۲۵۳
۶:۔ شب قدر عاشورہ ۲۵۴
عاشورہ کے اخلاقی و عرفانی پہلو ۲۵۵
پہلا:۔ امام حسین علیہ السلام کے اخلاق، عظمت اور معرفت کی ایک جھلک ۲۵۷
دوسرا:۔ شرعی ذمہ داری نبھانا اور انسانی اعلیٰ اقدار کی مضبوطی ۲۵۷
عاشورہ کی نماز ۲۶۱
کربلا میں ظلم کی جڑیں (عوامل) ۲۶۳
اصحاب امام حسین علیہ السلام کی خصوصیات ۲۶۷
۱:۔ حر بن یزید ریاحی ۲۶۸

۲:۔ زہیر بن قین ۲۷۲
۳:۔ عبیداللہ بن حر جعفی ۲۷۵
۴:۔ (جون) امام حسین علیہ السلام کا سیاہ غلام ۲۷۷
۵:۔ ترکی غلام ۲۷۸
عاشورہ اور فارسی ادب ۲۷۹

چھٹا حصہ (تربیتی اور نفسیاتی)

گریہ خلاف معمول یا معمول کے مطابق ۲۸۴
عزاداری کے دوران غم و گریہ کا غلبہ ۲۹۲
پہلا :۔ اس ابہام کی وجہ ۲۹۳
دوم :۔ اسلام میں خوشی و غم کا مقام ۲۹۴
سوم :۔ نفسیات کی روشنی میں خوشی ۳۰۰
خوشی کی تعریف ۳۰۰
چوتھا: صحیح اور پسندیدہ گریہ و غم کی شکل و صورت ۳۰۲
سیاہ لباس مکروہ یا مستحب ۳۰۷
رونے پر آمادگی ۳۱۰
عاشورہ کی یاد جذباتی یا عاقلانہ ۳۱۴
پہلا مقدمہ: ایک طرز عمل میں موثر عوامل ۳۱۴

ساتواں حصہ (احکام عزاداری)

شبیہ خوانی ۳۲۲
علَم و عزاداری ۳۲۳
عزاداری میں موسیقی ۳۲۳
قمہ زنی ۳۲۵
زنجیر زنی (بغیر چھریوں والی) ۳۲۶

سینہ زنی	۳۲۷
مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی	۳۲۸
عزاداری و نماز	۳۲۹
عاشورہ میں منت	۳۳۰
محرم میں شادی	۳۳۱
قیام امام حسینؑ کے مراحل تاریخ وار	۳۳۳

فہرست کتب "دانش کدہ" اسلام آباد

- احکام تقلید و بلوغت
- خدا شناسی
- نگاہ اور لباس کے احکام
- احکام موسیقی
- راز خلقت
- روزہ کے احکام
- قرآن شناسی
- رسالۂ عملیہ برائے طلبہ
- دینی حکومت
- پیغمبر اعظمؐ سیرت و تاریخ
- شادی کے احکام
- عرفان و تصوف
- شفاعت و توسل
- رمضان المبارک کے احکام